عالمی اردو ادب سے منتخب افسانوی مجموعہ
نئی صدی کے افسانے
حصہ اول
مرتب
پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ

تغیر وتبدل ہماری زندگی کے ارتقاء کا لازمی جزو ہے اس لئے ہمارا ادب بھی اس تغیر وتبدل کے زیر اثر پروان چڑھتا ہے۔ نتیجۃً کبھی کبھی ارتقاء کی یہ خواہش ہمیں گمراہ بھی کرتی ہے اور روایت سے انحراف پر اکساتی بھی ہے۔ اور ایسی ہی مایوس کن اور تاریک فضا میں آج سے چند سال قبل نئی ٹیکنالوجی کا سہارا لیکر چند مخلص، نوجوان، باہمت اور بے لوث ادب دوست ادب کی مشعل جلانے نکل کھڑے ہوئے۔ دنیائے ادب میں تبدیلی کی ایک نئی تاریخ رقم کرنے کا جذبہ لیکر یہ ادب دوست ہر ملک، ہر عمر، ہر طبقے اور ہر صنف کو بغیر کسی تفریق کے اس کارواں میں شامل کرتے گئے اور یہ ثابت کردیا کہ اردو زبان وادب نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کی جڑیں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ "پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ" کا قیام اور اس کے زیر اثر "نئی صدی کے افسانے" کی اشاعت اردو ادب کی تاریخ میں روشن باب رقم کر رہا ہے، ابھی تو یہ شروعات ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ سونامی ساری حد بندیوں کو توڑ کر اردو زبان اور ادب کو عالمی ادب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لائق بنا دے گی۔۔۔ کیونکہ اس پلیٹ فارم پر صرف زبان اور ادب کے شائقین ہی نہیں آرٹسٹ، ویب ڈیزائنر اور ٹیکنالوجی کے ماہرین اور ترجمہ نگار بھی اپنی بے لوث خدمات پیش کر کے اسے بلندیوں پر لے جانے میں اپنا شب وروز ایک کر رہے ہیں۔ اور مجھے فیض کے یہ اشعار یاد آرہے ہیں۔۔۔

ہم پرورشِ لوح وقلم کرتے رہینگے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہینگے
اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہینگے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہینگے

ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی
(علی گڑھ انڈیا)

بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے آغاز نے اپنی وسعت ورفتار سے پرانی دنیا اور اس کے اطوار کو پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ ایک بڑی تاریخی حقیقت ہے۔ اردو اور اردو افسانے نے افسانہ فورم کے ذریعے نئے وقت کی تکنیکی سہولتوں کو جس طرح ادبی سرگرمی کا حصہ بنایا ہے یہ نہ صرف ادب بلکہ دیگر ادبی میدانوں میں سرگرم لوگوں کے لیے بھی ایک عمدہ مثال ہے۔ اردو ذہن نے ایک بار پھر ثابت کیا ہے کہ وہ تغیر اور نئی ٹیکنالوجی کو پسند کرتا ہے اور اس سے ہم آہنگ رہنے میں یقین رکھتا ہے۔ پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ نئے زمانے کی "کتاب" ہے، "رسالہ" ہے، "تخلیقی خانقاہ" ہے، ادبی "محفل" ہے۔ یہ گلڈ تیزی سے اپنے کلچر کی تخلیق کر رہا ہے اور ایک پودے سے تناور درخت بننے کا اس کا نامیاتی عمل جاری ہے۔ پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ کی صورت میں ایک نئے ادارے کا قیام اور پرنٹ میڈیا میں اس کا عمل دخل اس بات کا غماز ہے کہ نہ صرف اردو زبان کی ترقی وترویج اسکی پہلی ترجیح ہے بلکہ یہ گلڈ کا اعجاز ہے کہ اردو ادب میں رسائل اور مجموعوں کی ایک ایسی کھیپ لیکر آرہا ہے جس میں خزاں کے بعد بہار کی آمد نظر آرہی ہے۔

پیغام آفاقی
(دہلی انڈیا)

نئی صدی کے افسانے

(منتخب افسانوی مجموعہ)

پروگریسو اُردو رائٹرز گلڈ

نام کتاب	:	نئی صدی کے افسانے (منتخب افسانوی مجموعہ)
مرتب	:	پروگریسو اُردو رائٹرز گلڈ
اشاعت اول	:	جولائی 2015
تعداد	:	500
ناشر	:	بک اہیج پبلیشرز
کمپوزنگ/سرورق	:	بریرہ مصطفیٰ مغل
مطبع	:	ڈاٹ لنک پرنٹرز
اہتمام	:	سمٹ انٹرنیشنل/پروگریسو اُردو رائٹرز گلڈ
قیمت	:	پاکستان 480.00 روپے بیرون ملک 8.00$ ڈالر

ISBN: 978-969-9550-07-2

بک اہیج پبلیشرز

دوسری منزل، خورشید بلڈنگ، 10 ایبٹ روڈ، لاہور
فون نمبر: 36307828, 36314383
ای میل summitmails@gmail.com

پروگریسو اُردو رائٹرز گلڈ

لاہور-پاکستان

ای میل puwguild@gmail.com

انتساب

خاموش قارئین کے نام

جو ادب پڑھنے کا قرینہ اور زندگی کو

برتنے کا ہنر جانتے ہیں

فہرست

نمبر شمار	افسانے	مصنف	صفحہ نمبر

☆☆☆☆

تعارف

نئی صدی اور اس کے تقاضے

نعیم بیگ

پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ کے زیر اہتمام شائع ہونیوالے اس منتخب افسانوی مجموعے کو میں اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کا ماحاصل دنیائے ادب کا شاہنامہ تو شاید نہ کہہ سکوں گا کیونکہ میں یہ منصب نہیں رکھتا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس صدی کے اوائل سے عصری ارتقائی مراحل میں اردو ادب کو جو روایتی خطرات درپیش تھے ان کا سد باب کرتے ہوئے ان ادیبوں نے عالمی تناظر میں عہدِ حاضر کے مناظر کو عمدگی سے پینٹ کر کے دکھا دیا۔ اس لئے آج کے ادبی تقاضوں میں کلاسیکی شعور کے ساتھ جدید فکری رجحانات کی آمیزش کو میں ایک قرار واقعی ایسی کوشش کہوں گا جو اردو افسانے کو بے اعتدال اور بے رنگ نہیں ہونے دیتی۔ آج کا افسانہ جہاں نئی ادبی کلاسیکت کی مدہم، خوابناک اور روح پرور چاندنی کی بات کرتا ہے وہیں عصری اور معروضی حسیاتی کیفیات کو ایسے تاثر کے ساتھ سامنے لاتا ہے جہاں صرف انسان اور اسکے آس پاس زندہ رہ جانے والے استعارے مرصع سازی کرتے ہیں اور قاری اس اظہار کو ایک سند بخشتا ہے۔

نئی صدی کے افسانوی مجموعے کا تعارف لکھتے ہوئے اپنی بات کا آغاز بہار اور پھولوں سے کرونگا۔ فطری و آفاقی خوشبو لئے اِن کلیوں کی بات کرونگا جو بن کھلے مرجھا گئیں۔ مدتوں سے چمن میں مدھر گیتوں سے چہکتے ان پرندوں کی بات کرونگا جنہیں زبان بندی کا حکم دے دیا گیا

اور وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کے تلاش میں سراپا نوحہ خواں چمن سے باہر نکل گئے۔ یوں گزشتہ تین دہائیوں میں ملک سے اُن نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد ہجرت کر گئی جنہیں ابھی اپنے آبا کی پہلی ہجرت نہیں بھولی تھی۔

ملک میں گزشتہ چند برسوں سے امن وامان، دہشت گردی اور انتہا پسندی نے ملکی ثقافتی وتمدنی سطح پر عوام کی نفسیات پر جو گہرے اندوناک داغ لگائے ہیں اس کی مثال پاکستان کی پیدائش سے لیکر ایک دہائی پہلے تک نہ تھی اور شاید آئندہ بھی نہ ہو۔ شاید کا لفظ میں نے اسی احتیاط کے ساتھ کہا ہے ورنہ ملکی سطح پر جس طرح سے دہشت گردی سے آج نبٹا جا رہا ہے کاش دو ایک دہائی پہلے ہو جاتا تو یہ عفریت کہیں پہلے دفن ہو چکی ہوتی۔ تاہم یہی کہوں گا کہ دیر آید درست آید۔

بدقسمتی سے ہمیں پہلے دن سے ہی اپنی جغرافیائی حدود کے تنازعے، اس میں شامل ہونے والی طے شدہ ریاستوں میں سیاسی جبر، نئے معاشرہ کی تشکیل، علیحدہ سماجی وراثت کا انتقال، معاشی بدحالی، غربت وافلاس، ہجرت کا غم، ماس لیول پر مہاجروں کی زبوں حالی اور اسکے نفسیاتی اثرات اور مذہبی انتہا پسندی کا سامنا کرنا پڑا۔ بدقسمتی سے ہم اپنے ابتدائی دنوں میں لیڈروں سے محروم ہونے اور آئین کے نہ ہونے کی وجہ سے سیاسی وسماجی ارتکازِ عمل کے بحران، ملٹیپل عقاید، فقہی ولسانی تقسیم کا شکار ہو گئے۔ یہی وہ پس منظر تھا جس کی وجہ سے ہم بجائے معروف جمہوری اور عمرانی اصولوں پر مبنی سماج اور اس کا چہرہ شعر وادب سے سجاتے، ہم خود در و معاشرتی وسماجی و مذہبی بگاڑ کی طرف نکل پڑے جس کے اثرات ادبی وفکری سماجی سطح پر نمودار ہوئے، کجا اسکے کہ ہم اپنی فکری اور جمہوری سوچ کو نئی عمرانی کنٹریکٹ کے تحت لاتے ہم مائل بہ تنزل وزوال ہو گئے۔

یہ وہ بڑے چیلنجز تھے جن سے ادیب کو مسلسل واسطہ پڑا لیکن یہاں یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ عصری عہد میں ادیب کو کن مبارزت طلب موضوعات کا سامنا ہے۔ کیا وہ کماحقہٗ اس بارِ کفالت سے نبرد آزما بھی ہے کہ نہیں۔ ادب اگر زندگی ہے تو کیا آج کی زندگی کے ہمارے سماجی وتہذیبی وسیاسی مسائل وہی ہیں جو عالمی سطح پر محسوس کئے جا رہے ہیں۔ کیا انسان اپنی حقیقی و فطری عمرانی طرزِ معاشرت کو پا چکا ہے یا ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے؟

سائنس کی دنیا اور ٹیکنالوجی کے میدان میں سرخ رو ہوتے ہوئے، تمام مذاہب کے سامنے سربسجود ہوتے ہوئے، منطق اور فلسفے کے تمام مروجہ اصول سامنے رکھتے ہوئے کیا انسان

ایک مکمل انسان بن چکا ہے؟

ان سوالات کے جواب اتنے آسان نہیں ہیں۔

ابھی جب انسان آزاد ہی نہیں، وہ زمانوں اور صدیوں کے ارتقائی عمل سے گزرنے کے باوجود مہا بیانیوں، اس کی ذہن سازی اور عقاید کے چنگل سے نہیں نکل سکا اور انسانی حقیقتیں واشگاف الفاظ میں اس پر عیاں نہیں ہو سکیں تو ادیب کہاں ٹھہرے گا؟ اسی لئے سچائی اور حقیقت کو پا لینے کے لئے فلسفہ اور ادب کا تسلسل سے سہارا لیا جاتا ہے۔ نظریات کی آبیاری کرتے ہوئے اسکے بہترین پہلوؤں کو اپنایا جاتا ہے اور ان کے غیر مرئی منفی پہلوؤں کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اب نئے لکھنے والے گو سچائی اور موجودات کا منظر پیش کر رہے ہیں تاہم ان میں عالمی بورژوائی اور سامراجیت کا مقابلہ کرنے کی سکت روز بہ روز کم ہوتی جا رہی ہے، یہی وہ عصری چیلنجز ہیں جن سے آج کا فکشن نگار نبرد آزما ہے۔

دریں اثنا جہاں معاشی و سماجی اور ثقافتی رویوں میں کثیر الجہت مشکلات کی ایک طویل قطار نظر آتی ہے وہاں عوامی رابطوں میں فقدان، عدم تعاون اور عدم اعتماد کی فضا میں ریاستی سطح تو خاموش رہی لیکن حکومتی سطح پر مبہم غلغلہ ہائے غلو جاری رہا۔ معصوم سنجیدہ شہری اپنی سے صورت لئے خاموش احتجاج کا سامان تو کرتے رہے لیکن نوجوانوں نے جوش و جذبے کی تند لہروں پر اپنی آواز اقتدار کے بلند ایوانوں تک ضرور پہنچائی۔ قطع نظر اس کہ ایوانوں کے در و بام تھرتھرائے یا گرے نہیں۔

ایسے میں چند سر پھرے نوجوان اپنی آستینیں چڑھائے اپنے قلم کی لے و دھن پر جھومتے ان بہتے جھرنوں کے کناروں پر پھیلے شفاف پتھروں کی چاندنی بچھائے روح پروری کا اہتمام کرتے سامنے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیائے ادب پر چھا گئے۔ ان نوجوانوں میں کچھ نام آپ اس مجموعے میں دیکھ پائیں گے جنہوں نے اردو ادب کی تاریخ کو انٹرنیٹ کی دنیا میں عالمی سطح پر آباد کر دیا۔ سوشل میڈیا پر عالمی اردو افسانہ فورم اس مہاجنگ کا پہلا پڑاؤ تھا جہاں یہ عالمی ادیب اکھٹے ہوئے، پھر انہوں نے مل کر قدم اور آگے بڑھائے اور طے کر لیا کہ اب ان ادبی کاوشوں کو ایک بڑا پلیٹ فارم مہیا کر دیا جائے جہاں سے ان کی اُڑان آسمانِ ادب کی کہکشاؤں

سے آگے تک کی ہو۔ یوں پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ کا نام سامنے آ گیا۔

انہی جذبوں سے معمور پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ کے کرتا دھرتا، ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، کے مصداق کئی ایک خواب اپنی آنکھوں میں سجائے دبستان ادب کے مہکتے چمن میں چہکتے پرندوں کی مدھر دھنوں کے انتظار میں آس لگائے عالمی سطح پر نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ جس کی ابتدا سوشل میڈیا پر "پروگریسو اُردو رائٹرز اکیڈمی" کے قیام سے ہو چکی ہے۔ اکیڈمی درحقیقت گلڈ کی ہی ایک شاخ ہے۔ مقصد و منشا صرف یہ کہ انسان انسان کو پہچان جائے اور کائنات کے ان روح پرور عناصر کی نمو اور غیر فطری انسانی جبر کو الفاظ کی صورت ڈھالنے والوں کو انکا جائز مقام دے۔ ہاں یہاں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ ماضی کے کسی گلڈ سے متاثر ہے نا ہی اسکا تسلسل ہے۔ یہ ان ترقی پسند نوجوان ادیبوں کے خوابوں کی تعبیر ہے جو انٹرنیٹ کے عالمی منظر سے ابھرتے ہوئے اردو ادب بالخصوص اردو افسانہ کو پروقار مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں۔

مجھے اس مجموعے میں شائع ہونے والے ادبی فن پاروں کی توقیر و منزلت کا اندازہ تو ہے ہی لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ ان شہ پاروں پر ادبی فورمز میں ہزاروں کی تعداد میں قارئین کی لکھی جانے والی فوری رائے بھی سامنے آئی جس کی بنیاد پر ہم اس مجموعے کو منتخب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اس ضمن میں عالمی اردو افسانہ فورم کی انتظامیہ کو اس بے مثال تعاون پر انہیں خراجِ تہنیت پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ کا یہ تجربہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کرنے جا رہا ہے جہاں ادیب و قاری ایک ساتھ بیٹھے علم و فکر کی شمع جلائے دنیائے اردو ادب میں ایک نئے طوفان برپا کرنے کا سندیسہ لاتے ہیں۔ لیکن آخری فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ اور عالمی اردو افسانہ فورم کی پوری انتظامیہ اور ان تمام مصنفین خواتین و حضرات کے لئے میری نیک تمنائیں اور خواہشات۔

جون 2015

☆☆☆☆

نئی صدی کی افسانوی ثقافت

فرخ ندیم

دیکھتے ہی دیکھتے پچھلی صدی کے بہت سے تخلیقی رجحانات، تجربات اور انکشافات معدوم ہونے لگے۔اب نئی صدی کی ثقافتی شعریات کئی حوالوں سے پچھلی صدی سے مختلف ہے۔نئی صدی کی تعبیرات وشرحیات اپنے سیاق وسباق میں بڑی حد تک تشکیک اساس ہیں۔ 'متن کی مکانیت' اوراس کی تحلیل نفسی کی رو سے دیکھا جائے تو نئی صدی لفظ اور معنی میں ربط کو فطری کم اور ثقافتی ونفسیاتی زیادہ دیکھتی ہے۔ ہر لفظ ایک لسانی اکائی ہے لیکن ہر لفظ دوسرے الفاظ سے مل کر معنیاتی نظام سے منسلک ہوتا ہے۔ایسے ہی جیسے ایک انسان ایک فرد (ایک اکائی) ہے لیکن معاشرے کے دوسرے افراد سے مل کر ایک تناظری ماحول سے جڑت رکھتا ہے۔اب یہ کیسے ممکن ہے کہ لفظ کے لغوی معنی پہ ہی اکتفا کرلیا جائے جب کہ انسانی ابلاغ میں سیاق وسباق اور ثقافتی معنی ناگزیر ہے۔اس لئے، اب، انسان کے فطری ہونے پہ سوال اٹھ چکا ہے۔اب جس ڈسکورس کی بازگشت سنائی دیتی ہے اس کے مطابق ہر عہد کے ثقافتی متون کی شناخت اس کے سیاق وسباق اور تناظر سے مشروط ہے۔انسان اور اس کے رویوں کی طرح اس کے نصابی، اکتسابی اور موضوعاتی متون بھی ارتقا میں رہتے ہیں۔معاشرے کے افراد جب معرفہ اور نکرہ کے تجربات سے گزرتے ہیں تو ان کا انداز فطری نہیں ہوتا۔انسانی آنکھ کے دیکھنے کا انداز ماحول کے مطابق بدلتا سیاق وسباق وضع کرتا ہے۔ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ اکثر اوقات انسانی آنکھ وہی کچھ دیکھتی ہے جو وہ دیکھنا چاہتی ہے۔کیمرہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجاد ہے لیکن جونہی انسان کے ہاتھ میں آتا

تصویر کشی کرتا ہے تو نظریاتی ہو جاتا ہے۔ادیب کا قلم اور قلمرو دونوں ہی نظریاتی ہیں۔یعنی نتائجیت اور بصارت کا آپس میں گہرا ربط ہے۔نتائج تک پہنچنے کی صلاحیت کو ہم بصیرت کہتے ہیں۔نئی صدی کی ثقافتی شعریات آنکھ اور شے کے درمیاں ایک معنی خیز سفر کا نام ہے۔اس صدی کے عصری شعور کی رو سے لفظ 'بصیرت' بھی جانبداری سے ماورا نہیں، اس لئے فطری نہیں۔ادب کبھی کسی سماجی، سیاسی، ثقافتی حادثات، واقعات، دریافتوں، دساتیر اور انکشافات سے الگ نہیں رہا نہ ہی اس کے خمیر میں کچھ ماورائے (ثقافتی) انسان رہا ہے۔ثقافتی شعریات کی مبادیات کے مطابق کسی مرد اور عورت کے خیال و اظہار کی فہم اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس کو تاریخی و ثقافتی پیداوار نہ سمجھا جائے گا۔یعنی انسان ایک کانسٹرکڈ بینگ ہے، اس کی جلد، اس کا ذہن، دل و دماغ، سوچ اور فکر اس کے تناظر کا پیش منظر ہے۔

سجاد حیدر یلدرم اور اس دور کے رومانیت پسند کہانی نویسوں کے تصور انسان ہو یا ان کی ادبی تخلیقات، ان کے پس منظر میں وہ الفاظ و معنی ایک انسلاکاتی رشتے میں مربوط ہوتے ہیں جو نو آبادیاتی دور میں دلچسپی کا ساماں سمجھے جاتے تھے۔پریم چند، رشید جہاں، احمد علی اور دوسرے ترقی پسند مصنفین کی فکریات اس وقت کے مقامی اور عالمی معاشی اور سیاسی تناظر سے الگ نہیں۔سعادت حسن منٹو اپنے جوہر میں ایک ہمہ جہت تحریک کا نام ہے جو مروج سماجی و ثقافتی نصاب اور ذہن سازی کی ضد یا 'ردتشکیلی' شکل ہے۔''تقسیم'' اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فسادات ہمارے افسانوی ادب میں بہت دلخراش، وسیع اور اندوہناک اسباب و علل رکھتے ہیں۔اس تقسیم سے عظیم ادب کیونکر تخلیق ہوا، اس کے بہت سے محرکات ہیں۔جتنا بڑا انسانی و اجتماعی سانحہ تھا کم و بیش ادب بھی پوری وسعت اور شدت سے سامنے آیا۔خاص طور پہ افسانوی متن تو جگہ جگہ معصوم جانوں کے خون سے سرخ نظر آتا ہے۔یہ 'تقسیم' رکی اس لئے نہیں کہ نوآبادیاتی نظام نے جس سیاسی ثقافت کی بنیاد رکھی اس سے معاشروں کا، طبقاتی، استحصالی، صارفی، پروہتی، امیری، اساطیری، مخاطبی اور خبطی رہنا لازم تھا۔لازمیت اور حتمیت کے اصول سے کسی غریب کے گھر میں 'روشنی' ہوتی ہے نہ ہی بھوکے کا پیٹ بھرتا ہے مگر طاقت ور کے مفاد کا تحفظ ضرور ہوتا ہے۔اس لئے وسائل و مسائل کا تقسیم در تقسیم ہونا فطری عمل تھا۔لسانی، آئیڈیالوجیکل، مسلکی اور مذہبی ترجیحات نے اس وحدت کو سبوتاژ کیا جو صدیوں سے برصغیر کے باسیوں کی نفسیات کا لازمی حصہ رہی

تھیں۔ سرحد کے دونوں طرف حکومتیں بدلتی رہیں لیکن جس عدل اور امن کی ضرورت تھی وہ خواب ہی رہا۔ نظریات و نظامات اگر انسان دعوام دوستی روشن خیالی اور ترقی پسند فکر سے مشروط ہوں تو ہر قسم کی آمریت سے نجات ممکن ہے لیکن طاقت اور صارفی صداقت کے سنجوگ سے پیدا ہونے والی رویات سے جو ثقافت پیدا ہوتی ہے اس میں انسانی مسائل کی متنی کثافت ناگزیر ہے۔ انہی مسائل کی بازگشت ادیبوں کے تخلیقی تجربات میں سنائی دیتی ہے۔ اردو افسانے کی روایت میں ایک طرف ترقی پسند فکر تقسیم سے پہلے سے روایتی کلامیوں کو مختلف اور نئے زاویوں سے دیکھنے میں مصروف عمل تھی تو دوسری طرف دو عالمی جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی صورت حال نے لکھاری کے ذہن اور قلم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ تقسیم اور عالمی جنگوں کے اثرات سے جو تخلیقی حساسیت وجود میں آئی اس نے خارجی عوامل سے داخلیت اور موضوعیت کا سفر کیا۔ اس سفر میں انفرادیت، تشکیک، لادینیت، بغاوت، سادیت، مساکیت، قنوطیت، وجودیت، کلبیت، بےمعنویت، لایعنیت، تجرید وتمثال کئی اقسام کے ایسے نفسیاتی محرکات و مسائل کو شامل کیا گیا جو ماضی کا حصہ نہیں رہے تھے۔ انسانی سرشت، شعور اور لاشعور اور جنسی ناآسودگیوں کے اسباب وعلل کو پرت در پرت کھولنے کا عمل تیز ہوا۔ مارکسی فکر کے دانشور، طبقاتی کشمکش، سماجی وثقافتی نفسیات و محرکات اور جدیدیت پسند انفرادی نفسیات، شعور کی رو، آزاد تلازمہ خیال پہ فوکس کرنے لگے۔ ایک طرف مارکس، مارکسی دانشور، ترقی پسند تخلیق کار اور وایگوٹسکی تو دوسری طرف فرائڈ اور ژونگ، ایلیٹ، جوائس، لارنس، اور اردو دنیا کے جدیدیت پسند تخلیق کار اور نقاد کھڑے نظر آئے۔

ان کے درمیان ایک اور فکر موجود ہے جس نے مارکس اور فرائڈ دونوں سے استفادہ کرتے ہوئے جنسی امتیازات کے مہلک اثرات کا محاکماتی جائزہ لیا۔ یہ نسائی اور تانیثی آواز ہے جس نے اردو افسانے کی کائنات کو فطری رنگوں سے مہمیز کیا۔ نسائی بیانیہ سے مراد وہ کہانی ہے جس میں عورت اپنی نظریاتی ثقافت کے پیراڈائم میں رہتے ہوئے اپنے حقوق اور فرائض کا ادراک پیش کرے جبکہ تانیثی بیانیہ کی عورت ان شرائط سے آزاد ہے۔ ہمارے سماج کی عورت ان دونوں صورتوں کے بیچ ایک تیسری زمین متن کرتی نظر آتی ہے۔ وہ روایتی رومانوی ڈسکورس کے ہوتے ہوئے ایک ایسے (ازدواجی) بندھن کی خواہش کرتی ہے جس میں مرد وزن فاعل اور مفعول کی سماجی گرامر سے آزاد ہوں۔ اس کے نزدیک سگھڑ پن چپ پرستی کی علامت ہے۔ اظہار وابلاغ اور

دوسرے تمام حقوق پہ مرد کی اجارہ داری محض طاقت کا کھیل ہے جس کو روایت متحرک رکھتی ہے۔ ریاستوں کی آئیڈیالوجی کا غیر مشروط اتباع ہی اولین ذمہ داری ٹھہرتا ہے۔ یہاں تک کہ کچھ معاشروں میں عورت 'ڈی عورت' یعنی اس کی اصل چھین لی جائے تب بھی روایت ہی سرخ رو ہوتی ہے۔عورت کی جسمانی اور نفسیاتی ساختوں کو ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ پدرسری سماج اپنے فکری مغالطّوں کے بہاو میں بہت سے بھیانک فیصلے کرتا ہے مگر نصاب سازی اس کو قسمت نصیب سمجھ کر نظر انداز کرتی ہے۔انسانی ارتقا خود شہادت دیتا ہے کہ کمزور بالعموم اور عورت بالخصوص کی کمر جھکانے کی خاطر اس پہ روایات، رسوم و رواج کا بوجھ ضرورت سے زیادہ ڈالا گیا۔آج بھی جہاں غربت زیادہ ہے وہیں روایات عام انسانوں (خصوصاً خواتین) کے معصوم اذہان میں فرسودگی ثقافت کی جاتی ہے۔ طاقت کی چیرہ دستیوں کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کی خاطر مہابیانیوں کی آکاس بیل پھیلا دی جاتی ہے تا کہ کسی نئی رت کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔زمین کی طرح عورت کی زرخیزی، اس کی کوکھ میں پیداواری صلاحیت اور اس جسم میں جمہوری صفت ہمیشہ سے پدرسری سماج کو کھٹکتی رہی ہے۔ پدرسری شعور نے ایسی ایسی لفاظی اور لسانی تراکیب اختراع کی ہیں جو عورت کے ذہنی جسمانی، ثقافتی اور نفسیاتی کنٹرول میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔عورت کا نام عورت رکھا، نساء، خاتون، فی میل، اور وومین، ان تمام الفاظ کی ایٹیمالوجیکل سٹڈیز سے ثابت ہوجاتا ہے کہ لسان اور عمرانیات انسانی شعور و لاشعور سے کتنا گہرا تعلق رکھتے ہیں۔لسانی اسیری ہی سماجی ثقافت و روایت کی پاسداری ہے۔روایت ایک ایسی ثقافتی گرامر ہے جس میں انسانوں کے افعال و کردار قواعد کے تابع ہو کر معنی خیزی کے عمل سے گزرتے ہیں۔ اس گرامر کا حاصل کل طاقت ور کی رضا ٹھہرا ہے۔عورت ایک لفظ بھی ہے اور جنس بھی۔ اس روایتی گرامر سے نسبت نبھاتی عورت اپنے کردار کو نبھاتی چلی جاتی ہے۔

اردو افسانہ اپنی ابتدا ہی سے مغربی اور روسی ادیبوں اور دانشوروں کے اثرات قبول کرتا رہا ہے اس لئے جدیدیت، ترقی پسندی، نسائیت، تانیثیت اور مابعد جدیدیت کا فکری نظام برصغیر کے افسانہ نگاروں کے ہاں جگہ جگہ ملتا ہے۔ یوں تو ہمارا سماج پوسٹ ماڈرن معاشرت سے کافی فاصلے پہ ہے لیکن صارفیت اور اشتہاریت کے عملی مظاہر ادبی سماجیات سے گہرا ربط رکھتی ہیں۔

پوسٹ کولونیل تنقیدی تھیوری نے گو براہ راست اردو دنیا کو متاثر نہیں کیا اور یہ کہنا بھی مناسب نہیں ہوگا کہ مقامی افسانہ نگاروں نے کسی تھیوری کے ارتباط سے فکشن نگاری کی لیکن، ان تھیوریوں کی ترویج ایک حد تک ضرور اثر انداز ہے۔ اور جب سرحد کے دونوں طرف یہ معلوم ہے کہ پوسٹ کولونیل تھیوری کا تعلق پاک و ہند اور تارکین وطن کی معاشرتوں کے نفسیاتی مسائل سے بھی ہے تو ان کی اطلاقی صورت کو ممکنا یا جانا عصری تخلیق و تنقید کا تقاضا ہے۔ انگریز ہماری تاریخ کا حصہ رہے ہیں اور اب بھی ہیں، ہر سال لاکھوں افراد ہجرتوں کے تجربات سے گزر رہے ہیں، یورپی، امریکی جامعات میں لاکھوں کی تعداد میں ہمارے طالب علم پہلے علم حاصل کرتے ہیں پھر سکونت اختیار کرتے ہیں، واپس آئیں تو خاص ذہن سازی کا تحفہ لے کر آتے ہیں، ان سب عوامل کو موجودہ افسانے میں جگہ ملنے سے مقامیت اور بین الاقوامیت میں مطابقت، مسابقت اور مغائرت سامنے آ رہی ہے۔ افسانوی ثقافت میں یہ نئی سمت مختلف ہوتے ہوئے بھی دلچسپ صورت حال کا پیش خیمہ ہے۔ تقسیم سے جغرافیائی تبدیلیاں ممکنائی گئیں لیکن یہ تبدیلیاں کتنی دردناک کہانیاں ہوتی ہیں یہ طاقت کا کنسرن نہیں۔ طاقت اپنے چہرے کی شکنوں سے زمین پہ لکیریں کھینچنا جانتی ہے۔ ان لکیروں دراڑوں کو عام انسانوں کی ہڈیوں کی مُخ سے جوڑ کر مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ مٹی اور زمین سے محبت کی کہانیاں عام ہیں لیکن جس زمین میں بارودی سرنگیں بچھا کر مخالفین کے جسموں کے پرخچے مٹی میں اڑنے کا انتظار کیا جاتا ہے، وہاں اس ظلم کا شکار ہونے والوں کے لئے زمین تنگ پڑ جاتی ہے۔ ثقافتی مغائرت اور ردعمل کے طور پہ بہتر سکونت اور مستقبل کے خواب ترجیح بن جاتے ہیں۔ اور جہاں کولونیل سامراج مخالف روایت سے مقامی آمریت کے خلاف مزاحمت پسند ادیبوں کے دوکل کردار کہانیوں کے کوکھ سے اپنی آواز قاری تک پہنچانے لگے، وہیں، جدیدیت پسند اور ترقی پسند متون کے متوازی ایک متصوفانہ فکر بھی ادیبوں کی دلچسپی بننے لگی جس نے وجودیت اور وحدت الوجود کے مرکب سے نئی لیکن دلچسپ انسانی کیمسٹری دریافت اور مارکیٹ کی۔ نئے نئے تصورات اور نظریات نے انکشافات کے نئے در وا کئے۔ 'صبر سے تلقین تک نیر یٹوز' میڈیا کے سبب زبان زد عام ہو گئے۔ انسانی زندگی سے سنجیدہ ادیب ہر حال میں رجعت پسندی، آمریت، حتمیت، لازمیت اور قطعیت کے ڈسکورس کا مقابلہ جدلیاتی طرز فکر سے کرتے ہیں اور

طاقت ور کی ساخت شدہ سچائیوں کے سامنے تصویر کا دوسرا رخ پیش کرتے رہتے ہیں۔سرحد کے دونوں طرف انسان ہی رہتے ہیں لیکن ان میں' نظریاتی جکڑ بندیوں' کے سبب' قوم مرکزیت' اور نفسیاتی خلا پیدا ہوئے۔سیاسی حکمت عملیوں کے ردعمل میں دونوں طرف وسیع پیانے پہ ہجرتوں کی ثقافت نے نیوکولونیل ازم کی مہر ثبت کردی ہے۔ انسان کہیں بھی آزاد نہیں؟ آج کے ادیب (عورت اور مرد) کا اہم سوال ہے۔فکرِ معاش نے لاکھوں انسانوں سے ان کی زمین چھین لی اور اب وہ اپنی ہجرت کا غلام بھی ٹھہرتے شناختوں کے بحران سے بھی گزر رہے ہیں۔آزادی، خودمختاری اور مساوات کا وہ سورج جس کی تمنا میں طرفین کی معاشرتوں نے لاکھوں جانیں قربان کیں وہ گرہن زدہ ہی رہا۔افسانہ نگار اپنی کہانی میں اس سورج کا نوحہ لکھتے ہیں لیکن شعوری و لاشعوری سطحوں پہ نیا سورج تلاشتے، تراشتے، ساخت کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے ثقافتی ماحول میں سرمایہ دار، جاگیردار، ملا، پروہت اور سرحد کے اِس طرف آمریتوں نے سماجی ساختوں کی جمہوری گرامر کے بخیے ادھیڑ دیئے۔کمزور کا استحصال ہوتا رہا اور قسمت پرستی کا مخاطبہ مذہبی بیانیوں میں ڈھل کر ان کے آنسو پونچھتا رہا۔اس ثقافتی گھٹن میں علامت استعارہ، مجاز اور بیانوی التباس کا استعمال تخلیقی اسلوب کے ارتقا کا تقاضا بھی تھا اور اب بھی ہے۔ اس نئی روایت نے، جبر اور آمریت کے دور میں، ادیبوں کو نفسیاتی الجھنوں کو نئے اظہاریوں میں ڈھالنے میں مدد کی۔ادب میں ایک نئی تکونی شکل' ادیب، خیال اور اسلوب' پہ مکالموں کے اجرا سے تناظر، متن اور ہیت پہ سوال و جواب ملنے سے اسلوبیاتی تجربات دریافت ہوئے۔

ادیب کا مسئلہ اس کے متن میں موجود صورت حال کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سوال سے شناخت ہوتا ہے۔اس لئے یہ سوال کہ اساس بیانیہ کو کس ڈھنگ پیش کیا جائے، ناقدین اور تخلیق کاروں کی توجہ کا مرکز بنا۔نتیجہ یہ نکلا کہ افسانوی متون میں بیانوی تجربات سے خیال کو بڑی ندرت سے پیش کرنے کی ثقافت کو فروغ ملا۔روایت اور جدت کے خوبصورت سنگم سے نئے ذہن نے استفادہ کیا اور بلاشبہ خوبصورت افسانوی ادب تخلیق کیا گیا۔جو تناظر انڈین اردو ادب کو ملا وہی اس کی ادبی ثقافت کا ترجمان ہے۔پاکستان کی صورت حال یکسر مختلف ہے۔یہاں دہشت گردی، بم بارود، درود و واعظ، خودکش حملے، مخالفین کے گلے کاٹنا، آمریت، لبرل فاشزم، سرمایہ دارانہ

ریشہ دوانیاں، جاگیردارانہ اجارہ داری، میڈیا کی ثقافتی اور لسانی سیاست، ان سب عوامل نے انسان اور انسانیت کا نیا اسلوب وضع کیا۔ جنہوں نے بیرون ملک ہجرت کی اور بے وطنی کا درد جھیلا، ان سے کولونائیزر کا نیا تعلق قائم ہونے سے نیا ہائبرڈ انسان پیدا ہوا۔ اس ہائبرڈٹی کی ثقافت کے اپنے مسائل ہیں جن میں شناخت کا بحران، نئی سوچ سے (عدم) مطابقت، قومیت کا مسئلہ، مذہبی انسان اور سیکولر معاشروں میں تفاوت، نسلی عصبیت، آجر اور اجیر کا رشتہ اور اس کے ساتھ ساتھ روایت اور مابعد جدید صورت حال جیسے مسائل کے حائل ہونے سے تارکین وطن کا تشخص کہیں مجروح ہوتا ہے تو کہیں نئے سرے سے تجسیم ہوتا ہے، یہ تمام مسائل بھی آج کے افسانوی متون کا اہم موضوع ہیں۔ اردو ادب کے قارئین کی بہت کم تعداد ہے جو ان تینوں صورتوں سے بیک وقت آگاہ ہو، یعنی انڈین، پاکستانی اور تارکین وطن یا بیرون ملک ہجرت کے تناظر میں لکھے گئے متون اور ان کہانیوں کے اسلوب۔ سوشل میڈیا سے پہلے پرنٹ میڈیا اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں اور ادبی رسائل میں چھپنے والے مضامین کی وساطت سے قارئین تک ان مسائل کی جانکاری پہنچتی رہی۔ اس سلسلے میں، عالمی اردو افسانہ فورم نے اپنی ذمہ داری نبھائی اور اردو زبان و ادب کی ترویج کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ان کوششوں کا ثمر پروگریسیو اردو رائٹرز گلڈ کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ مضمون فورم پر پیش کردہ افسانوی ادب کی ثقافت کا ایک تنقیدی تعارف ہے۔ اس تنقیدی جائزے میں راقم الحروف نے اپنے اُن تبصروں سے بھی استفادہ کیا ہے جو اس نے مختلف اوقات میں ان افسانوں پر پیش کئے تھے۔ اس کتاب میں موجود کہانیوں کے متون، ان کے تناظر، بیانوی اسلوب اور ہیت و تکنیک میں تنوع سے نئی صدی کے مقامی اور بین الاقوامی مسائل اور تخلیقی رویوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ منتخب افسانوی ادب میں افسانے کے قاری کو ہر طرح کی فکر سے واسطہ پڑے گا، تعبیر و تفہیم کے نئے در وا ہونگے اور افسانے کے متنی اور اسلوبیاتی ارتقا کو سمجھنے میں مدد بھی ملے گی۔

عام طور پہ پوسٹ کولونیل ادبی متن سے مراد مقامی تخلیق کار سے لکھا گیا انگریزی ادب ہے۔ لیکن یہ تھیسز بڑی حد تک غلط فہمی کا شکار ہے۔ اردو ادب میں ایسی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں

جن میں کسی سفید فام کا تفاعل مقامی (پاک و ہند) کلچر یا فرد سے ہوتا ہے جس سے زندگی کے مختلف مسائل و مفاہیم جنم لیتے ہیں۔ اقبال حسن خان کا افسانہ 'استر اگل' ایسا فکری متن ہے جس میں بہت ہی پیچیدہ اور سنگین مسئلہ کو ایک خوبصورت اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ انگریز ماں کی سات سالہ بیٹی ڈیزی جب باپ خداداد کی جکڑ بندیوں کا شکار ہو کر اس کے آبائی علاقے گجر خان پہنچتی ہے تو ڈیزی بھی وقت کے ساتھ ساتھ دیسی رہن سہن اور ان تمام رویوں کو سمجھنا شروع کر دیتی ہے جو باپ کے کلچر میں موجود ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور خداداد لندن میں انگریز عورت سے شادی کے باوجود اپنی ذہن سازی نہ بدل سکا۔ اس کے لئے مغربی ثقافت 'بے حیائی' کے سوا کچھ نہیں۔ پدرسری مزاج اور سماج ڈیزی کو اس کی ماں کی زمین سے اکھاڑ کر گجر خان بھیج دیتا ہے۔ اپنی جوانی تک ڈیزی پاکستانی سماجی گھٹن کا شکار رہتی ہے۔ انگریز ماں کی ڈیزی بیٹی قاری کو کہیں نظر نہیں آتی بلکہ ایک روزی روٹی کے لئے در بدر کی ٹھوکریں کھانے والی جوان لڑکی نظر آتی ہے جو کندھوں پہ سیلف لادے مرد ذات مسائل جھیلتے دن کاٹتی ہے۔ جس باپ نے ڈیزی کو بہتر مستقبل کی خاطر لندن سے گجر خان بھیجا، وہ خود تو اپنی ذہن سازی لے کر مر گیا لیکن ڈیزی کی زندگی کوریا کاری، استحصال، جبر، بے حیائی، منافقت، یاسیت اور بہت سے نفسیاتی مسائل کا شکار کر گیا۔ مابعد نوآبادیاتی صورت حال کا یہ افسانہ وسیع ثقافتی معنویت پہ اساس کرتا ہے۔ 'جعفری کلچر کی استر اگلیت' ڈیزی کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔ جس ڈھٹائی کے ساتھ وہ اپنی استر اگلی جاری رکھتا ہے وہ اس کردار کو دلچسپ مگر پیچیدہ گدھ بنا کر پیش کرتی ہے۔ عورت کے جسم چال اور نقوش کو پڑھ کر اندر کی عورت دریافت کرنے والے ایسے کردار ہمارے معاشروں کے گلی محلوں اور دفتروں میں دانائی کے نام نہاد استعاروں کے روپ میں سادہ انسانوں کی نفسیات میں آسیب بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ خیر و شر سمیت تمام انسانی معاملات میں خود کو معتبر حوالہ دیکھنا ان کا خبط بن جاتا ہے۔ ڈیزی کا ایک اینٹی ہیرو سلمان سے تعلق بھی سماجی روایات کا شکار ہو جاتا ہے اور یہاں تک کہ اس معاملے کے خاتمے کی خاطر ڈیزی استر اگلیت کو قبول کرنے پہ تیار ہو جاتی ہے۔ افسانے کا کلائمیکس اس استر اگل سے ایک انسانی دریافت کا ہے جس کا سبب بھی ڈیزی (ایک عورت) اور اس کی مجبوری ہی ہے۔

مجبوریاں ہر جگہ موجود ہیں، کہیں نظریاتی مجبوری تو کہیں معاشی۔ انسانی موضوعیت اس

کے معروض سے ممکنائی جاتی ہے۔ مغرب کا انسان اپنی تمام تر فکری آزادی کے دعووں کے باوجود سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت سے آزاد نہیں۔ آج بھی جگہ جگہ مزدوروں کے احتجاجی مظاہرے احتجاج اور مزاحمت کی شکل میں اخبارات اور میڈیا پہ موجود ہوتے ہیں۔ نسیم سید کا افسانہ ''قیمتی تابوت'' کولونیل ڈسکورس کے اس پراپیگنڈہ کی ضد ہے جو مغرب کے انسان کو ہر قسم کی گھٹن جبر اور استحصال سے پاک کر کے ایک آئیڈئل انسان کے طور پہ پیش کرتا ہے۔ نارمیلیٹی اور ابنارمیلیٹی کے درمیان خط تخصیص کھینچتا ہوا یہ افسانہ ایک طرف تو ظاہری (پروگریشن) ترقی اور احساس کی سطح پہ ریگریشن (تنزلی) کو پینٹ کرتا ہے تو دوسری طرف ایڈورڈ سعید کی تھیوری 'شرق شناسی' کی ضد غرب شناسی پہ دال کرتا ہے۔ مغربی ادب میں بے شمار مشرقی کردار پیش کئے گئے ہیں جو ابنارمیلیٹی کے کثیف تجربات سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ ایڈورڈ سعید نے ان مغربی متون کو پس ساختیاتی حوالوں سے دیکھ کر مشرق مغرب میں اس بائنری کو ڈی کنسٹرکٹ کیا ہے جو ہمیشہ سے لسانی وثقافتی سیاست کا شکار رہی ہے۔ تہذیب غلام عباس کے افسانے اوورکوٹ کی تمثیلی شکل ہے۔ افسانے کی یکتائی اس امر میں مضمر ہے کہ افسانے کی روای مشرقی کردار ہے اور متن کا مرکزی کردار مسٹر تھامس مغربی معاشرت سے ہے جو انسانی رویوں، معاشرتی ناانصافیوں اور بے حسی سے گھائل ہوتا سکڑتا چلا جاتا ہے اور آخر میں ایک قیمتی تابوت کی نذر ہو جاتا ہے۔ انسانی اکلاپا وجودی کلامیہ کا سبب بنتا ہے۔ تنہائی انفرادی فیصلہ بھی ہو سکتی ہے اور سماجی بے بسی بھی لیکن اس افسانے میں انسان کی تنہائی اور شکست وریخت مغربی اجتماعی شعور ولاشعور کا حصہ ہے۔ تکنیک واسلوب کے حوالے سے افسانہ سادہ اور رواں بیانیہ میں لکھا گیا ہے جس میں دو کردار اور ان میں مکالماتی فضا کا ہونا دو تہذیبوں کے مسائل اور ان میں ہم آہنگی پیش کرتا ہے۔ انسان اپنا درست کردار ادا کرے تو ہر جگہ انسانی قدریں کاشت کی جا سکتی ہیں۔ کینیڈا کے تناظر میں لکھا جانے والا یہ افسانہ ایک حساس راوی کا اپنے گردوپیش میں دلچسپی اور داخلی کیفیات واحساسات کا پیش منظر ہے۔ اس افسانے میں بھی ایک (مشرقی) عورت کی جمہوری شخصیت یا سیت سے جڑے بوڑھے مرد سے ایک یورپی تہذیبی بزرگ دریافت کرنے میں کامیاب رہتی ہے۔

پوسٹ کولونیل صورت حال صرف وہی نہیں جو مغربی مفکرین اور ان کے فکری نظام

سے وابستہ ناقدین کے اذہان کی پیداوار ہے۔ ہزاروں سالوں سے ہندوستان کی سرزمین پہ ویدِک کلچر ہمیشہ سے مذہبی نظریاتی ہم آہنگی کا منظر نامہ بنا رہا۔لیکن کولونیل عہد کے بعد کے منظر نامہ میں 'ڈی وائڈ اینڈ رول' کی حکمت عملی ہر جگہ سامراج کی خدمت کرتے نظر آئی۔ تقسیم کے وقت آگ اور خون کے تجربات سے گزرنے والی قومیں ابھی تک عدم برداشت کی آگ میں جھلس رہی ہیں۔اس صورت حال میں بلوائیوں کی زد میں آنے والے کرداروں کے ٹکروں کو کوئی قیمتی تابوت نصیب نہیں ہوتا۔ان کی لاشیں گھڑوں، ویرانوں میں کتوں کے جبڑوں اور گدھوں کی نوچ تلے ملتی ہیں۔شیمو یل احمد کا افسانہ''بہرام کا گھر'' سماجی آئیڈیالوجیکل 'حق و باطل' کی ہولناک مجازی شکل ہے۔۔بے رحمی کی مشق درمشق سے مذہبی تعصب تعفن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔تشدد کی گرامر انسانی نفسیات کا حصہ بن جائے تو انسانوں میں درندگی دھاڑتی ہے۔نصاب ساز ذہن سازی کے کارخانے قائم کرتے ہوئے خیر وشر کی ایسی تلقین کرتے ہیں کہ ان کے حواریوں کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک ان کی برچھی مخالف کے خون سے سرخ نہ ہو جائے۔کہانی میں ایک ماں بیٹا فسادات کا شکار ہوتے ہیں، بڑھیا بیٹے کی راہ تکتی ہے اور بیٹا بلوائیوں کی برچھیوں سے ٹکڑے ہو کر ایک گھڑے میں پڑا ہے۔ جسے اس کا ماموں پولیس کی بے حس اور محدود مدد سے تلاش کرتا ہے۔افسانے کے تناظر میں فسادات کی آگ ہے مگر یہ کیوں بھڑکتی ہے، ہماری ثقافت کا متن خود بولتا ہے۔ایک حساس ادیب انسانی قدروں کے سوا کسی نصاب کا حصہ نہیں بنتا، پریم چند اور منٹو سے لے کر آج تک کے تمام سنجیدہ افسانہ نگار اپنے تمام حوالوں سے اس متشدد ذہن سازی کے خلاف لکھتے رہے ہیں۔شموئیل احمد نے اسی روایت کی ترجمانی کرتے ہوئے فسادماری انسانیت کا حال ایک پختہ بیانوی اسلوب میں ڈھال کر لکھا ہے۔

طاقت ور کی بے حسی اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لئے کمزور کے استحصال کو لازمی قرار دیتی ہے۔انسانی قدروں کی پامالی اس روش کے نزدیک اجارہ داری کا لازمی جزو ہے۔زمینی و ثقافتی انکروچمنٹ طاقت ور کی خوراک ہے اس لئے ہر وہ ہتھکنڈہ استعمال کیا جاتا ہے جس میں استحصال کی روایت مضبوط تر ہوتی نظر آئے۔ جب افسانے کا نام " کتن والی "رکھ لیا تو افسانہ

نگار سبین علی نے کہانی کے مرکز میں کتن والی رکھی۔ مائی جولاہی سوت کھیس چادریں کات کر سماج کو موسموں سے بچاتی رہی، مگر سماج اس کو نہ سمجھ سکا، نہ کوئی گھر دے سکا، یہ المیہ ہے اہل ہنر کا، بنیادی مسئلہ افسانہ نگار نے واضح طور پہ متن کی صورت سامنے رکھ دیا کہ سرمایہ دار کس طرح، اربنائیزیشن اور ہاوسنگ سکیموں کی صورت خود شہروں کے مرکز میں بیٹھتا جا رہا ہے اور غریب اہل ہنر مارجنز پہ چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طاقت پھیلتی جاتی ہے اور کمزور سکڑتے جاتے ہیں ایسے ہی جیسے مائی جولاہی کی زندگی بے رحم سماجی موسموں سے لڑتی آخر میں غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں غربت نہیں غریب ختم کیا جاتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ سنجیدہ افسانہ نگار اپنی معاشرت کا شعور رکھتے ہوئے کہانی میں وہ پراسیس دکھاتا ہے جس سے انسانی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں۔ یہی عمل اس افسانے کا حسن ہے۔ افسانہ نگار نے اس مہارت سے اسے بنا ہے کہ قاری کے دل و دماغ پہ نقش ہو جاتا ہے، افسانے کا عنوان علامتی، بیانیہ مضبوط، تہہ دار اور قاری کو سوچنے پہ مجبور کرتا ہے۔ فکری طور پہ ترقی پسند افسانہ ہے۔ طبقاتی کشمکش، مزدوروں کی محنت اور مسائل کو متن کرتا پسماندگی کی حقیقی تصویر بنتا ہے۔ اس افسانے کی ایک خوبصورتی محنت کی جمالیات ہے، مائی جولاہی کا کردار، اس کا سراپا، اس کی مصروفیات، اس کی محنت سے لگن، اس کے ہنر سے جزباتی جڑت، ثقافت سے لگاو، یہ سب مارکسی جمالیات کا اہم باب ہے۔ نشہ کسی غریب کی ایجاد نہیں، ہو سکتا ہے اس علاقے میں ہیروئین اسی لئے پھیلائی گئی ہو کہ یہ بستی تباہ ہو جائے اور طاقت ور کو اس زمین کے ٹکرے کی ملکیت حاصل ہو جائے۔ ایسا ہی ہوتا ہے، بھولا جو مائی کے فن کا تسلسل تھا نشہ سے بلکتا دنیا سے فارغ ہو گیا، راوی کے مشاہدے کو داد جس نے یہ سارا عمل اپنی یادداشت میں محفوظ کیا اور ہماری ثقافت میں موجود ہنر کدوں کی موت کا دکھ قاری سے بانٹا۔ افسانے کی جزئیات نگاری براہ راست عنوان اور متن کے خیال کی ذیلی وضاحت ہے۔

انسانی معاشروں میں ہر لفظ ثقافتی نفسیات کا مظہر ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی متن اپنے معروض سے جڑے بغیر کوئی واضح تعبیری شکل بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ افسانہ ''ڈیپارچر لاونج'' کے مرکزی کردار بدرالدین اور افسانے کے عنوان میں متنی جڑت ہی نہیں ایک

فکری انسلاک بھی ہے۔ پورے سیاق وسباق میں کچھ بھی تو افسانہ نگار نعیم بیگ کے اس فکری نظام سے باہر نہیں جو افسانے کی متنی فضا کا شعور بنتا ہے۔ ڈیپارچر لاونج زمین اور آسمان کے درمیاں ایک جگہ کا نام ہے جہاں مسافر چند لمحوں کے لئے رک کر اپنے ماضی حال اور مستقبل کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس خوبصورت افسانے کا متن بھی کم وبیش وقت کی اسی تقسیم کا آئینہ دار ہے۔ یعنی اس کے تین حصے ہیں پہلا حال، دوسرا ماضی اور تیسرا مستقبل۔ فلائٹ انسان کے اڑنے کی خواہش کے ساتھ ساتھ اس کشش ثقل سے آزادی کا نام بھی ہے جو کبھی روایت، کبھی رسم، کبھی مجبوری اور کبھی محرومی کی شکل میں انسان کو جکڑے رکھتی ہے۔ بدراالدین ایسا ہی ایک کردار ہے جس نے ول پاور سے یا ول ٹو پاور سے اپنی محرومیوں کا بدلہ اپنے فرار کے صورت میں لیا۔ ایک مذہبی اور روایتی ماحول کا فرد جس نے ایک سفاک پسماندگی کو ہر قدم جھیلا ہو ہمیشہ مناسب موقع کی تلاش میں ہوتا ہے تا کہ اس جبر پسند قید خانے سے رہائی حاصل ہو جو اس کی شناخت، خواب اور آزادی کو مسخ کرتا ہے۔ بدرالدین کو معلوم ہے کہ جب سے دین مارکیٹ سے جڑا ہے سکالر ساز مواقع بھی دستیاب ہیں جو اس کی شناخت کو اس کے خوابوں سے ہم آہنگ کر دیں۔ لیکن اس کے خواب عام انسانی خواب سے ہٹ کر اس کی ضد/اوبسیشن بن جاتے ہیں۔ افسانے کے متن کے مطابق "اولوالعزم ہونا اسکا خواب تھا اور بلندی اس خوب کی تعبیر۔ "جب ہم اس کردار سے ملتے ہیں تو وہ ایک انتہائی کامیاب شخص بدرالدین ہادی ہے جسے ماضی میں اس کی ماں کہتی تھی "دیکھ دے بدرو۔ تیرے باوا کو کیا ہوا ہے۔ وہ جونہی گھر پہنچا اس کی ماں نے ایک ہانک لگائی۔'' اپنے نام کے طول وعرض کی تجسیم اور سر بلندی کے کے لئے بدر نے چھوٹی موٹی آوازوں سے تو ہمیشہ کے لئے (جسمانی طور پہ) نجات حاصل کر لی لیکن لاشعوری طور پہ جب بھی وہ انکھیں موندھے گا اس کی سوچ اس کو گھسیٹتے ہوئے اس کے ماضی کی طرف لے جائے گی جس سے بچنے کی خاطر وہ (بدر) جیسے کردار پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ہیسٹیر یا کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس تلخ تجربے سے گریز کی خاطر انسان پیچھے مڑ کر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اور آنکھیں کھول کر سامنے کی طرف اور اوپر کی طرف دیکھتے ہیں۔

یہاں مصنف نے انتہائی مہارت سے ایک متنی تکنیک irony کا استعمال کیا۔ بظاہر بدر عالمگیریت، آفاقیت، عینیت، انسان دوستی کے بیانیوں کلامیوں کا ترجمان بن کر عزت شہرت

دولت سمیٹتا رہتا ہے لیکن اندر ہی اندر ایک لاشعوری خوف رفوبیا میں مبتلا رہتا ہے جو کچھ کھونے کا خوف ہے۔ بدر اس خوف سے نجات حاصل نہیں کر پاتا۔ پسپائی اس کی کمزوری ہے۔ وہ کسی صورت اپنی انفرادی کامیابی پہ سمجھوتہ نہیں کر سکتا اس کے لئے بے شک اس کو اپنی زمین، رشتوں اور محبت کی قربانی دینی پڑے۔ اس کے لئے لفظ "ڈارلنگ " کہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ محبت بھی انسانی کمزوری ہے۔ عروج سے اس کا متنی رشتہ صرف مفاد کا نظر آتا ہے ہمیں بدر کے احساسات کا علم نہیں ہو پاتا۔ اتنا بھی اس لئے ممکن ہے کہ عروج ایک پڑھی لکھی اور مغربی ثقافت (مشی گن) میں سیٹلڈ کردار ہے۔ شاید اس لئے وہ عروج ہے۔ بدر کی موت بھی انسانی زندگی میں اسی آئرنی کی بدولت واقعہ ہوتی ہے۔ اندر کی کمزوری، انا، ضد، پسپائی سے ڈر، انزشیا سے، خوف سے بدر کے بدن کو ہسٹریا پہنا دیتے ہیں اور وہ یقین نہیں کر سکتا کہ ایسا بھی اس کی زندگی میں ممکن ہے۔ باہر سے سخت اور کامیاب آدمی ایک چھوٹی سی شکست قبول نہیں کر پاتا۔ یہاں نہ تو قناعت نہ صبر نہ آخرت، کچھ بھی یاد نہیں۔ جس سے یہ راز کھلتا ہے کہ نصابی کتابیں اور مدرسانہ خطابت عام اضافی قدریں ہیں، ان کا عملی زندگی اور زمینی حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ بدر کی موت بدر کے آئیڈئل ازم، اس کی اپنی ہائبرڈائزیشن، اس کی ول پاور، اس کی ایگو (انا) اور آخر میں اس کے narrative of success کی موت ہے۔ مرتے وقت بدر ہوا میں معلق ہے، آسمان پہ نہ زمین پہ۔ خطابت، فصاحت، انسانیت، آدمیت، بلاغت، قناعت، ریاضت بدر کی کاسمیٹکس ہی ثابت ہوئے۔

ڈیپارچر لاونج سے نکلتے ہیں تو ایک ایسی تہذیبی شخصیت کی ڈولی دیکھتے ہیں جو پوری ایک صدی عورت ہے۔ پیغام آفاقی نے اپنے مشہور افسانے ''ڈولی'' میں ایک عہد ساز عورت کی زندگی کا پورٹریٹ ہمارے سامنے رکھ دیا اور افسانے کے قارئین کو کہانی کی بنت اور فن سے روشناس کرادیا کہانی کی طاقت اس کے تصور افسانہ میں مضمر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے افسانہ نگار لیفٹ رائٹ کے تصورات کو چیلنج کرتے نظر آتا ہے۔ زندگی اور کہانی کا آپس میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ فنکار لاشعوری یا شعوری طور پہ بڑی زندگی کو بڑا بیانیہ دینے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ پیغام آفاقی

نے ایک عورت کیے بیانیہ سے متشکل ہونے والے اسلوب سے عورت کی توقیر کو واضح کیا ہے۔ ادب اور زندگی کی رو سے دیکھا جائے تو بھی اسلوب سماجی سطح پہ اہم ہو جاتا ہے اس لئے کہ یہاں ایک زندگی تو ہے مگر عورت کی اور عورت بھی ایک صدی سی۔ عورت کی کوکھ سے اولاد اور سماج پیدا کیا مگر اس کوکھ سے ادب پیدا کرنا یہ افسانہ نگار کمال فن ہے۔ راوی اور اس کے دوست بشیر کے درمیان مکالمے سے واضح ہوتا ہے کہ ان دو کرداروں کو ایک عورت کے مرنے کا شاید دکھ نہیں ایک صدی کے کلچر سے بچھڑنے کا دکھ ہے، ایسی صدی جس میں وہ ٹھہراو، صبر، برداشت، حوصلہ اور اس کی آنکھوں میں اس پوری صدی انیس سو گیارہ سے دو ہزار گیارہ تک کی تاریخ اپنی تعمیر و تخریب کے ساتھ زندہ تھی۔ کہانی میں طوالت ہے مگر اس میں دلچسپی قاری کے اعصاب کا امتحان نہیں لیتی۔ narrative shift کے ساتھ مکالماتی فضا کو متانے کے اسلوب کا ایک خوبصورت تجربہ افسانے کے قاری کو کرداروں کے قریب لانے کا سبب بنتا ہے۔ افسانہ نگار نے زندگی کے تمام رنگوں کو یکجا کرتے ایک پورٹریٹ بنایا ہے جو ہنری جیمس، اور جوائس کے پورٹریٹ ناولوں کی روایت کا ترجمان ہے۔

ابرار مجیب کے پاس ابھی ایک کینوس ہے جو اس کے وجودی کرب کو وسعت اور گہرائی سے پیش کرتا ہے۔ واحد متکلم میں لکھا گیا یہ دلچسپ اور جدید افسانہ ''افواہ'' اپنے تناظر سے الگ نہیں، اس کے متن میں ایک ہیجان ہے، موت کی طرف سفر کرنے کا سنسنی خیز سفر جو قاری کو مضطرب رکھتا ہے۔ راوی کے گرد افواہیں گردش کر رہی ہیں جن سے اس کا ثقافتی ماحول گھٹن اور مغائرت کا شکار ہوتا سناٹوں میں بدل جاتا ہے۔ افواہ ایک آسیب کی طرح ان سناٹوں میں رقص کرتی ہے۔ معاشروں کی نفرتیں عفریت بن کر ہماری موت کا انتظار کرتی ہیں۔ ڈریکولا، گھوسٹ، چڑیلیں سب تاریکی اور سناٹوں کی ثقافتی علامتیں ہیں۔ افسانہ نگار کی فنی مہارت اس کے بیانیہ کی سنسناہٹ سے منعکس ہوتی ہے۔ تیسری دنیا کے تناظر سے کشید کیا گیا یہ فکر انگیز بیانیہ قاری کو سوچنے پہ مجبور کر دیتا ہے کہ انسانی وحشت کس طرح ایک پرسکون ماحول کو دہشت زدہ کر دیتی ہے۔ راوی ایک عام آدمی ہے اور اپنی ذات سے منسوب گردش کرتی افواہوں سے لاعلم ہے لیکن یہ ضرور جانتا

ہے کہ فضا افواہ آلود ہے۔ کہانی کی ابتدا سے کلائیمکس تک کا سفر راوی کی جانکاری کا سفر ہے۔ ابرار مجیب نے اپنے تناظر میں رہ کر لفظ افواہ کی سماجی اہمیت کو مہارت سے متن کیا ہے۔ کہانی کی اسراریت، غیر یقینی، کرب، خوف، اور ثقافتی کثافت جملوں کی ترکیب نحوی میں علت ومعلول کے متنی رشتے قائم کرتی ہیں۔ ہر پہلا جملہ دوسرے کو خیال اور اسلوب کی سطح پہ اس طرح سپورٹ کرتا ہے کہ کہانی ایک نامیاتی کل کی طرح نظر آتی ہے۔ افواہ علت ہے اور راوی کی داخلی کیفیات و احساسات معلول، یہی افسانے کا پلاٹ ہے جو ایک منطقی انجام تک پہنچتا ہے۔

ایک اور افسانہ جس کا عنوان ہی ''پورٹریٹ'' ہے افسانہ نگار اقبال حسن آزاد کے تصور افسانہ کا پورٹریٹ ہے۔ سیمیائی حوالے سے دیکھا جائے تو پورٹریٹ ایک سگنیفائر ہے اس ساری افسانویت کا جو کہانی کے ماضی مطلق اور استمرار سے متنی انسلاکات رکھتی ہے۔ افسانہ سکوت بیانیہ سے شروع ہوتا ہے اور اضطراب واضطرار سے گزرتے ہوئے ذات کی ساخت پہ ختم ہوتا ہے، تیقن اور اضطرار لسانی اور بیانوی ثنویت سے جڑ کر ایک دوسرے کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں۔ کہانی میں بدلتے مناظر شعوری اور لاشعوری کیفیات پہ دال کرتے ہیں۔ یہ تصویریں کبھی امیج، کبھی استعارہ اور کبھی علامت کی صورت سامنے آتی ہیں جو اس وقت سمجھ میں آتے ہیں جب ہم اس افسانے کے عنوان سے رجوع کرتے ہیں۔ یہ پورٹیٹ ایک خاص بیانوی وقت پہ محیط ہے جو جنگل کے خوف سے شروع ہوتا ہے اور افسانے کے مرکزی کردار کے باپ کی تصویر پہ ختم ہوتا ہے۔ یہاں باپ بھی اور اس کا پورٹریٹ بھی علامات ہیں۔ باپ کا آرکیٹائپ شناخت کا سگنیفائر بن کر اس کردار کے اپنے پورٹریٹ (سگنیفائیڈ) کی تکمیلیت کا اشارہ دیتا ہے۔ یہاں صرف باپ کا پورٹریٹ اہم نہیں، اس کردار کا اپنا پورٹریٹ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک باپ کی شکل سامنے نہیں آتی۔ باپ کا آرکیٹائپ سایہ، پناہ، انحصار بہت سی ثقافتی نفسیات کی اہم علامت ہے۔ جنگل کا استعاراتی نظام وہ سماجی انتشار ہے جو اس کردار کے باطن میں اتر کر لاشعور کو حرکت پزیر رکھتا ہے۔ اس جنگل کی اپنی آوازیں ہیں، اس کے ساتھ انسانوں کے خون کی بو شامل ہے، کردار جنگل کی وحشت سے نکلنا چاہتا ہے لیکن وہ ایسا کچھ لاشعوری طور پہ کرتا ہے۔ یہاں ایک اور اضدادی جوڑا شعور اور لاشعور کے درمیاں بنتا ہے، جیسے حال اور ماضی، سکون اور انتشار، گھر اور جنگل، شناخت اور عدم

شناخت، زندگی اور موت، ضبط اور اضطراب ایک جیسے متناقضات ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

مابعد جدیدیت اور خاص طور پہ پس ساختیاتی تنقید کی رو سے لفظ اور معنی میں حتمیت قائم کرنا ایک نظریاتی آمریت ہے۔ اس ضمن میں دیکھا جائے تو تنقیدی فکری نظام اور اصطلاحات کے معنی بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ کولونائیزیشن اس حوالے سے ایک ہی معنی (مروج ڈسکورس) نہیں رکھتی بلکہ اس میں ایک دوسرا معنی بھی اپنی شدت سے موجود ہے جس کے تجربے سے ہم سب انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے گزرتے ہیں مگر اس حقیقت کو ماننے سے یا تو انکار کرتے ہیں یا ایک ثقافتی ہچکچاہٹ در آتی ہے۔ یہ کولونائیزیشن انٹرنل یعنی داخلی استعماریت ہے جو کوئی بھی طاقت محسوس یا غیر محسوس انداز میں اثر انداز ہو کر ہماری نظریاتی اساس، رہن سہن، رسم و رواج اور اندازِ فکر کو بدلتی ہے۔ افشاں ملک کا افسانہ ''سمندر، جہاز اور میں'' نہ صرف بیانوی اسلوب میں تہہ دار ہے بلکہ علامتی بھی ہے۔ وقت کے سمندر میں زندگی کا جہاز طوفانوں کا شکار ہو چکا ہے اور کرداروں کی ڈِس الوژنمنٹ، اضطراب اور مایوسی افسانے کا اختتام بنتی ہے۔ فقیر کے الفاظ متن میں کیٹالائزر کا کردار ادا کرتے ہیں۔ جن معاشرتوں کے لوگ کسی بھی قسم کی سامراجیت، استعماریت اور کولونیل ازم کا شکار ہیں ان کے لئے یہ الفاظ لمحہ فکریہ ہیں۔ افسانے کا علامتی نظام برصغیر کے تناظر میں وسیع معنیاتی نظام سے فکری انسلاک رکھتا ہے۔

افسانہ ''نکیل'' صدیوں پرانی جبر و استحصال کی روایت کی تمثیلی شکل ہے۔ علامتی افسانہ میں افسانے کے عنوان سے لے کر اختتام تک پورا متن ایک ایسی لسانی وحدت سے جڑا ہوتا ہے جس میں بیانیہ کے پیش منظر اور پس منظر میں ایک موضوعاتی ربط ہوتا ہے۔ پیش منظر کے متوازی ایک منظر نامہ بنتا ہے جس کا تعلق افسانہ نگار کے تخلیقی شعور سے ہوتا ہے۔ اس تخلیقی شعور سے مراد تخلیق کار کا تصور زندگی اور ادب ہے۔ خیال کی سطح پہ افسانہ جبری مشقت، طبقاتی کشمکش، سماجی استحصال، ریا و سیاہ کاری، کاروکاری، معاشی جبر و ثقافتی گھٹن کو کہانی کرتا ہے لیکن اس کا بیانوی

اسلوب جدید افسانوی تکنیک شعور کی رو سے جڑت رکھتا ہے۔ تلازمہ کاری اور جزئیات نگاری افسانے کے خیال سے مربوط رہتے ایک نامیاتی وحدت میں ڈھلتے ہیں۔ علامت اس افسانے میں مجرد نہیں بلکہ زمانی و مکانی حوالوں سے تہذیبی اور روایتی معنوی نظام سے مشروط ہوتے سماجی اور ثقافتی ہی رہتی ہیں جس سے متن کی جڑت جدیدیت اور ترقی پسندی دونوں تحریکوں سے ملتی ہے۔

Diasporic context(اس سے مراد دیارِ غیر میں نئی ثقافتی اور سماجی ساختوں کا قیام ہے)میں تحریر کیا گیا نورالعین کا افسانہ ''پارکنگ لاٹ'' مختلف نسلوں کے مابین انسانی رشتوں کی تفہیم ہے۔ حرکت و سکوت کی ایک ایسی پرکشش تمثیل ہے جس میں انسانی کردار اپنی تمام تر سماجی صداقتوں اور نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ متنی وحدت تشکیل کرتے ہیں۔ افسانے کی مصنفہ کا تخلیقی شعور مابعد نوآبادیات کے تجربہ کا حاصل کل ہے۔ لاکھوں افراد ہجرت اور تقسیم جھیل رہے ہیں اور ایک ہائبرڈ شناخت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ہائبرڈٹی جلد کی بھی ہوسکتی ہے اور ثقافت کی بھی۔ اس کلچر سے جنم لینے والا اردو ادب قارئین کو نئے مسائل سے متعارف کراتا ہے۔ شعوری یا لاشعوری طور پہ کہانی کے بنیادی محاسن ٹیلنگ اور شوئنگ ایک دوسرے کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں۔ ٹیلنگ سے، یہاں، مراد وہ بیانوی اسلوب ہے جو کرنے ہونے اور سہنے کی انسانی گرامر سے مربوط ہے، شوئنگ سے میری مراد جزئیات نگاری، تلازمہ کاری اور منظر نگاری ہے۔ افسانے کا علامتی نظام بہت مختلف مگر دلچسپ ہے۔ کسی بھی افسانے کا magnitude اس کے خیال اور اظہار میں ایک فطری ربط سے ظاہر ہوتا ہے۔ روزی مصنفہ کی سوچ کی ترجمان نظر آتی ہے جو پارکنگ لاٹ کا دوسرا روپ ہے، سماجی جڑت کی ایک متحرک علامت۔ کرداروں میں قربت اور فاصلے کے تجربات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رنگ و نسل، مذہب اور قومیت انسانوں کے درمیاں کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ جدید، مابعد جدید اور گلوبلائزیشن کے عہد میں انسان دوستی کا ڈسکورس بہت عام ہے لیکن انہی ترقی یافتہ ممالک میں نسلی عصبیت کی موجودگی ان ریاستوں پہ اہم سوال ہے۔ نائین الیون کے بعد کی دنیا دہشت گردی کی لپیٹ میں سراسیمگی کا شکار ہے، امریکی معاشرت میں رہتی دوسری قومیتیں اپنی تمام تر وفاداریوں کے باوجود اپنے تشخص کی کھوج میں مصروف ہیں۔ یہ افسانہ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

مقامی معاشی اور معاشرتی تناظر میں لکھا گیا افسانہ ''کباڑیا'' انسانی نفسیات کا گہرا ادراک ہے۔ انسانی سطح پہ کوئی بھی کمزوری افسانے کے مرکزی کردار کے لئے شاکنگ یا بریکنگ نیوز نہیں، وہ عادی ہے کہ ٹوٹی پھوٹی زندگی میں کام کیسے چلایا جاتا ہے، گزارا کرنا، کام چلانا، سرکل چلانا، ٹوٹل پورا کرنا ایسی لسانی ترکیبات ہیں جو ہمارے کباڑیا کلچر میں اکثر استعمال کی جاتی ہیں۔ ان سے سماجی نفسیات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ صارفی ثقافت کے تناظر میں یہ شخص جانتا ہے کہ ٹوٹی ہوئی اشیا بے کار نہیں ہوتیں۔ نامانوس ڈکشن ہو یا خیال ہو بہر حال قاری کی مشق کرواتا ہے، یہاں صرف ایک متنی تقاضا ہے کہ بظاہر آسان نظر آنے والا انسان اندر سے تھوڑا مشکل ہے۔ یہ کردار کسی خیر وشر اچھائی بھلائی کا رسک نہیں لے سکتا، اسنے کام چلانا ہے، زندگی جسے اس کی ہتھیلی پہ آئی اس نے ایسے ہی دیکھا۔ یہ اس کی ذہن سازی ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے معاملے میں ایک کباڑیا بھی پدرسری مزاج کا حصہ ہے۔ افسانے میں حقیقت نگاری تمام جزئیات سے انصاف کرتی ہے۔

دیار غیر کی وطنیت بہت سے سوالات اٹھاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرت کی اپنی ترجیحات ہیں جن کی پیروی میں نئی نسل عدم شناخت سے دوچار ہوتی ہے۔ ڈیاسپرا کلچر میں پرانی نسل جسمانی طور پہ تو نئی ثقافت میں سانس لیتی ہے لیکن ان کا لاشعور ماضی سے جڑتا پرانے زمانی و مکانی حوالے تلاش کرتا ہے۔ وہ مثالیں بھی ماضی سے کرید کر حال میں پیش کرتی ہے۔ دوسرے ملک میں بھی یہ نسل اپنی ذہن سازی، نظریہ، کلچر اور روایات میں زندہ رہنا پسند کرتی ہے جبکہ نئی نسل اپنی بقا کی جنگ کرتی ہے اور ہائبرڈ ثقافت میں زندہ رہتے ایک مسلسل کرب میں مبتلا رہتی ہے۔ خاص طور پہ ایسی صورت حال میں جس میں صارفی صداقتیں افراد کو اپنی نظریہ سے متحرک رکھنے کی متمنی ہوں۔ نئی نسل اس نظریہ اور کی ثقافت کی چکا چوند سے متاثر ہو کر پرانی قدروں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے مگر اپنے گھر اور بازار کے درمیان ذہنی اور نفسیاتی طور پہ بٹی رہتی ہے۔ اس ambivalent صورت حال میں تضادات کا جنم لینا کرداروں کی شخصیت مسخ ہونے کے مترادف ہے۔ پوسٹ کولونیل ناآسودگیوں، الجھنوں اور ہجرتوں کے مسائل کو عیاں کرتا طلعت زہرا کا افسانہ ''بازار'' ماضی اور حال میں پرانی اور نئی نسلوں میں نفسیاتی فاصلوں کا المیہ بنتا

ہے۔افسانہ نگار، ماں اور راوی کا کردار متن کی فکری وحدت میں ایک تثلیث کی شکل میں موجود ہے۔شناخت کے بحران کا گہرا ادراک رکھنے والا یہ کردار مسلسل ایک کرب سے گزرتا ہے اور دردِ سر جھیلتا ہے۔

ما بعد نو آبادیاتی دنیا بھی بہت عجیب ہے، یہاں انگریز کے جانے بعد اس کے پیروکاروں نے ان سے بڑھ کر ہی جبر و گھٹن کا ماحول پیدا کیا، نام نہاد جمہوریتیں اور نام نہاد آزادی کا کلامیہ بیانیہ جال اور جعل سازی کے جھانسے ثابت ہوئے، ایک حساس انسان عورت ہو یا مرد اس کی آواز دب کر رہ جاتی ہے۔اخباروں کے گوداموں میں پڑی سسکتی بین کرتی آوازیں سیاست اور دلفریب گلیمر کی بھینٹ چڑھتی ہیں۔ پوسٹ کولونیل نسائی آواز کا یہ حساس افسانہ ''بین کرتی آوازیں'' افسانہ نگار نسترن فتیحی کے مشاہدہ اور مطالعہ کا عکس ہے۔گوداموں میں پڑی آوازوں کو دبے صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن کبھی مفاہمت اور کبھی مصلحت آڑے آتی ہے اور مارکیٹ کی صارفی ثقافت ان بے بس بیانیوں کو بے حسی کی دیواروں میں چنوا دیتی ہے۔عورت مختلف حوالوں سے دیواروں میں ہمیشہ سے چنی گئی ہے۔افسانے میں پدرسری نفسیات کی بائنری ایک حساس عورت کی ان تھک محنت سے بنائی گئی ہے لیکن دستور اور روایت کے مطابق عورت، اس کا علم، تحقیق، اور کوشش سماج میں غیر اہم ہی ٹھہرتا ہے۔مرد مرکزی دنیا میں عورت کا سچ دبا دیا جاتا ہے اور یک طرفہ معاشرت جاری رہتی ہے۔

صرف عورت ہی نہیں اکثر اوقات انسانیت اور انسان کے حقوق بھی بقول التھو سے ریاستی اداروں کے جبڑوں میں جکڑے اپنے معنی کھو جاتے ہیں۔حکومتی ادارے ریاستی نظریہ کی بالا دستی کی خاطر نصاب سے تشدد تک سب کچھ استعمال کر سکتے ہیں۔سماج میں تعزیراتی بیانیہ کو فروغ دیا جاتا ہے تاکہ نظریہ نفسیات میں نقش ہو جائے اور لاشعور کا حصہ بن کر انسانی زندگیوں کو متحرک رکھے۔اختر آزاد کا افسانہ ''شوٹ آوٹ'' اسی تناظر کا متن ہے۔متن کے اندر بہبودِ آبادی اور فیملی پلاننگ ایسی لسانی تشکیلات ہیں جن میں معنوی کثافت قاری کی آنکھوں میں رڑک مارتی ہیں۔حکومتی پالیسیوں کی آڑ میں کساد بازاری دندناتی پھرتی ہے اور عوام اپنا نصیب سمجھ کر چپ سادھ لیتے ہیں۔ارباب بست و کشاد کی اپنی ترجیحات اور مفادات ہوتے ہیں جن پہ کبھی کوئی کمپرومائز

نہیں ہوسکتا۔ آئرنی یہ ہے کہ جس قانون کی اطاعت عوام پہ فرض ہے اس کا مذاق جب عملی طور پہ اشرافیہ کرتی ہے تو کوئی قانون حرکت میں نہیں آتا۔ جدید اسلوب میں لکھا یہ افسانہ افسانہ نگار کی سیاسی و سماجی تعبیر کا منہ بولتا متن ہے۔ افسانے کا کلائمیکس بچوں کی ''شوٹ آوٹ'' پہ ہوتا ہے۔ اس لسانی ترکیب میں افسانہ نگار نے ایک بیانوی التباس رکھا ہے جس کے ظاہری اور باطنی معنی میں سکوت اور چیخ کا فرق ہے۔

غریب اور امیر کے تصورِ ماما میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ غریب ماں کی کوکھ اجڑے تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا، عورت زنجیروں میں جکڑی جائے تو روایت کی فتح سمجھی جاتی ہے۔۔ اب چونکہ عورت کمزور تھی اس لئے اس کے ذہنی و جسمانی کنٹرول کے لئے کبھی پردہ، کبھی برقعہ کبھی عورت کبھی نسا کبھی خاتون کا نام دیا گیا۔ شاہین کاظمی کے افسانے ''برف کی عورت'' کو پڑھ کر لفظ خاتون کے لسانی وثقافتی تعبیر سمجھ میں آتی ہے۔ اس لفظ میں مفعولی حالت کے پیشِ نظر یہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ سماج مختلف رسوم وروایات کے استعمال سے خواتین کی ذہن سازی متشکل کرتا ہے۔ عورت کی زندگی اور جسم کا ہر ایک حصہ اس کی ملکیت ہے لیکن سب سے پرائیویٹ حصہ کی قربانی عورت کی کلچرل ساخت پہ دال کرتی ہے۔ جب ایک سماج میں موجود ایک رسم اس پرائیویسی میں مداخلت کرتی ہے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کی پراوَیسی سے زیادہ اہم سماجی رسوم و ثقافت ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہی کہ فرد کی داخلی زندگی اجتماعیت کے تابع ہے۔ خاتن اور خاتون کی بائنری ساخت کرتا یہ افسانہ سماجی ساختوں کی ردتشکیلیت کی تمثیلی شکل بنتا ہے۔ جو عورت ختنہ کروانے کے بعد خاتون اور عزت دار بنے وہ مثبت رویہ ہے اور جو انکار کرے وہ منکر، کافر باغی۔ ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ رسوم ورواجات کو آفاقی صداقتوں سے تعبیر کرنے سے کمزوروں کے دل، روح اور جسم مجروح ہوتے رہے ہیں اور عام انسان ان کو فطری تقاضے سمجھتے عمل پیرا رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان آفاقی صداقتوں میں زندہ نہیں رہے یا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان آفاقائی گئی، یا حقیقتائی گئی صداقتوں میں رہتے ہیں ایسے ہی جیسے لفظ تہذیب حقیقت میں ایک لسانی سیاست کا نام ہے، دنیا میں کہیں بھی کسی بھی دور میں مہذب انسان کا تصور محال ہے۔ افسانے کا حسن اس کے بیانوی اسلوب اور التباس سے ظاہر ہوتا ہے۔

بے حسی کی برف جب تناظر میں موجود ہو تو معاشرے کے افراد کی نفسیات کا بھی نصاب بن جاتی ہے۔ سماج کے متن کی زیریں سطحیں بھی غیر متزلزل نہیں رہتیں۔ جاگیردارانہ سماج میں تحرک کے فقدان کے سبب طبقاتی ساختیں کنکریٹ رہتی ہیں جن سے کسب فیض عام انسان کا روگ نہیں۔ وہ اپنی مزدوری کے عوض محض دو وقت کی روٹی پہ شکر ادا کرتا ہے۔ لیکن ایسا بھی ممکن ہے کہ اس کے مشاہدے اور تجربے کے ردعمل میں اس کے اندر بغاوت یا مزاحمت کی آگ بھڑکے اور موسوی انقلاب کا سبب بنے یا پھر پریم چند کے افسانے ''کفن'' کے دو کردار بن جائے جن میں بغاوت تو ہوتی ہے لیکن ثقافتی بے حسی کی صورت۔ افسانوں کے کرداروں کی داخلیت یا موضوعیت کا مسئلہ یا المیہ (ٹریجیڈی) کو اس کی باطنی کیفیات ونفسیات کا شاخسانہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بہت سے ایسے معروضی حقائق ہوتے ہیں جو جمع ہوتے کسی بڑی ٹریجیڈی کا باعث بنتے ہیں۔ شاہد جمیل احمد کا المناک بیانیہ ''ایک رات کی خاطر'' ایک محروم طبقے کے انسان کی روداد ہے۔ واحد متکلم کی تکنیک میں لکھا گیا یہ افسانہ قاری کے ذہن کو جھوڑنے والے اہم سوالات اٹھاتا ہے۔ بظاہر افسانہ سادہ بیانیہ کی کہانی محسوس ہوتا ہے لیکن درون متن علامت کا نظام بھی اپنی پرتوں کے توسط سے گہرے مفاہیم دیتا ہے۔ صابی کون ہے؟ کیا کوئی پاپج اولاد ہے یا ناکردہ گناہ کی سزا کا بوجھ؟ بوجھ اتارنے والے کا صبر محض پدرانہ ذمہ داری، اپنائیت، خون کا رشتہ ہے یا کسی سماجی معاشرتی مسئلہ کسی روایت حکایت وفاداری یا خاندانی مسئلہ کے ساتھ جینے کا تکلیف دہ سفر؟ شریفاں کی بے حسی بھی اس کے دکھ کا ردعمل ہے۔ سماج کے یہ دونوں انسان اپنی ذات کی تکمیل کی خاطر صابی کا بوجھ اتارنا چاہتے ہیں اور شریفاں کے منہ سے نکلا ایک جملہ اس کے شوہر کا کام آسان کر دیتا ہے۔ زبان و بیاں اور روانی کے حوالے سے افسانہ وقت کے دھارے کی طرح چلتا ہے۔ قاری اس انہماک کے ساتھ افسانہ پڑھتا ہے کہ وہ بھی صابی کے باپ کے ساتھ اس کا بوجھ برداشت کرنا شروع ہو جاتا ہے۔ انسانی کشمکش، بے بسی اس وقت شدت اختیار کر لیتی ہے جب مسائل زیادہ اور وسائل کم ہوں۔

اچھی افسانہ نگاری اب بھی اپنی پوری شدت سے موجود ہے، نئی زندگی نئے اسالیب میں ڈھل کر سامنے آ رہی ہے۔ کتنی ہی مثالیں ایسی ہیں جن میں افسانہ نگاروں نے خیال (انسانی مسئلہ) کو ایسا لباس (اسلوب) دیا جو افسانہ نگاری میں مثال بن گیا۔ ہم جس عہد میں رہتے ہیں

اس میں سماجی نفسیات کی تفہیم و تعبیر ہمارے نام نہاد نظریاتی نصابوں کا حصہ نہیں ہے۔افسانہ نگار بھی عام طور پہ انفرادی نفسیات میں دلچسپی لیتے ہیں، کسی بھی سمجھدار افسانہ نگار کے لئے یہ بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے کہ جس طرح تناظر متن سے جڑا رہے اسی طرح شخص (کردار) معاشرے سے الگ نہ ہو۔ڈاکٹر کوثر جمال کے افسانے ''گٹر سوسائٹی'' میں سماجی و ثقافتی نفسیات کی تعبیر ملتی ہے۔ شاہ بانو اپنے عہد کا ایک متن ہے۔ایک ذہن سازی ہے جس میں ثقافتی روایات ٹھوس آرکی ٹائپس کی شکل میں متحرک ہیں۔اس لئے اس نسائی کردار کو بھی اس کے تناظر سے جوڑے بغیر اس کی تعبیر کرنا، ادھوری تفہیم ہوگا۔شاہ بانو کی نفسیات وہی ہیں جو عام فیوڈل سماج کی کمزور عورت کی ہیں۔ افسانے میں بہت سی مہارتیں ایک ساتھ نظر آتی ہیں۔ڈاکٹر کوثر جمال کا تصورِ افسانہ، تصور جمالیات، کالج کے ماحول اور بیانیہ کی لسانی تشکیلات سے متنی انسلاک رکھتی جزیات نگاری اور خیال میں مطابقت، زندگی کی آئرنی (ماہر نفسیات خود اوبسیشن کا شکار ہے اور اپنی ذات کی تحلیل نفسی سے بہت دور) مجموعی طور پہ یہ تمام اجزائے ترکیبی افسانے میں وحدت تاثر پیدا کرتے ہیں۔افسانہ نگار کا تصور افسانہ ان کا تصور زندگی ہی ہے۔ یہاں قاری کو افسانویت اور فسانویت میں فرق محسوس ہوتا ہے۔ افسانویت اس طرح کی نہیں کہ مادی حقائق مسخ ہوں۔زمین سے جڑے، حقیقی، بولتے، زندہ لیکن نفسیاتی الجھنوں ناآسودگیوں اور مجبوریوں کے شکار کردار متشکل کئے گئے۔عورت، جیسے ایک ماہر نفسیات دیکھتا ہے وہ اہم سوال ہے۔ہم سوچنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ ماہر نفسیات کی ایک عورت کی جنسی خاکہ نگاری کے پس پردہ محرکات کیا ہیں۔عورت اور مرد کا تعلق، فلسفہ محبت اور پدرسری جنسی ثقافت یہ وہ مسائل ہیں جنہیں خود ماہر نفسیات سلجھانے سے قاصر ہیں۔افسانے کے مرد کردار کے فلسفہ محبت میں ذکر مرکزیت سے انکار ممکن نہیں لیکن اس کی ذات میں جنسی ناآسودگی ایک لمحہ فکریہ ہے۔بیانیہ میں واقعیت کو افسانویت میں جس طرح افسانہ نگار نے ڈھالا، انکی فکری بالیدگی کا ثبوت ہے۔

ان کہانیوں افسانوں کا خمیر انسانی ثقافتی رویوں سے ہی کشید کیا جاتا ہے۔کہیں جنسی ناآسودگی فرد کی داخلیت میں عدم توازن کی کیفیت پیدا کرتی ہے تو کہیں روایات کا جبر گلے کا طوق بن جاتا ہے۔ پاپولر ڈسکورس کے مطابق مرد و زن ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں لیکن کچھ

تجربات ایسے بھی ہیں کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کی نفسیات کو گھائل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ شادی ایک سماجی و ثقافتی بندھن ہے جو دو افراد کو ایک دوسرے سے مشروط کر دیتا ہے۔لیکن یہ بندھن ان دیکھے ان جانے تعلق سے مربوط کرنا ایک سماج کی سمجھداری ہے تو دوسرے کے نزدیک ایک مضحکہ خیر صورت حال۔ جب یہ معلوم ہے کہ ہر انسان کی پسند و ناپسند یا رد و قبولیت کا فارمولہ الگ ہے اور انسانی ذہن کا میلان جبر سے نہیں موڑا جا سکتا تو سماجی روایات ایسے فیصلے کیوں کرتی ہیں جن سے دو (مختلف) انسانوں کی زندگی صحت منداور پرکشش تگ و دو کی بجائے کانٹوں بھری گہری کھائی بن جائے۔ارشد علی کا افسانہ ''واپسی'' سماج کے انہی تضادات کا دلخراش بیانیہ ہے۔بیس برس پہلے کمالے نے گھر چھوڑا، بیوی اور ایک بیٹی کو چھوڑا اور جب بیس سال بعد واپسی کا خیال آتا ہے تو ضمیر کی خلش اعصاب شکن ثابت ہوتی ہے۔جس شخص کے قدموں نے بیس سال کی لڑکھڑاہٹ کا کرب جھیلا ہو وہ ایک دن میں کیسے واپسی ممکن بنا سکتے ہیں۔کمالے کا فیصلہ جیمس جوائس کے افسانے'' آیولین'' کے نسائی کردار سے مماثلت رکھتا ہے۔کردار وقت کے بہاو کے ساتھ چلنے سے ڈر جاتے ہیں۔نفسیاتی عارضوں کی ہزاروں شکلیں ہیں جو غیر محسوس انداز میں ہماری حرکات کا تعین کر رہے ہوتے ہیں مگر ہمیں انکا شعور نہیں ہوتا۔شعور کی رو کی ایک خوبصورت کوشش میں لکھا گیا یہ افسانہ اس کے مرکزی کردار کمالے کے خارج اور داخل کی ابدی کشمکش کا مظہر ہے۔

مرکزی کردار کو افسانے کے متنی ماحول کے مطابق تراشنا افسانہ نگار کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔افسانہ نگار اس کردار کو پہلے اپنی ذات میں جذب کرتا ہے، اس کی نفسیات اور معاشرت سے جڑتا ہے، اسکی حرکات و سکنات کو قوت متخیلہ سے کہانی کے موضوع کے مطابق بناتا ہے، پھر اسے اپنی ذات سے باہر نکال کر قاری کے سامنے رکھتا ہے۔سنجیدہ افسانہ نگار اپنے تخلیقی عمل کے دوران ایک سے زیادہ زندگیاں جیتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے جڑت کے ساتھ اپنے کرداروں کی زندگیاں بھی جھیلتا ہے۔کردار سے بھی زیادہ اہم کردار کی اس کے مسئلہ سے مطابقت اہم ہوتی ہے۔لیاقت علی کا افسانہ ''پلیٹ فارم'' قاری کو ایسے ہی کردار سے ملواتا ہے جو اپنی ذات میں پلیٹ فارم تھا۔افسانے کے عنوان سے ہی کردار کی وسعت اور حیثیت کا ادراک ملتا ہے، جیسے

جیسے پلیٹ فارم تباہی کے تجربات سے گزررے ویسے ہی نیازی صاحب کا انسان دوست، علم دوست اور وضع دار کردار پلیٹ فارم سے بچھڑ کر چھوٹی موٹی زندگیوں میں تقسیم ہوتے رہے۔ پلیٹ فارم اور نیازی دونوں سماجی اور تہذیبی کردار تھے جو افسانے کے آخر میں سکڑ گئے۔ سماجی جکڑ بندیاں اس قدر سخت ہیں کہ راوی چاہتے ہوئے بھی نیازی صاحب کی زندگی کو شکست و ریخت سے نہ بچا سکا۔ اس کی تگ ودو سے البتہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ لاشعوری طور پہ راوی اس کردار کو مٹنے سے بچانا چاہتا ہے جو اس نے خود تراشا تھا۔

ہم جس سماج میں زندہ ہیں وہ مرد سماج ہوتے ہوئے بھی نسائی لسانی ساختوں اور اظہاریوں سے خالی نہیں۔ ان اظہاریوں کے تنوع میں نفسیاتی الجھنیں، گھر گرہستی، عورت کی اپنے گھر میں حیثیت، دکھ پریشانیاں بیماریاں، فاصلے، بدن کے مسائل، جنسی ناآسودگیاں اور معاشی طبقاتی الجھنیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ پس ماندہ طبقوں میں مرد کی گھر سے دوری، موت یا بے رخی ان الجھنوں میں تشدید کا سبب بنتی ہے۔ نسائی بیانیوں کی کھوج سے بہت سے افسانہ نگار زندگی کی زیریں سطح سے نفسیاتی اور جنسی حقائق برآمد کرتے رہے ہیں۔ قمر سبزواری کا افسانہ ''رکھوالی'' بھی اسی سمت میں ایک سفر ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی کامیابی سے پردہ داری اور کھوالی کے پس منظر میں چند نسائی کرداروں کی نفسیات کو پیش منظر بنایا ہے۔ کلچرل شیم (شرم) ایک سماجی ساخت ہے، ایک رویہ ہے جسے ایک ثقافت انسانی ذہن میں متن کرتی ہے۔ لیکن یہ متنی ساخت نفسیاتی ناآسودگیوں کا لاوہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ ظاہر اور باطن کے درمیان تفاوت کا ہی وہ سپیس ہے جہاں افسانہ نگار اپنے تخلیقی سفر کے دوران اپنی رہتل اختیار کرتا ہے۔ وحید قمر نے اس رہتل کو بیانیہ کی شکل دی اور تضادات سے المیہ تک کا بیانوی سفر طے کیا۔ عترت، رشیداں، شاہدہ اور نرگس چار عورتیں چار کہانیاں ہیں، ایک جیسی بھی اور مختلف بھی۔ ان چاروں کی مشترکہ کہانی سے بیانیہ کو کسی منطقی انجام تک پہنچانا افسانہ نگار کی فنی بصیرت کا اظہار ہے۔

کچھ افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جو راوی کے بیانیہ متوازی بیانوی جہتوں سے جدلیات کشید کرتے ہیں۔ مکالماتی متن میں کہانیوں کی روبہتی افسانہ نگار کے اس مسئلہ پہ منتج ہوتی ہے جو

اس کا اصل محرک ہوتا ہے۔''پھانسی''افسانے میں قرب عباس نے طاقت کے کلامیہ کو عیاں کرتے قاری کو اس کا موازنہ ایک عام آدمی کی فہم سے کرنے کا موقع دیا ہے۔اس افسانے کا عام آدمی وہ ڈرائیور ہے جو شروع کے حصے میں خاموش مگر باطنی طور پہ متحرک نظر آتا ہے۔ باطنی حساسیت ہی زندگی کی علامت ہے۔سٹیریوٹائپنگ کی روایت کے مطابق انسان کی ظاہری حیثیت اور اس کی خارجی زندگی ہی شناخت کا سبب بنتی ہے۔انسانی شناخت کا یہ غیر لچک دار رویہ انسانی اقدار کی تعمیر وتخریب کا ذمہ دار ہے۔انہی مسائل کے ادراک سے افسانہ نگار کے متن اور تناظر کا تعلق ملتا ہے۔ قرب تناظر سمجھتا ہے اور سماج کی دھند سے معنی کشید کرنے کا فن جانتا ہے۔دھند اس افسانے میں علامت کی سطح پہ گہرے معنیاتی نظام پہ دال کرتی ہے۔دھند اپنی فطری حیثیت میں افسانے کے مجموعی ماحول میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔کردار دھند کے پار دیکھنے کی کتنی کوشش کرتے ہیں یہ راوی جانتا ہے۔سفر ارتقا کی علامت ہے اور اور دھند اس کی ضد ہے۔ڈرائیور کا ہاتھ سٹیئرنگ پہ ہے جو گاڑی چلاتے دھند سمجھتا اور عبور کرتا جاتا ہے۔عقب میں بیٹھے کردار ریاست اور سماج کے وہ نمائندے ہیں جو سارا نظم ونسق سنبھالے ہوئے ہیں۔دن دیہاڑے ماورائے عدالت ملزمان کا این کاونٹر کرنے والے پولیس گرد کلچر کو ایک عام آدمی کاونٹر کرتا ہے تو گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ بوکھلاہٹ پیچ وتاب کھاتی دھند میں ہچکولے لیتی ہے۔ڈرائیور سوال کرتا ہے:''سر جی کیا پھانسی مجرم کے ساتھ جرم کو بھی مار دیتی ہے؟''ڈرائیور کہانی کا آدمی ہے اور اس کے عقب میں بیٹھے دو افراد طاقت کے ترجمان۔کہانی احساس کا نام ہے اور طاقت سزا کی علامت۔افسانہ کہانی کی طرف طرف جھکاو رکھتا طاقت کے ڈسکورس کی نفی کرتا ہے۔ڈرائیور جو کہانی سناتا ہے اس سے احساس اور عدالت آمنے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں۔افسانے میں مکالمہ اور بیانیہ کا توازن اسلوب کو دلچسپ بناتے ہیں۔

طاقت کا ایک ڈسکورس وہ ہے جو مرد بند کمروں میں بھی استعمال کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کرتا ہے۔عورت کا چپ رہنا، ہر عمل میں،تعلقات کی صحت مندا یکویشن کی دلیل ہے۔وہ زمین رہے،مفعول رہے تو تقدیس اور مرد ذہن کی طمانیت کا سبب ہے، اور اگر عورت مرد جیسی خواہش کرے وہی بولے جو مرد بولتا ہے وہی کرے جو مرد کرتا ہے تو یہی تقدیس عورت کے بدن

سے چھین کر اسے چکنا چور کر دیا جاتا ہے۔جنسی نفسیات اور پدرسری مزاج کو منعکس کرتا قمر سبزواری کا افسانہ ''حرافہ'' خبط اور ضبط کے درمیاں ایک سفر کی ایک کہانی ہے۔خبط کے متوازی ضبط جنسی تعلق کی گرامر میں فکسڈ کردار ادا کرتا رہے تو جنسی عمل کے فاعل کی فاعلیت قائم و دائم رہتی ہے۔لیکن اس افسانے میں ضبط کا بندھن ٹوٹتا ہے اور عورت پدرسری ڈسکورس کی ثقافتی لسانی ساختوں کی دھجیاں بکھیر دیتی ہے۔فکسڈ ٹی کا پردہ چاک ہوتا ہے اور فاعل مفعول کی ثقافتی گرامر بدلنے سے بیڈ روم کی' روایتی تہذیب' چیختی کراتی نظر آتی ہے۔افسانہ عورت کی لرننگ اور ان لرننگ کے درمیاں ایک جنگ ہے جس کا اصل محرک اس کا شوہر ہے۔شازیہ کا یہ' باغیانہ' سفر ہر سماجی ردعمل کا ترجمان ہے۔بغاوت کی فصل کے اسباب سماجی ہوتے ہیں لیکن ان کو انسانوں کی باطنی نفسیاتی کمزوریاں سمجھ کر تعزیراتی رویہ اپنانا ہمارے نصاب سازوں کی بڑی کارآمد حکمت عملی ہے۔

سماجی قدروں کی گرامر جب ٹوٹتی ہے تو بیانیہ کلامیہ سب منتشر ہو جاتے ہیں۔وحدت چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بٹ کر سماجی نفسیات کا اظہار بنتی ہے۔افسانہ چونکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا عکس ہوتا ہے اس لئے اس کی بنت یا تشکیل میں زندگی اپنی اصل میں منعکس نہ ہو تو تھوڑی بہت بناوٹ کا تاثر ملتا ہے۔سنجیدہ افسانہ نگار انسانی نفسیات ،حساسیت اور کیفیات کے زیر و بم سے بیانیہ تشکیل دیتا ہے۔ظاہر اور باطن کے درمیاں ایک بیانوی مسافر افسانہ نگار یوسف عزیز زاہد نے اپنے افسانے ''دسترخوان، سالم روٹی اور کہانی'' میں علامت اور جدید اسلوب سے کرداروں کے وجودی کرب کو بیاں کیا ہے۔یوسف کا اسلوب اس جدید افسانہ نگاری میں اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے۔علامت اور تجرید کے ملاپ سے کہانی افسانے میں ڈھالنا ان کے فن کو ندرت بخشتا ہے۔ طاعون، چھوٹے بڑے اور کتوں جیسے چوہے سفر، راستہ، دسترخوان، روٹی ،گھنا جنگل، سفر وغیرہ علامتی نظام کے وہ اجزائے ترکیبی ہیں جو کہانی میں ڈھل کر اپنا متنی کردار واضح کرتے ہیں۔افسانے میں لاشعور کی بیانوی رو اور تلازمہ کاری کا انضباط اسلوب کی سطح پہ افسانے کو آج کے عہد کے شعور اور حساسیت سے منسلک کرتا ہے۔کہانیاں ختم ہونے کو جنم لیتی ہیں۔ہر انسان کی زندگی کا سورج کہانیوں سمیت ڈوب جاتا ہے۔اور جب تک یہ کہانی قاری تک پہنچتی

ہے تب نئی کہانیاں جنم لے چکی ہوتی ہیں۔

محبت ،نفرت ،ظلم ،استحصال ،عداوت ،جبر و استبداد ،بربریت ،دکھ سکھ یہ محض الفاظ ہی نہیں کسی خاص زمان و مکان کی کہانیاں ہیں۔ انسان کہانیاں کھاتے پیتے اوڑھتے پہنتے پھلتے پھولتے اور قبر میں اترتے بھی کہانیاں رقم کرتے جاتے ہیں۔ عورت کہانی میں محبت اور وچھوڑا ہمارے سماج کے پلاٹ کی اہم اکائیاں ہیں۔ پلاٹ کم و بیش ایک ہی ہے کردار بدلتے رہتے ہیں۔ اس پلاٹ کا حصہ کبھی خود افسانہ نگار ہوتے ہیں تو کبھی ان کے کردار۔ ایک کہانی کئی دوسری کہانیوں سے مل کر نئی کہانیاں تخلیق کرتی ہیں۔ بیانیہ در بیانیہ کہانی آگے بڑھ کر اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ ہر کہانی کی ایک لوکیل ہوتی ہے جس سے کہانی کی جزئیات نگاری مشروط ہو کر معنی کی وسعت اور گہرائی کا سبب بنتی ہے۔ ماہ جبین صدیقی کا افسانہ "نائلون میں لپٹی لاش" بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں عورت اور ثقافت ایک دوسرے کو ادھورا اور مکمل کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ ثقافت اور بیانیہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ عورت بیانیہ سے ہمیں ان سچائیوں کی فہم ملتی ہے جو عام طور پہ نظر انداز ہوتی ہیں۔ فریم سٹوری کی بیانوی تکنیک میں لکھی گئی یہ کہانی راوی اور کرداروں کے شعور اور لاشعور کی گتھیاں سلجھاتی ہیں۔ فلسفہ محبت کو احساس کی ندرت سے سجا کر افسانہ نگار نے قاری کی سوچ کے نئے در وا کئے ہیں۔ کہانی کے اختتام سے محسوس ہوتا کہ مرکزی کردار ایک کہانی میں زندہ رہی اور اس کہانی کا کھو جانا اس کردار کی زندگی اجیرن کر گیا۔ ٹرین میں بیٹھی دوسری عورت خود ایک کہانی ہے، دو ملتی جلتی کہانیاں جب مکالمے کے ایک تیسرے سپیس میں داخل ہوتی ہیں تو دونوں کی آنکھیں چھلک جاتی ہیں۔ پھر سترھویں صدی کی کہانی لکھی جاتی ہے جس سے کہانیاں کھا کر زندگی کرنے والا ماحول متن کیا گیا ہے۔ اس کہانی کے سفر سے مرکزی کہانی واپس مڑتی ہے اور ایک بڑے المیہ پہ ختم ہوتی ہے۔

جب سے انسان نے کہانی سنانا شروع کی ہے تب سے اس نے المیہ ہی لکھا۔ خواب و خواہش کی شکست و ریخت کا نوحہ لکھا۔ کسی دوست کی موت پہ مرثیہ لکھا۔ کسی گاوں شہر وطن یا عزیز کے کھو جانے کا المیہ۔ غریب الوطنی کا المیہ۔ انسان کا کوئی ایک دکھ نہیں۔ ہاں ایک لمحہ موجود میں کوئی

ایک دکھ زیادہ اہم ہوجاتا ہے۔غریب الوطن کہانیاں ہماری ثقافت کا اہم باب ہیں لیکن وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ غریب الوطن مسائل بھی بدلتے چلے گئے۔نو آبادیاتی نظام میں اس غریب الوطن حساسیت کے اسباب میں سب سے اہم سبب معاشی اور سماجی محرومی ہے۔سرمایہ دارانہ 'گلوبل ولیج' کو بہت دلچسپ مہابیانیوں سے سجانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔لیکن جب تارکین وطن نسلی لسانی عصبیت کا شکار نظر آتے ہیں تو سارا آئیڈیل ازم دھڑام سے گرتا محسوس ہوتا ہے۔طاقت ور ریاستوں کی تعلیمی پالیسیاں بھی اس خوفناک چکاچوند میں پیش پیش ہیں۔دوسری اور تیسری دنیا کے لوگ جب پہلی دنیا کے دساتیر سے تفاعل کرتے ہیں تو ظاہر اور باطن کھل کر سامنے آتا ہے۔

ہزاروں مثالیں اخبارات،الیکٹرانک،پرنٹ اور سوشل میڈیا کے توسط سے سرمایہ دارانہ چالوں کو عیاں کررہی ہیں۔یہ ادراک ہمیں سلمیٰ جیلانی کے افسانے''چاند کو چھونے کی خواہش'' سے بھی ملتا ہے۔سادہ بیانیہ کی کہانی بڑی سادگی سے ایک اہم گلوبل ایشو کو متن کرتی ہے۔راوی ایک باشعور کردار ہے جس کی محروم دنیا سے جزباتی وابستگی اس کے اپنے تلخ تجربات کا ثمر بھی ہوسکتا ہے۔مغربی دنیا کے تعلیمی ادارے بھی سرمایہ دارانہ پالیسیوں سے ہم آہنگ ہیں اس لئے محروم طبقوں کے طالب علم ان ممالک میں خواہشوں کے چاند تجسیم کرنے کشتیاں جلا کر چلے جاتے ہیں اور شخصیتوں کے بحران کے تلخ تجربات سے گزرتے بے بسی کی تصویر بن جاتے ہیں۔یہاں تک کہ غلط فٹ پاتھ پہ سونے کی سزا ان غریب الوطن طالب علموں کی روح گھائل کرجاتی ہے۔

جون 2015

☆☆☆☆

اُستراگل

اقبال حسن خان (اسلام آباد، پاکستان)

رنگے ہوئے سُرخ بالوں اور چمپئی رنگت والی ڈیزی ہمارے دفتر میں کمپیوٹر چلاتی تھی۔ ڈیزی کا باپ خداداد، کوئی چالیس برس پہلے ٹیکسی چلانے لندن چلا گیا تھا، اُس نے وہیں شادی کی تھی اور ڈیزی وہیں پیدا ہوئی تھی۔ ڈیزی سات ماہ کی تھی جب اُس کی ماں ایک حادثے میں مرگئی تھی۔ خداداد اپنی انگریز بیوی سے بہت محبت کرتا تھا اس لئے جب اُس نے ڈیزی کا نام ڈیزی رکھا تو وہ خاموش رہا مگر جب وہ مرگئی تو خداداد نے فیصلہ کیا کہ اس کی بیٹی ایک بے حیا معاشرے میں پرورش نہیں پائے گی چنانچہ وہ سات ماہ کی ڈیزی کو گوجر خان کے قریب اپنے گاؤں میں اپنی ماں کے سپرد کرکے خود لندن لوٹ گیا۔

ڈیزی کو اس کی دادی نے پالا تھا۔ ممکن تھا اس وقت ڈیزی سات آٹھ ادھ ننگے بچوں کی ماں ہوتی اور گاؤں کی پختہ دیواروں پر اُپلے تھوپ رہی ہوتی اگر اُس کا رشتے کا ایک چچا اسلام آباد میں سیکشن آفیسر نہ ہوتا۔ رشتے کے اس چچا نے ڈیزی کے باپ خداداد کو اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ وہ ڈیزی کو اچھی تعلیم دلوائے چنانچہ ڈیزی چھ برس کی عمر میں اسلام آباد بھجوادی گئی۔

ڈیزی کا رشتے کا یہ چچا بیوقوف نہیں تھا جو اُس نے ڈیزی کا بوجھ ہنسی خوشی اُٹھا لیا تھا۔ اُس کے مدنظر ایک طویل المدتی منصوبہ تھا۔ اگلے سولہ برسوں میں ڈیزی کی دادی اور باپ دونوں مرگئے۔ خداداد کی جائیداد کی مالکہ اب ڈیزی تھی۔ چچا نے اپنے ایک بیٹے کی شادی ڈیزی سے کردی۔ شوہر نے، جو ایک اور عورت کے چکر میں تھا، مختلف حیلوں سے ڈیزی کی جائیداد اپنے

نام کروالی اور ڈیزی کو طلاق دے دی۔

اُس زمانے میں کمپیوٹر نئے نئے دفتروں میں متعارف ہوئے تھے اور ڈیزی نے اس حوالے سے کوئی کورس کر رکھا تھا لہٰذا وہ ایک معقول تنخواہ پر ہمارے دفتر میں ملازم ہو گئی۔ پتہ نہیں کیسے ڈیزی تین کمروں والا ایک گھر اپنے شوہر سے بچانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اب اُسی میں رہتی تھی۔ جیسا کہ ہمارے معاشرے کا دستور ہے، مطلقہ اور بیوہ عورت کو خود بخود وہ پیڑ سمجھ لیا جاتا ہے جو فٹ پاتھ پر لگا ہوتا ہے اور جس سے جو چاہے پھل توڑ کر کھا سکتا ہے۔ ڈیزی کو بھی شروع میں یہی سمجھا گیا مگر ڈیزی وہ پیڑ ثابت ہوئی جس کی ہر ٹہنی پر شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ طلاق کے نو برس بعد بھی کوئی اس پیڑ کے قریب نہ پھٹک سکا مگر یار لوگ مایوس نہیں تھے۔

جعفری ہمارا اکاؤنٹنٹ تھا۔ سر پر ایک بال نہیں تھا۔ پینتالیس کے پیٹے میں رہا ہوگا اُس وقت۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو کسی بھی عورت کے نقوش، جسم یا چال کے حوالے سے کوئی ایسا نکتہ دریافت کر لیتے ہیں، جس سے مذکورہ کا بدراہ ہونا مسلّم ہو جائے۔ ڈیزی کے پاؤں چلتے وقت اندر کی طرف پڑتے تھے۔ جعفری نے مجھے بتایا کہ ایسی عورت پیاز کی طرح پرت در پرت ہوتی ہے۔ جس کی جتنی پرتیں چاہے کھول لو، اندر سے پیاز ہی نکلتا ہے۔

''اور جس عورت کے پاؤں باہر کی طرف پڑیں؟'' میں نے پوچھا۔

جعفری نے نیا سگریٹ سلگایا اور ایک آنکھ میچ کر بولا۔

''جو بات بچہ بھی بتا سکتا ہے وہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟''

اسی طرح عام سی، سیدھی سادہ انداز میں چلنے والی عورت جعفری کے خیال میں بہت بڑی شاطرہ تھی کہ اندر سے 'پوری' تھی۔ بالوں، آنکھوں، ہونٹوں حتیٰ کہ دانتوں کے درمیانی خلا تک کے حوالے سے اگر جعفری کا نکتہ نظر سامنے رکھا جاتا تو اس زمین پر رہنے والی ہر عورت کا کردار مشکوک تھا۔ یوں نہیں تھا کہ ڈیزی کوئی بد اخلاق یا لئے دیئے رہنے والی عورت تھی یا وہ مسکراتی نہیں تھی یا دفتر کے ساتھیوں میں گھلتی ملتی نہیں تھی۔ وہ نہایت شائستہ، مہذب اور با اخلاق عورت تھی لیکن اُس نے اپنی ذات کے چپے چپے پر تختیاں نصب کر رکھی تھیں جن پر جلی حروف میں لکھا تھا کہ کہاں سے آگے جانا منع ہے۔

ہمارے ایم ڈی صاحب سے لے کر نبی بخش چپراسی تک سبھی ڈیزی کی نظرِ کرم کے متمنی

رہتے تھے۔ایم ڈی صاحب کے بلانے پرڈیزی لہراتی مسکراتی جعفری کے کیبن کے قریب سے گذر کر ایم ڈی صاحب کے دفتر میں جاتی تو جعفری سارا حساب کتاب بھول جاتا۔جعفری کو اس بات پر شدید اعتراض تھا کہ تمام مواقع یعنی عمر،شکل وصورت،معقول تنخواہ اور'جگہ' ہونے کے باوجود ڈیزی ایک پاکیزہ زندگی کیوں گذار رہی تھی۔وہ تلخی سے کہتا۔

''کیڑے کھائیں گے سالی کا سب کچھ مگر کسی کا بھلا نہیں کرے گی''۔

کبھی وہ ڈیزی کی ماں کے حوالے سے طعنہ زنی کرتا۔

''غیر مسلم خون کی ملاوٹ ہے سالی میں۔ہم ٹھہرے سید ھے سادہ مسلمان۔آپ دیکھ لیں گے خان صاب۔یہ سالی کسی غیر مسلم سے پھنسے گی۔''

جعفری نے سیاسی ملاؤں کی طرح اسلام کو تو خواہ مخواہ بیچ میں گھسیٹ رکھا تھا، مجھے پورا یقین تھا کہ جعفری اگر اس روئے زمین پر رائج سارے مذاہب بھی باری باری اختیار کر لیتا،تب بھی ڈیزی اُسے منہ نہ لگاتی۔پھر ہمارے دفتر میں سلمان آیا۔پچیس چھبیس سال کا شرمیلا سا سلمان ٹائی کی گرہ ہمیشہ ڈھیلی رکھتا اور بال سدا بکھرے رہتے۔جعفری سمیت ہمارے دفتر میں کوئی ایم کام نہیں تھا۔سلمان تھا۔وہ عہدے کے لحاظ سے جونیئر تھا اور ابھی سیکھنے کے مراحل میں تھا۔

جعفری اُس سے ٹھٹھا کرتا۔

''بائیس سال رگڑا کھایا ہے میاں صاحب زادے۔یہ جو ایک سے صفر تک کی گنتی ہے نا،اس کے ہر ہندسے میں ایک چنڈال النی بیٹھی ہے۔سوتے وقت بھی چٹیا پر ہاتھ رکھنا پڑتا کہ کسی کمینے کے ساتھ نکل نہ لے۔''

جعفری کی مثالیں اسی قسم کی ہوا کرتی تھیں۔وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو کتوں کو بھی رشک بھری نظروں سے دیکھا کرتے ہیں کہ اُنہیں بعض معاملات میں کس قدر آزادی میّسر ہے۔کبھی ترنگ میں ہوتا تو ایک آنکھ بدمعاشی سے میچ کے کہتا۔

''ابے ہم سے اچھے تو سالے کتے ہیں۔نہ بدنامی کا خوف، نہ جگہ کی فکر نہ ہی اُس سالے حدود آرڈیننس کی پروا۔سُونگھا اور چالُو۔''

ڈیزی میں مختلف قسم کی تبدیلیاں آنی شروع ہوئیں۔اُس نے بالوں کا انداز تبدیل

کروالیا جواچھا لگتا تھا۔لپ سٹک کا شیڈ ہر روز بدلنے لگا اور قمیصیں وہ قدرے فراخ گلوں کی پہننے لگی۔جعفری نے سب سے زیادہ نوٹس اُس کی قمیصوں کے گلوں کا لیا اور مجھے بتایا۔

''اُلٹا دودھ جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں کتھئی رنگ کا ایک داغ ہے۔ایسا ہی ایک داغ ہٹلر کی معشوقہ ایوا براؤن کے بھی تھا اور اسی جگہ۔''

پھر اُس نے مجھے بالتفصیل اُن عورتوں کے بارے میں بتایا کہ جن کے اسی مقام پر داغ تھے اور جنہوں نے محض ان داغوں کی بنا پر اپنے وقت کے بادشاہوں کو قابو کر کے تاریخ کا دھارا بدل دیا تھا۔

''ایسی عورتوں کو صرف اُسترا گل مرد ہی قابو میں رکھ سکتے ہیں۔توبہ کروا دیتے ہیں سالیوں سے''۔

میں نے جعفری سے اختلاف کرنے کی کوشش کی تو وہ عادتاً ایک آنکھ دبا کے مسکرایا۔

''آپ بحث کرتے اچھے نہیں لگتے۔کسی کی مان بھی لیتے ہیں۔یہ جو بڑے بڑے ماں کے خصم ہزاروں کتابیں لکھ گئے ہیں عورتوں کے بارے میں، وہ سالے چوتیے تھے؟اور آپ کہاں سے خود کو عورتوں پہ اتھارٹی سمجھنے لگے؟ اُس دن وہ سالی جو آڈٹ کرنے والوں کے ساتھ آئی تھی، آپ اُس کا منہ ہی دیکھے جا رہے تھے''۔

اب مجھے غصہ آ گیا۔''تو اور کہاں دیکھتا؟''

جعفری ہنسا اور ایک نیا سگریٹ سلگا کے بولا۔

'اُسترا گل مرد سالی عورت کو گردن کے نیچے سے دیکھنا شروع کرتا ہے اور پیٹ کے نیچے ختم کر دیتا ہے۔''

مولوی ثنا اللہ جو ڈسپیچ انچارج تھے، کانوں کو ہاتھ لگا کے بولے۔

''جعفری صاب ایک ایک لفظ لکھا جا رہا ہے۔کچھ تو خوف کریں۔''

جعفری، مولوی صاحب سے بہت چڑتا تھا۔اب اُس کا روئے سخن مولوی ثنا اللہ کی طرف ہو گیا۔''تعلیم دے رہا ہوں انہیں۔کل کلاں کام آئے گی۔اور مولوی تم ان معاملات میں مت بولا کرو۔سالے۔تمہیں عورت کا کیا پتہ۔تم اُسے بچے پیدا کرنے کی مشین ہی سمجھتے رہے ہمیشہ۔ابے کسی نے تمہیں اتنا بھی نہیں بتایا کہ ہر روز چلنے والی مشین کو تیل کیسے دیتے ہیں؟اس مہینے

پھر تمہارا سات سوانتیس کا میڈیکل کا بل آیا ہے پاس ہونے؟ انجیکشن لگا دوں؟''۔

مولوی ثنا اللہ میں اب جعفری سے بحث کرنے کا یارا نہیں رہا تھا۔ جعفری پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

''تو میں آپ کو سالی کے کتھئی داغ کے بارے میں بتا رہا تھا۔''

کتھئی رنگ کے داغ کا محلِ وقوع بتاتے ہوئے جعفری نے رومال سے آنکھیں صاف کی تھیں۔ اُن دنوں اُسے شدید قسم کا نزلہ زکام تھا مگر مجھے آج بھی پورا یقین ہے کہ اُس نے بیماری کا پانی نہیں، بلکہ ہوس کا زہر پونچھا تھا۔

ڈیزی میں ان تبدیلیوں کی وجہ سلمان تھا۔ شروع شروع میں سبھی اسے دفتری تعلق سمجھے مگر جب تواتر سے وہ دونوں لنچ کے مقررہ وقت سے پندرہ بیس منٹ اور کبھی آدھ گھنٹے تاخیر سے لوٹنے لگے تو سب سے پہلے جعفری کا ماتھا ٹھنکا۔ سلمان، جعفری کا ماتحت تھا اس لئے جعفری نے جوشِ رقابت میں ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ سلمان بیچارہ رات کو نو دس بجے تک بیٹھا فائلوں سے سر مارتا رہتا۔ وہ افسروں میں شامل تھا اس لئے اوور ٹائم سے بھی محروم تھا۔ جعفری نے اب سلمان اور ڈیزی کے حوالے سے براہ راست جملہ بازی بھی شروع کر دی تھی۔

''تم ہو کس ہوا میں میاں صاحبزادے؟ ایسی عورت گنا پیلنے کی مشین کی طرح ہوتی ہے۔ دیکھی ہے کبھی وہ مشین؟ دوسری طرف سے نرا پھوک ہی نکلتا ہے؟ پھوک سمجھتے ہو نا؟''

سلمان کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔

''جعفری صاب آپ تو بس خواہ مخواہ....''

جعفری بات کاٹتا ۔

''کیا خواہ مخواہ.. تمہاری چٹی چمڑی پہ ریجھ گئی ہے سسری ورنہ ایسی عورتیں صرف اُسترا گُل مردوں کے لئے بنی ہیں... سمجھتے ہو اُسترا گُل مرد کسے کہتے ہیں؟''

''مجھے نہیں پتہ''۔

سلمان کسی فائل کے پیچھے پناہ لیتا۔

''تو ہم سے پوچھو نا۔ خاندانی استرا گل ہیں ہم۔ ابا، سن چھیاسٹھ تک، جب وہ مرے

تھے، کسی نہ کسی صورت آگرے کی ایک طوائف،نواب جان کو پابندی سے روپے بھجوایا کرتے تھے۔کہتے تھے بڑی میٹھی یادیں وابستہ ہیں سالی سے۔وہ بھی پُھونس ہوگئی تھی اورابا بھی خوب پک گئے تھے مگر طبیعت کی للک تھی سالی کہ جاتی ہی نہیں تھی۔ساراوقت جھلنگا سی چارپائی ڈالے ڈیوڑھی میں پڑے رہتے تھے۔آنکھیں نقاہت کے مارے بند رہتی تھیں مگر جوان عورت کی خوشبو ایک میل سے لے لیتے تھے۔جب تک ابا زندہ رہے ہماری گلی میں کوئی نوجوان مہترانی جھاڑو لگانے نہیں آتی تھی۔ایسے مرد کو کہتے ہیں اُستراانگل۔سمجھے؟۔''

''کہتے ہوں گے۔''

کبھی کبھی سلمان کا لہجہ بھی تلخ ہوجاتا۔جعفری مسکراتا اور سگریٹ کی راکھ ہتھیلی پر جھاڑ کر کوڑے کی ٹوکری میں پھینکتا۔

''یہ ساری اکڑ نکل جائے گی تمہاری۔اٹھائیس سیڑھیاں ہیں اس دفتر کی اور لفٹ سالی ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ہر سیڑھی پہ گھٹنے ٹٹولو گے۔''

''یہ کیا بات کردی آپ نے؟ گھٹنوں کا بھلا اس سے کیا تعلق؟''سلمان تلخی سے بولتا۔

''شاستروں میں لکھا ہے ہستنی عورت گھٹنوں کا رس چُوس لیتی ہے اور یہ سالی ڈیزی پکی ہستنی ہے۔اب یہ نہ پوچھنا کہ ہستنی عورت کیا ہوتی ہے؟ سنو۔کبھی چُماؤ مالیا سالی کا؟۔''جعفری ایک آنکھ میچ کے مسکراتا۔

''پلیز جعفری صاحب!''

''خیر کبھی لوگے تو خود ہی پتہ لگ جائے گا۔مست ہتھنی جیسی بُو آتی ہے ایسی عورتوں کے پاس سے۔کبھی دیکھی ہے مست ہتھنی؟ سالے ہاتھی کو چوہا کردیتی ہے۔تم کس کھیت کی مولی ہو؟''یوں نہیں تھا کہ ڈیزی اپنے بارے میں جعفری کے خیالات سے واقف نہیں تھی۔اُسے سب پتہ تھا بلکہ اُس کا قرب حاصل کرنے کے متمنی دفتر کے کئی مرد نہ صرف ڈیزی تک جعفری کے خیالات پہنچاتے تھے بلکہ دو چار اپنے پاس سے بھی جڑ دیتے تھے۔مگر ڈیزی اس سمندر کی طرح تھی جو جہان بھر کی غلاظتیں خود میں سمیٹ کر بھی اُجلا، شفاف اور گہرا رہتا ہے۔جعفری آخری بچے کا باپ بنا تو وہ نومولود کے لئے تحائف اور زچہ کے لئے پھولوں کا بڑا سا گلدستہ لے کر ہسپتال گئی۔

ڈیزی سے پوچھنے کی تو خیر کسی میں ہمت نہیں تھی۔سلمان کبھی پھوٹ کر نہیں دیا مگر ایم ڈی صاحب سمیت سب کو پتہ تھا کہ اُن کا باقاعدہ معاشقہ چل رہا تھا۔ڈیزی بات بے بات قہقہے لگاتی۔سلمان کے کالر سے فرضی گرد جھاڑتی اور نبی بخش چپراسی تو قران کی قسم تک کھانے کو تیار تھا کہ اُس نے سلمان اور ڈیزی کو ایک بار نہیں، کئی بار سکوٹر پر قریب قریب بیٹھے دیکھا تھا۔جعفری اس سلسلے میں نبی بخش چپراسی کے کئی طویل انٹرویو بھی کر چکا تھا ۔

''ابے سالے تو نے خود دیکھا یا سنی سنائی ہانک رہا ہے؟''

نبی بخش چپراسی زبان دانتوں میں دبا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے کان چھُوتا۔

''پاک دامن عورتوں پر الزام لگانے والے دوزخ میں جائیں گے جعفری صاب۔''اس بیان پر جعفری کا ناریل چیخ جاتا۔''پاک دامن؟ ابے وہ کہاں کی پاک دامن ہے؟ کل کے چھوکرے سے پھنس گئی۔اندھی ہے سالی؟ اُسے دفتر میں سالا کوئی مرد نہیں دِکھا؟''نبی بخش چپراسی ایم ڈی صاحب کے دفتر کی ڈاک علیحدہ کرتے ہوئے دبی زبان سے کہتا۔

''اب یہ تو جعفری صاب عورت کی مرضی ہوتی ہے۔''جعفری تاؤ میں آجاتا۔

''ابے سالے تُو ہم سے زیادہ جانتا ہے عورتوں کے بارے میں؟ ذرا منہ کیا لگا لیا، سر پہ چڑھ گیا۔اور یہ چینی کیا مفت مل رہی ہے آج کل جو چائے میٹھی قند کر دیتا ہے؟ بیٹے۔آڈٹ ہوتا ہے ہر چیز کا۔چل دفع ہو جا۔''

جعفری چونکہ سلمان کا براہ راست انچارج تھا اور دونوں ایک ہی کیبن میں بیٹھتے تھے اس لئے سلمان ہمہ وقت جعفری کی زہر آلود زبان کا نشانہ بنتا۔

''میاں کن چکروں میں پڑ گئے ہو؟ اپنی عمر کی کوئی گھیرو۔یاد رکھو بڑا ٹرک چھوٹی بیٹری سے سٹارٹ نہیں ہوتا۔بعض اوقات تو ڈبل بیٹری لگانا پڑتی ہے۔ابے ہے تمہارے پاس ڈبل بیٹری؟''

وہ مارچ کی ایک چمکیلی دوپہر تھی جب مہ رُخ نے ہمارے دفتر میں قدم رکھا۔اُس نے نبی بخش چپراسی سے ہی پوچھا ہوگا، تبھی تو وہ سیدھی سلمان کے دفتر میں چلی گئی تھی۔جعفری اس وقت ایم ڈی صاحب کے دفتر میں تھا۔سلمان سر جھکائے انہاک سے کام کر رہا تھا۔مہ رخ کی اُونچی آواز دفتر کے ہال میں گونجی۔

''ہے کون وہ کمینی؟ ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔''

دفتر میں کام رک گیا اور لوگوں نے شکاری کتوں کی طرح اپنے کانوں کا رخ سلمان کے کیبن کی طرف کر لیا۔

''مہ رخ پلیز آہستہ بولو۔تم میرے دفتر میں کھڑی ہو۔بیٹھ کر آرام سے بات کرو یا پھر ہم کہیں باہر چلتے ہیں۔''

آواز نیچی رکھنے کی کوشش کے باوجود دفتر کے سناٹے میں سلمان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

''نہیں میں آج فیصلہ کرنے آئی ہوں... بلاؤ اُسے''۔

پھر ڈیزی کی کرسی پیچھے کھسکنے کی آواز گونجی۔ڈیزی اُٹھی اور سلمان کے کیبن کی طرف چلی۔اُس کی اُونچی ہیل والے جوتوں کی آواز دفتر کے پختہ فرش پر یوں گونج رہی تھی جیسے ایٹمی دھماکے سے پہلے اُلٹی گنتی گنی جا رہی ہو۔ٹھک۔ٹھک۔ٹھک۔ہر کوئی دم بخود تھا۔چند ایک اپنے اپنے کیبنوں سے باہر بھی نکل آئے تھے۔یقیناً مہ رخ کی آواز ایم ڈی صاحب کے دفتر کے اندر بھی پہنچی تھی تبھی تو وہ اور جعفری بھی باہر نکل آئے تھے۔

ڈیزی، مہ رخ کے قریب پہنچی اور اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میں ہوں ڈیزی خداداد۔تم شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر...''

مہ رخ گھومی اور تلخی سے بولی۔

''تو تم نے پھانس رکھا ہے اس احمق کو؟'' پھر وہ سلمان کی طرف گھومی ''ٹھیک ہے کر لو اس آنٹی سے شادی لیکن میرا بھائی کل تمہاری بہن کو طلاق دے کر گھر بھجوا دے تو کسی سے نہیں، خود سے گلہ کرنا۔''

سلمان کے چہرے پر غصے، بے بسی اور شرمندگی کا تاثر بہت گہرا تھا۔ہر کسی کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا تو پھر ڈیزی کی سمجھ میں کیوں نہ آتا۔وہ تیزی سے سلمان کی طرف بڑھی اور اس نے سلمان کے منہ پر اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ اس کی گونج ایکو کی طرح سارے دفتر نے سنی۔ڈیزی کو اس لہجے میں بولتے ہم میں سے کسی نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

''کمینے۔یہ تم میرے بارے میں کس قسم کی بکواس کرتے پھر رہے ہو؟ ہنستے بولنے اور

ساتھ کھانے پینے کا تم نے یہ مطلب کیسے نکال لیا کہ میں تم سے عشق کرنے لگی ہوں؟''

دفتر والوں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ سلمان کا منہ سب سے زیادہ کھلا ہوا تھا مگر ابھی سب کو مزید حیرت سے واسطہ پڑنے والا تھا۔ ڈیزی ٹھک ٹھک کرتی جعفری کے قریب گئی۔ اس نے جعفری کی بانہہ اپنی کمر کے گرد حمائل کی اور سنجیدگی سے بولی۔ ''جعفری ڈارلنگ آج بتا دو سب کو کہ ہم کب سے ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔'' سلمان نے بریف کیس بند کیا، کرسی کی پشت سے اپنا کوٹ اُٹھایا اور مہ رخ کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے دفتر سے نکل گیا۔ ڈیزی کے قریب سے گذرتے ہوئے اس نے زیرلب انگریزی میں جو کچھ کہا وہ ڈیزی نے سنا ہو یا نہ سنا ہو۔ میں نے سنا۔

''کُتیا۔ حرامزادی''۔

ڈیزی پھر دفتر نہیں آئی۔ گیارہویں دن اس نے استعفیٰ بھجوا دیا۔ سلمان نے پانچ روز پہلے ہی استعفیٰ بھجوا دیا تھا۔ اس واقعے کے اگلے دن جعفری پندرہ بیس دن کی چھٹی لے کر کراچی چلا گیا۔ اُس کے سسرالی رشتہ داروں میں اکٹھی دو شادیاں آ گئی تھیں۔ نبی بخش چپراسی نے مجھے بتایا کہ ڈیزی کا کوئی ''انگریز'' ماموں بہت سی جائیداد ڈیزی کے نام چھوڑ کر مر گیا تھا اور ڈیزی ''لندن'' جا رہی تھی۔ اُس نے اپنے استعمال کی بہت سی چیزیں نبی بخش چپراسی کو دے دی تھیں جنہیں ''پاک'' کر کے اُس کی بیوی اپنے استعمال میں لے آئی تھی۔

گنجا آدمی سنجیدہ ہو تو ویسے بھی خوفناک لگتا ہے۔ جعفری کچھ زیادہ ہی سنجیدہ رہنے لگا تھا۔ دو تین ماہ گذر گئے۔ لوگوں نے ڈیزی اور سلمان کا قصہ تقریباً بھلا دیا۔ ایک دن جعفری نے میرے کیبن کی دیوار سے جھانکا اور مسکرا کر بولا۔

''یار خان صاب۔ شراب پینے کو جی چاہ رہا ہے۔''

وہ بڑے دنوں بعد مسکرایا تھا۔ مجھے اُس دن جعفری کا مسکرانا اچھا لگا۔

''حکم کریں۔''

میں نے کہا

''سات بجے آ جاؤں؟'' وہ پھر مسکرایا۔

''ضرور۔ مجھے خوشی ہوگی'' میں نے یہ کہتے ہوئے واقعی خوشی محسوس کی۔

شراب مجھے ہضم نہیں ہوتی اور میں ہمیشہ اُن لوگوں کو حسرت سے دیکھتا ہوں جو چلو میں

الوہوجاتے ہیں۔اس لئے میں ابھی پہلا ہی پیگ پی رہا تھا کہ جعفری نے تیسرا ختم کرلیا۔

''خان صاحب...جانتے ہیں میں کیوں آپ کی عزت کرتا ہوں؟''وہ مسکرایا''آپ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔دفتر میں سبھی مجھ سے میرا اور ڈیزی کا تعلق پوچھتے ہیں مگر میں کسی سالے کو نہیں بتاؤں گا۔''

سچ تو یہ ہے کہ میں خود یہ راز معلوم کرنے کو مرا جا رہا تھا کہ ڈیزی نے اچانک سارے دفتر کے سامنے جعفری کی معشوقہ ہونے کا اقرار کیوں کیا تھا۔جعفری نے تیسرا پیگ ختم کیا،میرا خیال تھا کہ وہ اب مزید نہیں پیئے گا پھر بھی میں نے تکلفاً کہا''اور بناؤں؟''

جعفری پھیل کر بیٹھا''ہاں ہاں کیوں نہیں۔شراب سے منع کرنے والا بھی سالا کوئی مرد ہوتا ہے؟''چوتھا پیک آدھا ختم کرکے اس نے سگریٹ سلگایا اور ایک طویل کش لے کر بولا ''وہ سالا سب ڈرامہ تھا۔''

''ڈرامہ؟؟؟''میرا گلاس اُٹھاتا ہاتھ جہاں تہاں رہ گیا۔

''ہاں''،جعفری مسکرایا''وہ سالا سلمان ڈیزی سے بہت کچھ چھپا رہا تھا۔اس کی منگنی کئی سال پہلے مہ رخ سے ہوگئی تھی اور اس کی بہین مہ رخ کے بھائی کے گھر میں تھی۔اس واقعے سے دو دن پہلے دونوں عورتیں ڈیزی سے ملی تھیں اور اس کی مدد مانگی تھی۔اُسے بتایا تھا کہ اگر سلمان نے ڈیزی کی خاطر مہ رخ سے شادی نہ کی تو سلمان کی بہین کو طلاق ہو جائے گی۔ڈیزی نے اپنی محبت قربان کردی۔میری مدد سے خود کو بیوفا ثابت کردیا۔یہ تھا سارا ڈرامہ۔''

''مگر آپ ہی کی مدد کیوں؟''

''ڈیزی کو پتہ تھا اور کوئی سالا مفت کی بدنامی کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔اس لئے''میں نے لمحہ بھر سوچا اور مسکرا کر کہا''جعفری صاحب۔آپ نے ویسے ہی تو مدد نہیں کردی ہوگی۔میرا مطلب ہے کہ...''اس بار جعفری نے بہت سی نیٹ اُنڈیلی اور ایک ہی گھونٹ میں ختم کرکے بولا۔

''بالکل۔وہ اس کے لئے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی۔میں اپنا بہترین سوٹ پہن کر اگلی شام اس کے گھر چلا گیا۔مگر جب وہ لباس تبدیل کرنے دوسرے کمرے میں گئی اور میں ٹائی کی گرہ کھول رہا تھا تو کہیں سے ابا کی آواز آئی''سالے ہم خاندانی اُستر اگل لوگ ہیں۔طبیعت کی للک اور ٹھرک آخری سانسوں تک نہیں جاتی،وہ اور بات ہے مگر مجبور عورتوں کو ہم نے ہمیشہ ماں

بھین سمجھا ہے۔سالے یہ تُو کیا حرامی پن کر رہا ہے؟''بس خان صاب، میں اُٹھا اور سیدھا ابا کی قبر پہ چلا گیا۔پائینتی کی مٹی سر پہ ڈالی اور رات بھر روتا رہا۔'' جعفری نے بڑا سا گھونٹ لیا۔

تین ماہ بعد ڈیزی کی جگہ شمائلہ کو کمپیوٹر چلانے پر رکھ لیا گیا۔اُسے دفتر آتے شاید چوتھا روز تھا۔لنچ کے لئے میں اور جعفری ایک ہی وقت میں اپنے اپنے کیبنوں سے نکلے۔شمائلہ اپنے کیبن سے نکل کر، ہماری طرح کینٹین جانے کو نکلی۔اُس نے ہمیں گھوم کر دیکھا، مسکرائی اور پھر ہمارے آگے آگے چلنے لگی۔جعفری نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روکا اور آگے جاتی شمائلہ کو دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں بولا'' یاد رکھنا خان صاب۔جس عورت سالی کے قدم چلتے ہوئے اندر کی طرف پڑیں.....''

☆☆☆☆

قیمتی تابوت

نسیم سید (ٹورنٹو، کینیڈا)

''فک'' کوریڈور کے سناٹے میں میرے پیچھے سے کسی نے اس قدر بلند آواز میں کہا کہ میں اچھل پڑی اور مڑ کے دیکھا۔ وہ اپنے آپ میں گم خود سے محو گفتگو تھا۔

''you can all go to hell... I give a shit

اس نے زور سے سر جھٹکا اور انگلی اٹھا کے اپنی بات تند سے لہجے میں کہی جیسے اسکے سامنے کھڑے ہوں وہ لوگ جن سے وہ مخاطب تھا۔ ایلیویٹر آچکی تھی میں جلدی سے اس میں داخل ہوگئی اور وہ بھی میرے ساتھ اندر آ گیا۔ مجھے اس بلڈنگ میں آئے صرف ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ گھر بدلنا بھی ایک جان لیوا مشقت ہے، اسی لئے ایک ہفتے کی چھٹی لی ہوئی تھی اور آج پہلا دن تھا آفس جانے کا۔ چھ بجے صبح کا وقت، سویا ہوا کوریڈور، ایلیویٹر میں ایک خبطی بوڑھا اور میں۔

''اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود یہ پاگل سا بوڑھا بلڈنگ کے اندر کیا کر رہا ہے؟''

مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا اور غصہ بھی آ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ پہلے کاونٹر پر جا کے غصہ نکالوں مگر آفس جانے کی جلدی تھی۔ آفس جاتے ہوئے یہ سوچ کے خود کو اطمینان دلایا کہ ہمارے فلور کے ہی کسی گھرانے کا بزرگ ہوگا، بڑھاپے میں تو یوں بھی حواس ساتھ نہیں دیتے۔

پاگل تو نہیں لگ رہا تھا سو خطرناک نہیں ہوگا ورنہ اس بلڈنگ میں اتنے کیمرے لگے ہوئے ہیں کہ چڑیا پر نہیں مار سکتی کوئی پاگل بھلا کیسے گھس سکتا ہے۔

دوسرے دن اسی وقت صبح سویرے میں اپنے دروازے سے نکلی آفس کے لئے تو

میرے دروازے کے عین سامنے والے دروازے سے وہ بھی نکلا، بالکل اسی طرح سر جھکائے کسی کو گالیاں دیتا وہ ایلیویٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں ایلیویٹر کے ایک کونے میں سمٹ کے کھڑی ہوگئی۔مگر ایسا لگتا تھا جیسے اسے کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

اسے انگریزی کی ایک سے ایک گالیاں یاد تھیں اور مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی کہ میری صبح کا آغاز ایک سے ایک دقیق گالی سے ہو رہا تھا آج دوسرے دن بھی جی چاہا کے اسے ٹوکوں ''مائنڈ یور لینگویج سر'' مگر اندر کے خوف نے گلا دبوچ لیا۔

کیا پتہ میرے ہی گلے پڑ جائے۔اس دن مگر میں آفس جانے کے لئے پارکنگ میں جانے کی بجائے گڑاؤنڈ فلور پر اتر کے سیدھی سیکیورٹی کاؤنٹر پر پہنچی۔وہ بھی گڑاؤنڈ فلور پر میرے ساتھ ہی اترا اور بلڈنگ کا دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔

''یہ پاگل آدمی کون ہے؟ اور اسے کیوں بلڈنگ میں رہنے کی اجازت ہے''

''مینیجر نے حیرانی سے پوچھا'' کس کو دیکھا آپ نے، کس کی بات کر رہی ہیں؟

''یہی آدمی جو ابھی باہر گیا ہے''

اوہ،،، مسٹر تھامس، آپ پریشان نہ ہوں وہ بہت اچھے انسان ہیں، ساتھ سال نے بلڈنگ میں رہ'' رہے ہیں سب ان کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔

''بس اپنے آپ سے بات کرنے کی عادت ہے انہیں۔

''کیا یہ روزانہ اسی وقت اٹھ کے نیچے آجاتے ہیں؟''

''جی، ان کا روز کا یہی معمول ہے''

تو ہماری ہر صبح کا یہ معمول ہوگا اب ایک سے ایک جدید اور مابعد جدید گالیاں'' میں نے'' ٹھنڈی سانس لی اور صبر کیا۔

اب ہمارا روز کا معمول یہی تھا جو وقت میرے آفس جانے کا تھا ٹھیک وہ وقت ان کے گھر سے نکلنے کا تھا شاید بڑے میاں الارم لگا کے سوتے تھے اس قدر پابندی سے نیچے جانے کے لئے اب یوں تھا کہ'' گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہونا'' والی جون میں آچکی تھی میں، ہم روزانہ چند ساعتوں کے لئے ایلی ویٹر میں ساتھ ہوتے۔

ایک آدھ مرتبہ میں خوش دلی سے'' ہائے'' کہہ کے ان کا دھیان ان کے نامعلوم

ملعونوں سے ہٹانے کی کوشش بھی کی مگر وہ شاید اونچا سنتے تھے۔

الٹ کے دیکھا بھی نہیں میری طرف کئی مہینے گزر گئے مجھے حیرانی تھی کہ میں نے اس گھر سے کسی اور کو باہر نکلتے نہیں دیکھا نہ ہی کسی کو ان سے ملنے آتے دیکھا شاید اکیلے رہتے ہیں یا شاید میرے ہی ساتھ اتفاق ہوا ہو کہ جب میں باہر نکلتی ہوں تو ان کے گھر والے اندر جا چکے ہوتے ہیں۔

ان دنوں میرے پاس چھوٹی بہن آئی ہوئی تھی۔ ویک اینڈ پر بہن کا موڈ شاپنگ کرنے کا تھا سو میں اس کے دونوں بچوں کو اپنی بلڈنگ کے باربی کیو والے پارک میں لے گئی بچوں کے ساتھ پروگرام یہ تھا کہ باربی کیو بھی ہوگا اور خوب اودھم بھی مچائیں گے۔ بچوں نے شور مچا دیا ناشتہ کرتے ہی پارک میں جانے کا۔ وہاں مسٹر تھامس بھی ایک بینچ پر دھوپ میں بیٹھے تھے' 'اچھا تو یہاں آتے ہیں پابندی سے روزانہ صبح کو مگر اتنی پابندی جیسے دفتر جا رہے ہوں'' 'میں نے سوچا اور بچوں کے ساتھ مشغول ہوگئی۔ میں نے نوٹ کیا وہ دھوپ کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ بدل رہے تھے جدھر جدھر دھوپ جاتی وہ بھی کھسک کر ادھر جا بیٹھتے۔ وقفہ وقفہ سے وہ زور زور سے اپنا لعن والا درد شروع کرتے اور پھر سر جھکا کے کسی سوچ میں غرق ہو جاتے۔ میں نے غور سے ڈوبتے سورج جیسے مسٹر تھامس کا چہرا دیکھا۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں عجب مغموم سی تحریر لکھی تھی جیسے آنکھوں کے بجائے دل نے پڑھا۔ اور دل ان کے لئے کچھ اداس سا ہو گیا۔ شام کو میں نے پلیٹ میں کچھ کباب اور سلاد وغیرہ رکھا اور ہمت کر کے پلیٹ لے کے ان کے پاس پہنچ گئی۔

مسٹر تھامس نے سر اٹھا کے حیرانی سے مجھے دیکھا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا'' آپ کے دروازے کے سامنے والا دروازہ میرا ہے ہم پڑوسی ہیں پلیز جوائن کیجیے ہمیں'' انھوں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے پلیٹ لے لی۔'' میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا'' 'میں حیران رہ گئی، آج تک انھوں نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

'' مگر میں تو آفس جاتے ہوئے روزانہ ایلیویٹر میں آپ کے ساتھ ہوتی ہوں''

'' اوہ، اچھا، کوئی خاتون ہوتی تو ہیں مگر میں نے دھیان نہیں دیا تھا'' ہم لوگ اوپر جانے کی تیاری کر رہے تھے تو اچانک وہ ہمارے پاس آئے''

بہت دنوں کے بعد گرم کھانا کھایا ہے، بہت شکریہ آپ کا''

آپ کے ساتھ اور کون رہتا ہے؟'' میرے اندر کے تجسس نے بے تکا سا سوال کر دیا''۔انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور واپس جانے کو مڑ گئے۔کچھ دور جا کے واپس آئے''میں اکیلا رہتا ہوں''

اس ایک جملے نے نجانے کیا کچھ یاد دلا دیا اور وہ شام میری غارت ہوگئی۔تین سال پہلے جب میں اٹوا میں رہتی تھی تب کی بات ہے میری ایک دوست کی ساس کو ہلکا سا سٹروک ہوا تھا۔بس پھر وہ گھر نہیں آئیں ان کو نرسنگ ہوم بھیج دیا گیا وہ نرسنگ ہوم میرے آفس کے راستے میں تھا سو واپسی پر میں ادھر ضرور جاتی۔بہت خوبصورت عمارت تھی وہ باہر سے مگر اتنی بھیانک کہ روح لرز جاتی اندر قدم رکھتے ہی۔اپنے بچوں کا راستہ تکتی دھندلائی آنکھیں،رشتوں کی حرارت کو ترستے جسم یوں دھرے ہوتے ہر بستر پر جیسے کوئی بیکار کی چیز پڑی ہو۔آخری عمر کے ان مجرموں کے لئے ہر لمحہ کتنا بھاری تھا ان پران کی اوزاروں پر جمی کائی سے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔۔۔

میں اکیلا رہتا ہوں'' کہنے والی آواز پر ایسی ہی کائی جمی ہوئی تھی''

مسٹر تھامس سے اب میں ایلی ویٹر میں کوشش کر کے کوئی نہ کوئی بات ضرور کر لیتی تھی اور وہ بھی کبھی کبھار ہلکا سا مسکرا کے میری بات کا جواب بھی دے دیتے تھے بلکہ اب تو انھوں نے بے تکان گالیاں بکنا بھی کم کر دیا تھا اور اکثر تو اگر جلدی نکل آتے اپنے دروازے سے باہر تو کھڑے رہ کے انتظار کرتے۔

میرا نام بھی ان کو یاد ہو گیا تھا میں نے ایک دن ان سے کہا۔

''آج رات کو آپ کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔میں اپنے بیٹوں سے ملاؤں گی آپ کو''

میری بات سن کے ان کا چہرا خوشی سے تمتما اٹھا۔آج وہ پہلی بار کھل کے مسکرائے۔ضرور۔۔۔

''میں تو ترس گیا ہوں کہیں جانے کو میں تو اس آفر کو انکار نہیں کر سکتا''

صاف ستھرے مسٹر تھامس آج کوئی دوسرے ہی انسان لگ رہے تھے۔اونچا قد بڑھاپے کے باوجود مضبوط بدن گہری نیلی بڑی بڑی آنکھیں، ذرا سی توجہ اور محبت سے کسی خبطی بوڑھے کے بجائے آج وہ کس قدر شاندار لگ رہے تھے۔میرے بیٹوں سے گپ لگاتے ہوئے مسٹر تھامس اونچے اونچے قہقہے لگا رہے تھے۔فرخ میرے پاس کچن میں آیا۔جینس ہیں مسٹر تھامس ماماوہ

فوج میں کرنل ہوا کرتے تھے۔ کھانے کی ٹیبل پر باتیں کرتے ہوئے انھوں نے بہت اچانک کہا۔

''میرے چار بیٹے ہیں اور آٹھ گرینڈ چلڈرن''

اوہ،، یہ تو بہت اچھا ہے۔ کیا ٹورنٹو میں رہتے ہیں'' میں نے پوچھا''

''دو ٹورنٹو میں ہیں ایک نیویارک میں ایک کیلیفورنیا میں''

''کرسمس کی چھٹیاں ہونے والی ہیں آپ نے شاپنگ کر لی؟''

مسٹر تھامس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب مجھ چلنا چاہیے بہت دیر ہو گئی''

اب میں اکثر کوئی نہ کوئی ڈش بیگ میں ڈال کے ایک نوٹ کے ساتھ ان کے دروازے کے ہینڈل سے لٹکا آتی تھی۔ چار بیٹوں کے ہوتے ہوئے مسٹر تھامس کا بڑھاپا کتنا بے آسرا تھا ایسی تنہائی کس طرح انسان کو گھن کی طرح اندر سے کھا جاتی ہے مجھے اس کا خوب اندازہ تھا۔ مغرب کے یہ بچوں کی آوازوں سے بھرے پرے گھر صرف گھر والے کی جوانی تک ہی بھرے ہوتے ہیں اس کے بعد ایک ہو کا عالم ہوتا ہے اور وہ، جوانی بھر عیش و آرام کا سامان جوڑنے والے بڑھاپے میں کیسے بے سروساماں ہوتے ہیں۔ جسم تو ہر عمر میں چاہت کا طلبگار ہوتا ہے اس کی نمو ہی محبت کی حرارت میں ہے یہ حرارت ہی نہ ہو تو؟ عجب بات ہے کہ یہاں بڑھاپا گھروں سے بے کار اشیا کی طرح نکال کے کوڑے پر ڈال دیا جاتا ہے۔

اس حقیقت کا ادراک اکثر بہت پریشان کرتا ہے کہ ہم خاندان کا تصور ابھی تک ذہنوں میں محفوظ رکھنے والوں کو'' کیا ہوگا بڑھاپے میں کہیں خدانخواستہ نرسنگ ہوم' اور اس سے آگے سوچتے ہوئے بھی لرزہ طاری ہوتا۔ چار دن ہو گئے تھے مسٹر تھامس کو نہیں دیکھا تو تشویش ہوئی شام کو ایک ڈش جو اس دن ان کو بہت پسند آئی تھی سوچا ان کو بھی بھیج دوں اور خیریت بھی پوچھ لوں۔

دروازہ کافی دیر کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہیں آیا میں پریشان ہو کہ نائن ون ون کو کال کرنے سوچ ہی رہی تھی کہ انھوں نے دو وازہ کھولا مسٹر تھامس بری طرح کھانس رہے تھے دروازہ کھول کے وہ خود کو سنبھالتے ہوئے واپس مڑ گئے۔ ڈرائنگ روم میں بیڈ روم سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی اب وہ صوفے پر نڈھال سے پڑے تھے۔ میں نے واپس مڑ کے بیٹے کو آواز دی۔

''مسٹر تھامس شاید بہت بیمار ہیں جلدی آؤ شاید ان کو ہاسپٹل لے جانا پڑے''

گھر میں داخل ہو کے بجلی جلائی تو لگا یہاں برسوں سے کسی نے صفائی نہ کی ہو۔گھر کیا تھا ''ایک جنک یارڈ تھا گویا۔'' مسٹر تھامس کو بہت تیز بخار تھا۔انہیں واک ان کلینک لے چلتے ہیں میں نے خرم سے کہا۔

''نہیں۔پہلے ان کے بیٹے کو فون کریں ان کو بتانا بہت ضروری ہے''

میں نے مسٹر تھامس سے فون نمبر مانگا تو وہ کھانستے جاتے اور گالی بکتے جاتے بیٹوں کے نام کی وہ ٹوٹی ٹوٹی آواز میں اپنا مرثیہ سنا رہے تھے۔

تین سال سے میں نے ان کی شکل نہیں دیکھی۔پہلے پہلے بہت فون کرتا رہا۔پھر فون کرنا چھوڑ دیا۔آئیں گے،مگر میرے بعد تا کہ اس مہنگے اپارٹمنٹ میں اپنا حصہ لے سکیں انھوں نے فون نمبر دینے سے انکار کر دیا۔ہم ایک مہینے تک روزانہ ہاسپٹل جاتے رہے ان کا لیور کینسر آخری مراحل میں تھا۔

کسی انتظار سے شرمندہ ہو کے وہ اب بھی اکثر چلا اٹھتے تھے

"I don't give a shit too"

مسٹر تھامس کی منتظر مگر خوددار آنکھیں شاید تھک چکی تھیں کسی بے سبب کے انتظار سے شام ڈوب رہی تھی،کئی دن کی بے ہوشی کے بعد انھوں نے ہم لوگوں کی آہٹ پر آنکھیں کھولیں۔

وہ نہیں آئے؟''میرا دل تڑپ گیا اس آخری وقت کی نامرادی پر۔''

آنسو کا ایک قطرہ بند ہوتی پلکوں پر اب بھی جما ہوا تھا اور سرد ہونٹوں پر ایک خود دار جملہ۔

''مجھے کسی کا انتظار نہیں ہے''

سراپا انتظار مسٹر تھامس کے پتھرائے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجب سی مسکراہٹ تھی۔نہ جانے وہ مسکراہٹ تھی یا وقت کے چہرے پر طنز کی ایک لکیر وہ صبح سے شام تک گھر کی وحشت سے بھاگ کے باغیچے میں تن وتنہا گزارنے کے عذاب سے آزاد ہو چکے تھے۔

آج ان کی تدفین ہے۔ان کے چاروں بیٹے سیاہ سوٹ میں ملبوس اپنے بیوی بچوں کے ساتھ موجود ہیں اس کے علاوہ بہت سے افراد اور بھی ہیں جو سیاہ سوٹ میں ملبوس بہت دھیمے لہجے میں ایک دوسرے سے محو گفتگو ہیں۔بہت خوب صورت ہال میں انھوں نے مسٹر تھامس کی

رخصتی کا بڑا شاندار اہتمام کیا ہے اب پوڈیم پر مسٹر تھامس کا بیٹا اپنے شاندار باپ کے کرنل کے عہدے کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی شخصیت کے بہت سے خوب صورت پہلوا جاگر کر رہا ہے۔ کئی افراد نے تقریر کی ان کے ایوارڈ گنوائے۔ خراج تحسین پیش کیا مغفرت کی دعائیں کی گئیں۔

میں نے پلٹ کے مسٹر تھامس کے اس تابوت کی طرف دیکھا جو پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ عجیب بات دیکھی میں نے۔ اس تابوت میں سے ملگجے کپڑوں میں ملبوس ایک خبطی سا بوڑھا اٹھا۔۔۔۔اس نے ہاتھ اٹھا کے مجمع کو مخاطب کیا۔

"Fuck you all. ... go to hell"

اور بڑبڑاتا ہوا ہال سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆

بہرام کا گھر

شموئل احمد (انڈیا)

اب آنگن میں پتے نہیں سرسراتے تھے۔ درو دیوار پر کسی سائے کا گمان نہیں گزرتا تھا۔ بڑھیا کے آنسو اب خشک ہو چکے تھے۔ وہ روتی نہیں تھی۔ بیٹے کا ذکر بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ اب دور خلا میں کہیں تکتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی تو ہائے مولا کہہ کر چیخ اٹھتی اور پھر خاموش ہو جاتی۔ پاس پڑوس والے بھی اب بیٹے کی بابت کچھ پوچھتے نہیں تھے۔

اس دن بھی وہ ہائے مولا کہہ کر چیخ اٹھی تھی۔ پھر دو ہتھڑ سینے پر مارا تھا اور بیہوش ہو گئی تھی۔ شہر میں دنگا اسی دن بھڑکا تھا اور بیٹا گھر لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ جب دوسرے دن بھی گھر نہیں لوٹا تو بڑھیا بے تحاشا نیک نام شاہ کے مزار کی طرف دوڑ پڑی تھی۔

بیٹے کو جب بھی کچھ ہوتا وہ نیک نام شاہ کا مزار پکڑ لیتی۔ یہ نیک نام شاہ کا ہی ''فیض'' تھا کہ بیس سال پہلے اس کی گود بھری تھی۔ ورنہ کہاں کہاں نہیں بھٹکی تھی، کس کس مزار پر چلہ نہیں کھینچا تھا۔ کیسی کیسی منتیں نہیں مانی تھیں۔ آخر کار نیک نام شاہ کی بندگی راس آ گئی تھی اور اس کی گود میں چاند اُتر آیا تھا۔ تب سے بلا ناغہ ہر جمعرات کو مزار پر اگربتی جلاتی آئی تھی اور بیٹے کی خیر و عافیت کی دعائیں مانگتی رہتی تھی۔

لیکن اس دن آسمان کا رنگ گہرا سرخ تھا اور زمین تنگ ہو گئی تھی۔ وہ مزار تک پہنچ نہیں

سکی۔ دنگائیوں نے راستے میں گھیر لیا تھا۔ اس پر نیزے سے حملے ہوئے تھے۔ بڑھیا سخت جان تھی، مری نہیں۔۔۔ نیزے کھا کر بھی زندہ رہی۔ عین وقت پر پولیس کا گشتی دل پہنچ گیا اور وہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچا دی گئی تھی۔

بڑھیا ہسپتال سے اچھی ہو کر آ گئی، لیکن بیٹا نہیں آیا۔ وہ دیوانوں کی طرح سب سے اس کا پتہ پوچھتی رہی۔ محلے کی عورتوں سے لپٹ کر روتی رہی۔ مزار پر سر پٹکتی رہی۔۔۔ لیکن۔۔۔ تلاش مرتی نہیں ہے۔۔۔ تلاش آنکھوں میں رہتی ہے۔۔۔ آنکھوں سے گزرتی ہوئی دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔۔۔ تب آنکھیں دور خلا میں کہیں تکتی رہتی ہیں۔۔۔ اور بڑھیا کی آنکھیں۔۔۔

محلے ٹولے کو فکر تھی کہ بڑھیا کا کیا ہوگا۔۔۔؟ ایک ہی بیٹا تھا۔۔۔ بھری جوانی میں اٹھ گیا۔۔۔ کم سے کم لاش بھی مل جاتی تو صبر آ جاتا۔۔۔ اور اگر اس بات کی تصدیق ہو جاتی کہ دنگے میں مارا گیا ہے تو ہرجانے کی رقم بھی مل جاتی۔ رقم کثیر تھی۔۔۔ ایک لاکھ روپے۔۔۔۔ رشتہ داروں کو فکر ہوئی کہ لاش کا کیا ہوا۔۔۔؟

ماموں نے تھانے میں سانحہ درج کرا دیا۔ سانحہ میں بتایا گیا کہ اس دن وہ گھر سے بانکا کے لئے روانہ ہوا تھا۔ سرخ رنگ کی ٹی شرٹ اور سیاہ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ دائیں ہاتھ کی انگلی میں ایک سونے کی انگوٹھی تھی جس میں انگریزی کا حرف ''اے'' کندہ تھا۔

شہر میں جیسے جیسے امن لوٹنے لگا اڑتی پڑتی خبریں بھی ملنے لگیں۔ کسی نے بتایا کہ اس دن وہ علی گنج میں دیکھا گیا تھا۔ دوستوں نے بہت روکا مت جاؤ۔ خطرہ ہے۔۔۔ لیکن وہ یہی کہتا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ وہ رات بہرام کے ہاں رُک جائے گا اور صبح تڑکے اپنے گھر چلا جائے گا۔۔۔

پھر خبر ملی کہ ڈی وی سی چوک کے قریب موب نے اس کو گھیر لیا تھا۔ محلے والے بھاگ کر بہرام کے ہاں چھپ گئے تھے، لیکن وہ۔۔۔

بتانے والے نے اس بات کی تصدیق کی کہ وہ سرخ رنگ کی شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی تھا۔۔۔ پھر یہ کہتے کہتے رکا تھا کہ لاش چوک کے قریب ہی ایک کنویں میں۔۔۔

(۲)

ماموں نے علاقہ کا چکر کاٹا۔ ڈی وی سی چوک سے شمال کی طرف جانے والی سڑک پر دور تک گئے۔ ایک جگہ ان کا ماتھا ٹھنکا۔ آم کے باغیچہ کے قریب ایک کنویں کی منڈیر پر دو چار گدھ منڈلا رہے تھے۔ قریب جا کر کنویں میں جھانکا تو بدبو کا ایک بھبھکا سا آیا۔ ایک گدھ اُڑ کر پیڑ پر بیٹھ گیا۔ آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیاں کھل گئیں راہ گیر رک رک کر دیکھنے لگے۔ پھر ان میں چہ میگوئیاں بھی ہونے لگیں تو ماموں کو محسوس ہوا کہ فضا میں تناؤ پھیلنے لگا ہے۔ وہ وہاں سے ہٹ گئے۔

محلے میں خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ لاش مل گئی ہے۔ عورتیں بڑھیا کے گھر جمع ہو گئیں۔ ممانی چیخ چیخ کر روئی۔ سر کے بال نوچے، گریباں پھاڑا۔ بڑھیا ایک ٹک خلا میں کہیں تکتی رہی۔

ماموں نے تھانے میں عرضی دی کہ لاش کا پتہ چل گیا ہے اور یہ کہ لاش برامد ہونے پر علاقہ میں تناؤ پھیل سکتا ہے۔ اس لئے پولیس کی ایک ٹولی ساتھ کی جائے گی تا کہ لاش کنویں سے باہر نکالی جا سکے۔ ایس پی نے ایک دن ٹال مٹول کیا اور پھر اجازت دے دی اور ایک حوالدار اور چند کانسٹیبل ساتھ کر دیئے۔

ماموں کنویں پر پہنچے۔ ساتھ میں کچھ رشتہ دار اور محلے کے چند نو جوان بھی تھے۔ مزدوروں کو بھی ساتھ لیا گیا، ٹھرے کی بوتلیں بھی لی گئیں۔

کنویں پر پہنچ کر سب نے ایک ساتھ اندر جھانکا۔

''بہت بدبو ہے''

''صاحب۔۔۔ ٹھرا منگائیں۔۔۔'' ایک مزدور بولا۔

ماموں نے جھولے سے ٹھرے کی ایک بوتل نکالی۔

''موب نے اس چوک پر گھیرا تھا۔'' ایک رشتہ دار نے سامنے اشارہ کیا۔

''دوستوں نے بہت روکا لیکن۔۔۔''

''وہ گھر سے باہر کیوں نکلا۔۔۔؟''

''باہر جانے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔؟''

''جنابر ہے۔۔۔''ایک مزدور وہاں سے چلایا۔

''جناور کہاں سے آ گیا۔۔؟''

ماموں جھلا اٹھے۔ایک بار پھر سب نے ایک ساتھ کنویں میں جھانکا۔

''کوئی بیگا ہوگا صاحب۔'' دوسرا مزدور بولا۔

''جانور ہی ہے۔''

''سور مرل با۔۔۔''

ماموں نے غور سے دیکھا۔سور ہی تھا۔

''یہ تو سراسر بدمعاشی ہے۔''

(۳)

ایک رشتہ دار نے آس پاس مکانوں کی طرف دیکھا۔

''یہ لوگ نہیں چاہتے کہ لاش نکالی جائے۔۔۔''

''لاش نکل گئی تو سب پھنس جائیں گے۔۔۔''

''کوئی پھنستا وستا نہیں ہے۔آج تک نہیں سنا کہ کسی دنگائی کو پھانسی ہوئی ہے۔۔۔''

''صاحب۔۔۔۔پہلے سور نکالے کے پڑی۔۔۔''

''سور نہیں۔۔۔پہلے لاش نکالو۔۔''

''لاش کا کچھ پتہ با۔۔۔''

ایک مزدور نے رسی نیچے لٹکائی۔عورتیں چھت پر چڑھ کر دیکھنے لگیں۔ایک سپاہی کھینی ملنے لگا۔

''بیچارے کی حال میں منگنی ہوئی تھی۔''

''وہ گھر سے باہر کیوں نکلا۔۔؟''

''جب جانتا تھا کہ شہر میں تناؤ ہے تو۔۔۔''

''کیا معلوم تھا دنگا اسی دن بھڑکے گا۔۔''

''موت تھی۔۔۔''

''قسمت کا لکھا۔۔۔بڑھیا بچ گئی۔اکلوتا جوان بیٹا اُٹھ گیا'' ماموں نے سرد آہ بھری۔

''بہت کچرا ہے اندر۔۔۔'' مزدور کنویں کے اندر سے چلایا۔

ماموں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر آہ بھرتے ہوئے بولے۔

''ظالموں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینکا ہے۔''

''علی گنج میں رُک جاتا۔۔۔''

''موت کھینچ کر لائی۔۔۔''

''کہتا تھا بہرام کے گھر جاؤں گا۔۔۔بیچارہ چوک پر ہی پکڑا گیا۔۔۔''

سپاہی نے کھینی کو تال دیا تو ایک کوّا پیڑ سے اُڑ کر سامنے ایک مکان کی چھت پر لگے انٹینا پر بیٹھ گیا۔

نیچے جو مزدور تھا اس نے سور کی ٹانگوں کو رسی سے باندھا لیکن اوپر سے کھینچنے میں نہیں بن پڑا، تب ایک اور مزدور نیچے اُترا۔دنوں نے مل کر سور کو اوپر اُٹھایا۔باقی مزدوراں نے کنویں کی منڈیر پر کھڑے ہو کر رسی اوپر کی طرف کھینچی۔۔۔سور کی لاش باہر آئی تو پیڑ پر کوؤں کا شور بڑھ گیا۔ سور کا پیٹ پھولا ہوا تھا۔

سڑک کی طرف سے ایک کتا بھاگتا ہوا آیا اور قریب آ کر بھونکنے لگا۔

(۴)

''ہش'' سپاہی نے زور سے ایک پاؤں زمین پر پٹکا۔کتا کچھ دور پیچھے بھاگا اور پھر بھونکنے لگا۔سپاہی نے جھک کر پتھر اُٹھایا تو کتا بھاگ کر سڑک پر چلا گیا اور وہاں سے زور زور سے بھونکنے لگا۔

کچرا باہر نکالنے کے لئے ایک ٹوکری نیچے لٹکائی گئی۔ ماموں نے بیڑی سلگائی اور زمین پر بیٹھ کر دم مارنے لگے۔

کچرے کی صفائی میں یکا یک قمیص برآمد ہوئی۔قمیص کے ساتھ لپٹا ہوا ہاتھ کا ایک بازو بھی تھا، سبھی چونک کر دیکھنے لگے۔قمیص کیچڑ میں لت پت تھی،خون کے دھبے جگہ جگہ سیاہ ہو گئے

تھے۔ ماموں نے غور سے دیکھا۔ قمیص کا رنگ سرخ معلوم ہوا۔

''پتلون بھی ہوگی۔۔۔''ایک رشتہ دار بولا۔

''پنجہ دیکھو۔۔۔پنجہ۔۔۔''

''بازو کے ساتھ پنجہ نہیں ہے۔۔۔''ماموں نے کنویں میں جھانک کر کہا۔ حوالدار نے ہدایت دی کہ بازو اور قمیص کو کچرے سے الگ رکھا جائے ماموں نے چادر بچھائی اور لکڑی کے ایک ٹکڑے سے قمیض کو بازو سمیت اُٹھا کر چادر پر رکھا۔

کچرے کی ٹوکری پھر باہر آئی تو ایک کٹی ہوئی ٹانگ برآمد ہوئی۔

''پنجہ کہاں گیا۔۔؟؟''ماموں نے پھر کنویں میں جھانکا۔

''اندر دھنس گیا ہوگا۔۔۔''

''تھوڑی اور صفائی کی ضرورت ہے۔''

''تھوڑا اور کچرا باہر نکالو۔۔۔''

اس بار کچرے کے ساتھ پنجہ برآمد ہوا۔ ماموں نے دیکھا۔۔۔پنجہ ہی تھا۔ لیکن انگوٹھی نہیں تھی۔ انگلیاں مڑی ہوئی بالکل سیاہ ہو رہی تھیں۔

''انگوٹھی نہیں ہے۔۔۔''ماموں آہستہ سے بڑبڑائے۔ پھر غور سے دیکھا۔

''یہ تو بائیں ہاتھ کا پنجہ ہے۔''

''دائیں ہاتھ کا پنجہ کہاں ہے؟''

''اندر سجھائی نہیں دیتا صاحب۔۔۔''

ماموں نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شام ہو چلی تھی۔ سارا وقت تو سور نکالنے میں لگ گیا تھا۔

''دیکھو۔۔۔کوشش کرو۔ دائیں ہاتھ کا پنجہ چاہیے۔۔۔''

''اب چلیے۔۔۔''حوالدار نے ڈنڈے سے اشارہ کیا۔

''حوالدار صاحب۔۔۔تھوڑی اور کوشش کر لینے دیجیے۔۔۔''

ماموں نے پھر کنویں میں جھانکا۔ مزدور باہر نکل رہے تھے۔

’’کیا ہوا‘‘

’’اب ٹائم نہیں ہے۔۔۔‘‘

’’پنچہ ضروری ہے۔۔۔‘‘

(۵)

’’اندر سجھائی نہیں دیتا ہے تو کیا کریں۔۔۔؟‘‘

’’چلیئے۔۔۔‘‘ حوالدار نے زمین پر ڈنڈا کھٹکھٹایا۔

ماموں نے چادر سمیٹی۔۔۔سب جیپ پر بیٹھے۔ جیپ آگے بڑھی۔ یکا یک چوک پر بڑھیا نظر آئی۔ ماموں کو حیرت ہوئی۔ جیپ رکوائی اور جھنجھلاتے ہوئے نیچے اُترے۔ بڑھیا کسی سے کچھ پوچھ رہی تھی۔

’’بہرام کا گھر دیکھتی۔۔۔‘‘

’’اب بہرام کا گھر دیکھ کر کیا ہوگا۔۔۔؟‘‘ ماموں کی جھنجھلاہٹ بڑھ گئی۔

’’بچہ کہتا تھا بہرام کے گھر جاؤں گا۔ سب بہرام کے گھر چھپے تھے۔۔۔ ذرا دیکھتی۔‘‘ کتنی دور اس کا گھر رہ گیا تھا۔۔۔؟

ماموں نے چہرہ کا پسینہ پونچھا۔ بڑھیا حسرت سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور دفعتاً اس کی آنکھوں میں بجھی ہوئی لو کا دھواں تیرنے لگا تھا۔

☆☆☆☆

کتن والی

سبین علی (جدہ، سعودی عرب)

سوت کو مختلف رنگوں میں رنگ کر امتزاج اور توازن کو صغریٰ مائی جانے کس طرح قائم رکھتی تھی اور یہ بھی کسی کے علم میں نہیں تھا کہ پکی آبادی میں بسنے کی بجائے جولا ہوں کے اس مختصر کنبے نے جھگی بڑی نہر اور راج باہ کے بیچ میں موجود جگہ پر کیوں ڈال رکھی تھی۔ پہلے پہل یہ علاقہ مضافات میں شمار کیا جاتا تھا مگر کچھ سال بعد ہی شہر کے اندر شامل ہو چکا تھا۔

فیکے جولاہے کی انگلیاں پاور لوموں کے بیم سے اترے ویسٹ تانے کو بل دے کر سوت بٹنے کی اتنی عادی ہو چکی تھیں کہ خواہ وہ حقے کی تازہ چلم کو کش لگا رہا ہوتا یا کسی گاہک کو اپنی چرب زبانی سے گھیر کر کھیسوں کی افادیت پر دلائل دے رہا ہوتا، اس کی ٹیڑھی انگلیاں مسلسل گولے کو گھماتی اور بل دیتی رہتیں۔ ایک ہی لڑکا تھا جو ویونگ فیکٹری میں وائینڈر پر بابنیں بھرتا تھا۔ اگر کھیس جتنی کا کوئی گاہک مل جاتا تو ان کی آبائی کھڈی چلتی ورنہ فیکا جولاہا سوت بٹ کر چارپائیاں بننے والا بان بنا ڈالتا۔

بابا فیکا اور صغریٰ جسے عرف عام میں سب مائی جولاہی کہتے تھے فیصل آباد شہر میں بس کر خود کو قدرے آسودہ محسوس کرنے لگے تھے۔ پاور لومز کی کثرت میں انہیں نا صرف سوت آسانی سے دستیاب ہوتا بلکہ دستی کھڈی پر بنی دریاں کھیس اور چٹنیاں بھی آسانی سے بک جاتیں۔ صغری جولاہی اور بابے فیکے پر بڑھاپے کی آمد آمد تھی۔ ان کی انگلیوں پر سوتر کے گولوں کو بل دیتے اور تانے بانے میں الجھتے الجھتے گٹھے پڑھ چکے تھے۔

مائی دبلی پتلی اور چست تھی۔ ہر کام بڑی محنت اور نفاست سے کرتی، تیکھے نقوش مگر رنگ دھوپ میں جل کر سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ بڑی روشن آنکھیں جن کی نظر عمر کے ساتھ کمزور ہو رہی تھی۔ بال کہیں سفید کہیں سیاہ اور کہیں کہیں لال مہندی کے آثار کا پتا بتاتے۔ اکثر چھوٹے پھولوں والے پرنٹ کا گول گلے والا کرتا جس کی اطراف میں جیبیں لگی ہوتیں اور سادہ شلوار پہنتی۔ ایک ہاتھ میں کانچ کا موٹا کڑا، انگلیوں میں مختلف رنگوں کے کانچ کے چھلے اور کانوں میں چاندی کی بالیاں پہنے رکھتی۔ اس کی انگلیوں میں پرکھوں کا ہنر تھا تو فطرت میں رنگوں کے استعمال اور نمونے بنانے کی صلاحیت ودیعت ہوئی تھی۔ عام سی جھگی کو اس نے نفاست سے سجایا ہوا تھا۔ لال اینٹوں کے فرش پر جیومیٹری کی اشکال والے نمونوں سے مزین صاف ستھری دری پڑی ہوتی۔ جھگی کے دروازے پر پڑا پھولدار پردہ، مٹی کا چولہا جس پر نقش نگار بنے تھے، چھوٹی دیواریں اور گاچنی سے لیپ کیے ہوئے پیندے والے چمکتے برتن غرضیکہ جھگی کی ہر چیز اس کی نفاست کی گواہی دیتی۔

اُس سال سردی کی شدید لہر اور نہر کنارے پڑنے والی گہری دھند فیکے کو نمونیے کا تحفہ دے چکی تھی کھانس کھانس کر بدحال ہو جاتا تو بلغم کے ساتھ کبھی چونی کبھی اٹھنی جتنا خون بھی لگا ہوتا۔ دھیرے دھیرے اس کا وجود متروک سکوں کی مانند ختم ہوتا جا رہا تھا۔ کھڈی پر باریک تانا چڑھانے کا کام ان کے لڑکے بھولے کو نہیں آتا تھا۔ اگر بابا فیکا کسی طرح تانا باندھ دیتا تو بھولا کھڈی پر سادہ بنائی کر لیتا تھا۔

گھر کی صفائی ستھرائی اور ہانڈی چولہا کرتے وقت مائی بہت شوق سے ریڈیو سنتی۔ کئی خبریں اور باتیں اس کے لیے بالکل انوکھی اور حیرانی کا باعث ہوتیں۔ کبھی ماہیے سنتی تو دھیان اپنے چہرے پر نمودار ہوتی جھریوں کی طرف بھی چلا جاتا۔

سوتر منڈی اور ملوں سے لے کر فیکے جولاہے تک ایک وقت میں سب لوگوں کا روزگار خوب پھلا پھولا تھا۔ ہفتے میں ایک دن بجلی کا ناغہ ہوتا۔ کسی علاقے میں یہ ناغہ جمعے کو ہوتا اور کسی علاقے میں اتوار کو۔ اور اسی دن مزدوروں کی ہفتہ وار چھٹی ہوتی۔ ہر مزدور کم سہی لیکن رات کو دیہاڑی لے کر گھر آتا۔ مگر یہ سب اسی رفتار سے نمو پذیر نہ رہا۔ ریڈیو سا ندل بار پنجابی پروگرام میں میزبان اکثر کہا کرتا تھا! محنت کش اس قوم کا ہاتھ ہیں۔ کئی بار یہ سن کر اس کی سوچوں کا تانا بنا

بندھ جاتا کہ مجھ جولا ہی کے ان ہاتھوں نے کتنے سوت بٹے ہیں پر جھگی سے باہر درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور بہتی نہر پر ان کا کیا حق ؟ پھر سوچتی کہ ملک کی بڑی بڑی باتوں اور آنے والے وقت پر اس کا اتنا ہی اختیار ہے جتنا گھاس کا موسموں پر۔ سورج اپنا سفر مختصر یا طویل کرتے وقت گھاس سے صلاح مشورہ کبھی نہیں کرتا۔ گھاس ہی خود کو موسموں کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔

غیر محسوس طریقے سے پاوڈر کا زہر پورے شہر یا شاید پورے ملک کی رگوں میں اتارا جارہا تھا۔ مائی جولاہی کو تو ملک کے طول وعرض کا اندازہ تھا نہ ہی شہروں کے نام یاد تھے۔ اس غریب نے تو پاس ہی صدیوں سے بسنے والا شہر لاہور تک نہ دیکھا تھا۔ سنا کرتی تھی کہ جسے لہور نئیں ویکھیا او جمیا ای نئیں تو کئی بار دل ہی دل میں ارادہ کرتی کہ اگر اس بار اچھی بچت ہوئی تو دا تا دربار کا عرس دیکھنے کے بہانے ہی لہور شہر دیکھ لے گی۔

مگر اسے اتنا ضرور علم تھا کہ لڑکوں بالوں اور دیہاڑی پر کام کرنے والے غریب مزدوروں کی کثیر تعداد آہستہ آہستہ ہیروئین کی پڑیوں کے نشے کی عادی ہو چکی جن میں بھولا بھی شامل تھا۔ ان کے وجود کے نئے نکور سکے دیا سلائی کی آنچ پر دمکتے سفید سے سیاہ ہوتے پاوڈر کو اپنے اندر تحلیل کرتے کھوٹے ہوتے جارہے تھے۔ کبھی وہ سوچتی کہ اگر یہ سب اسے نظر آرہا ہے تو بڑوں کو بھی نظر آتا ہوگا ایک دن وہ کوئی جادو کی چھڑی گھمائیں گے تو جیسے یہ پڑیاں گلی گلی بکنے لگی تھیں ایک دن اچانک غائب بھی ہو جائیں گی اور اس کا بھولا جواب وائینڈر پر بابنیں بھرنے کا کام قد نکلنے کی وجہ سے چھوڑ چکا ہے پھر سے اپنے باپ کی کھڈی سنبھال لے گا۔

انہی دنوں فیکا جولاہا گرمیوں کا موسم آنے سے قبل ہی مٹی میں جا سمایا۔ بھولا کبھی لوموں پر کام کر لیتا تو کبھی سوت بٹ لیتا۔ کہیں اسی تو کہیں سو روپیہ دیہاڑی ملتی تھی جس میں سے پچاس روپے کی پڑی آ جاتی۔ اگر پڑی نہ پیتا تو سارا بدن ٹوٹنے لگتا اور وہ ماہی بے آب کی مانند تڑپتا مٹی میں پلسیٹیاں لیتا ہائے ہائے کرتا رہتا۔ مائی جولاہی سے اکلوتی اولاد کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی۔ اسی مجبوری میں اجرت پر کبھی کسی کی چارپائیوں کے سنگے نکال آتی تو کہیں کسی کے گھر میں رضائیوں کے نگندے بھر آتی کہ جسم وجان کا رشتہ برقرار رہے۔

کچھ عرصہ تو اسی طرح چلتا رہا مگر جب بھولا بالکل ہی کام سے جانے لگا تو مائی جولاہی

نے ہمت پکڑی کہ کسی طرح کھڈی پھر سے چلنے لگے۔

بی بی جی ہم ہنرمند ہیں بھیک مانگ کرنہیں کھاتے ، رب سوہنے کا کرم کہ کھڈی کی صورت روزی کی آس لگائی ہوئی ہے۔ بس اتنی حسرت ہے کہ کہیں سے سوتر مل جائے تو مہینوں کا بیکار پڑا بھولا کھڈی جوڑ لے۔

مائی جولاہی عاصمہ سے منت سماجت کر رہی تھی۔

عاصمہ ایک کالج میں تاریخ کی لیکچرار تھی۔ اکثر گھر کے کام کاج کے لیے اسے کسی کام کرنے والی عورت کی ضرورت پیش آتی رہتی۔ مائی جولاہی کئی بار ان کی رضائیاں نگند چکی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ عاصمہ بی بی کے میاں کی ویونگ فیکٹری ہے تو مائی نے بڑی آس لگاتے ہوئے اسے اپنا دکھڑا کہہ سنایا۔ عاصمہ ایک خدا ترس عورت تھی اسے مائی جولاہی کے سب حالات کا علم ہوا تو دل میں اس غریب عورت کے لیے ہمدردی جاگ اٹھی۔

مائی کھیسوں کا تو رواج ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اچھا خیر میں تمہیں فیکٹری سے ویسٹ منگوا دوں گی تم دیکھ لینا اس سے کیا بنتا ہے، عاصمہ نے مائی جولاہی کو دلاسا دیا۔

کچھ دن بعد جب عاصمہ کے گھر سے مائی جولاہی سوت لے کر نکلی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ ادھورے اور کچھ ان دیکھے خواب پھر سے بننے لگیں۔ جھگی کی طرف اٹھتے ہر قدم کے ساتھ ازلی تفکرات کے تانے میں خوابوں کا بانا جوڑتی رہی کہ اس بار بھولے کا علاج کرالے گی۔ کچی آبادی میں کوئی ڈھائی مرلے کا مکان بھی لے گی، بھولے کے سر سہرہ سجے گا تو سونا آنگن کھل اٹھے گا۔

بھولا جو اپنے نشے کی لت سے تنگ آ چکا تھا مگر جان چھڑانے کا کوئی راستہ اس کے سامنے نہیں تھا سوت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اگر موٹے بانے کے ساتھ ایک دن میں ایک دری بنا لیتا تو سو روپے کی بچت لازمی تھی۔

مائی جولاہی نے اپنی ماہر انگلیوں سے تانا باندھنا شروع کیا تو بھولا بھی ساتھ لگ گیا۔ بانے کے لیے مائی نے سوت کو لال نیلے پیلے جامنی اور کالے رنگوں میں رنگ کر ڈیزائین بھولے کو سمجھانا شروع کیے۔ بھولا جو پاور لوموں پر کام کرنے کی وجہ سے دستی کھڈی پر ڈیزائین والے کھیس دریاں بنانا اچھی طرح سے سیکھ نہیں پایا تھا ایک مفعول بنا ماں کی ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ جب دیگر

کی بانگ کے ساتھ دری کھڈی سے اتاری تو طمانیت کا احساس اس کی ساری تھکن اتار گیا ان تخلیقی رنگوں میں امید کی کرن تھی۔ مائی نے اگلے ہی دن دری بغل میں دابی اور عاصمہ بی بی کے گھر پہنچ گئی۔کھڈی چالو ہونے پر اس کی خوشی دیدنی تھی اس کا پہلا خواب تعبیر ہونے جا رہا تھا۔

عاصمہ جسے آرٹ کی کچھ سمجھ بوجھ بھی تھی بوڑھی ان پڑھ جولاہی کی فنکارانہ چابک دستی اور نفاست سے رنگوں کا استعمال دیکھ کر حیران رہ گئی۔مائی کی چوٹ نشانے پر پڑی تھی، اس نے جان لیا تھا کہ اپنے ہنر کو بدلتے وقت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں ہی ان کی بقا ہے۔اپنی اجرت لیتے ہوئے مائی نے بڑی امید کے ساتھ عاصمہ سے ایک اور تقاضا کیا۔

بی بی جی اگر تُسی برا نا مانو تے اپنے کالج کی دوسری استانیوں کو بھی میری بنی دریاں دکھانا۔تہاڈی مہربانی نال مجھ غریبنی کا آٹا دال لگا رہے گا۔

اچھا مائی تم ایسا کرو کچھ دریاں بنا کر تیار رکھو دو ہفتے بعد میری کچھ سہیلیاں آ رہی اس دن سب کو دریاں دکھانا شاید بک جائیں۔عاصمہ نے ہمدردی میں ہامی بھرتے ہوئے کہا۔

پر بی بی جی روز پچاس روپے تو بھولے کی پڑی کے چاہیں، پڑی نہ ملے تو وہ کھڈی پر بھی نہ کھلو سکے۔مائی نے فکرمندی سے کہا۔

مائی جتنا مجھ سے ہو سکا میں تیرا ساتھ دے تو رہی ہوں تیرے بیٹے کا کہیں سے علاج ہو جاتا تو اچھا تھا۔عاصمہ نے تاسف سے کہا۔

بی بی جی اللہ وارث ہے صغریٰ نے بڑے حوصلے سے امید بھرے لہجے میں جواب دیا۔بھولے نے بھی جی جان سے ماں کا ساتھ دیا۔ان کی بنی دریاں کچھ منفرد نمونوں کی بنا پر اور کچھ عاصمہ کی مدد کی وجہ سے خوب بکیں۔اس کی کئی کولیگز نے مائی جولاہی سے اپنی اپنی پسند کے مطابق سائی دے کر مختلف طرز کے کھیس اور دریاں بنوائیں۔عاصمہ کے دل میں مائی جولاہی کے فن اور مشقت کی وجہ سے جو انسیت اور ہمدردی پیدا ہو چکی تھی وہ صغریٰ کے لیے کسی بڑے آسرے سے کم نہ تھی۔

جیسے بجھنے سے قبل ایک بار چراغ پوری تمکنت سے جگمگاتا ہے اسی طرح کچھ عرصہ ان کا ہنر بھی جگمگایا۔بھولے نے خراب صحت کے باوجود اپنی ماں کا ساتھ نبھاتے ہوئے منفرد سے منفرد نمونے بنائے گویا اپنی محنت کا سارا نچوڑ اور مائی کے فن کی ساری مہارت کھڈی میں ڈال کر کوئی

عجوبے تخلیق کرنے بیٹھا ہو۔ مائی کے خوابوں کو ایک نیا جزیرہ مل گیا تھا کبھی خواب دیکھتی کہ اس کی بنی دریوں کی مانگ سارے شہر میں ہے۔ کبھی خواب میں ڈھیر سارا سوت نظر آتا تو کبھی بے شمار رنگ اور کبھی ایک کی بجائے دو دو کھڈیاں نظر آتیں۔ لیکن خوابوں کے برعکس بھولے کی دن بدن کمزور ہوتی صحت بدصورت حقیقت بن کر سامنے موجود ہوتی۔

جب سے عاصمہ کو شوگر کا مرض لاحق ہوا اسے ڈاکٹر نے صبح سویرے واک کرنے کی تاکید کی تھی۔ اکثر وہ نہر کنارے بنے ٹریک پر چہل قدمی کرنے جاتی جہاں بہت سے لوگ موجود ہوتے بڑی سڑک کے ساتھ والی نہر سے کچھ آگے جا کر راج باہ نکلتی۔ وہاں قریب ہی مائی جولاہی کی جھونپڑی تھی۔ ایک بار وہ مائی کی جھونپڑی میں گئی تو اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر جکڑ لیا۔ بوڑھی عورت کا اکلوتا سہارا اس کا بیٹا بھولا سوکھ کر ڈھانچہ بنتا جا رہا تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، سوکھے چمڑے جیسی جلد، جلے ہاتھ، زرد چہرہ، عاصمہ کو لگا جیسے وہ میوزیم میں رکھا کسی فاقہ زدہ شخص کا قدیم سنگی مجسمہ دیکھ رہی ہو۔

بھولے سے باریک کھیس پہلے ہی نہیں بنتے تھے اب موٹے سوت سے رنگین دریاں بنانا بھی اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ صغریٰ اپنے ناتواں کندھوں پر جوان بیٹے کا بوجھ بڑی استقامت سے اٹھائے ہوئے تھی۔ بھولے کا کہیں آنا جانا اور جھونپڑی سے نکلنا بہت محدود ہو چکا تھا۔ صغریٰ خود ہی بنت کرتی اور کسی نہ کسی طرح پیسے بچا کر اس کے لیے پڑی لے آتی وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو نشہ ٹوٹنے پر بری طرح تڑپتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ محنت ومشقت کی آدھی سے زائد کمائی اس طرح لٹ جاتی۔ پھر بھی وہ اپنی ہمت کسی مشکل وقت کے لیے بچائی نقدی کی مانند جوڑے رکھتی۔ لوگوں کے سامنے وہ نہ تو بھولے کی کمزور صحت کا رونا روتی اور نہ ہی نشہ کرنے پر اس کی برائی کرتی۔ سیاہ رات اپنے آنچل میں چمکتے ہوں یا گرہن لگے، چاند سمیٹ ہی لیتی ہے۔

گھر گھر جا کر دریاں منتیں کر کے بیچتی اور سوچتی کہ ساری بیبیاں ایک طرح کی کیوں نہیں ہوتیں؟ گلی کوچوں کی خاک چھانتی مائی طرح طرح کی باتیں سنتی۔ مائی جولاہی، جھلی، کملی، سوکھا وان، نمانی کئی ناموں سے مخاطب کی جاتی۔ مگر مائی جولاہی تو جیسے بہری ہو چکی تھی۔ اسے تو بس اتنا پتا تھا کہ دریاں بیچنا اور پڑیاں خریدنا ہیں۔

وہ اکثر یہ خواب دیکھتی اور کبھی خواب دکھایا جاتا کہ گھوڑے پر سوار کوئی شہزادہ آئے گا جو

پلک جھپکنے میں اس کے بھولے کو بھلا چنگا کر دے گا پھر اپنی جادوئی چھڑی گھمائے گا اور ساری پڑیاں یک دم غائب ہو جائیں گی۔ اس کے کمزور ہاتھوں کی بنی مزین دریاں ہر ڈرائینگ روم کی زینت بنیں گی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس سپنے کی تعبیر ناممکنات جیسی بن چکی ہے پھر بھی سارا دن وہ اپنے خواب کو خود ہی سچ کرنے کے عمل میں جٹی رہتی۔ اس کی خودداری اور اپنی انگلیوں پر مان برقرار تھا ورنہ پیٹ کا تنور بھرنے کو ہتھیلی پھیلانا کونسا مشکل تھا۔

عاصمہ ریفریشر کورس پر لاہور گئی ہوئی تھی۔ کئی دنوں بعد لوٹی تو پھر اپنی نوکری اور گھر بار کی مصروفیت میں گم رہی چند ایک بار دل میں خیال آیا کہ مائی کا پتا کرے لیکن خیال خیال ہی رہا۔ کئی مہینوں بعد مائی اس کے گھر آئی۔ تھکی ماندی مضمحل اور کمزور، ایسا لگ رہا تھا کہ روئی کی پونی کی بجائے کسی نے مائی کا وجود تکلے کی سوئی میں پرو ڈالا ہے۔ سمندر جیسی ڈونگھی آنکھوں کے گرد کالی ریت کی لکیریں زمانوں کے تھکا دینے والے سفر کا احوال بیان کر رہی تھیں۔ جھریوں کی چادر اوڑھے کالی جلد کی سلوٹیں جسم کا لباس بنی تھیں۔

عاصمہ اس کی یہ حالت دیکھ کر افسردگی سی پوچھنے لگی! مائی یہ کیا حالت بنالی؟ اور اب تیرے بھولے کا کیا حال ہے؟

بس بی بی جی کیا بتاؤں اب تو اس کا ہاتھ پانی بھی میں خود کرتی ہوں نامراد پڑی پینے جوگا بھی نہیں رہ گیا۔ منجی سے جا لگا ہے۔ صغریٰ نے ایک آہ بھری سمندر میں گرداب اٹھا اور پاتال میں اتر گیا۔

یہ لو کچھ پیسے رکھ لو عاصمہ نے چند نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

نہ بی بی جی پیسے رین دیں۔ پڑی تو مل رہی پر لے کر کیا کرنی۔ آٹا کسی چکی ہٹی میں نہیں مل رہا۔ آپ تو سارے سال جوگی کنک اکٹھی لے کر رکھتی ہیں جی، بس اپنی ڈرمی سے تھوڑا آٹا ڈال دیو۔

یہ کہتے ہوئے مائی کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور حسرت بھری نظریں انگلیوں کے گٹھوں پر جمی تھیں۔

عاصمہ نے آٹا ڈال کر ساتھ کر دیا اور چلتے چلتے زبردستی چند روپے بھی مٹھی میں تھما دیے۔

انہی دنوں عاصمہ کو کسی دوسرے شہر ٹرانسفر ہو کر جانا پڑا۔ واپس فیصل آباد تبادلے کے لیے تین چار مہینے کتنے ہی پاپڑ بیلے اور دفتروں کی خاک چھانی تب جا کر دوسرے گرلز کالج میں پوسٹنگ ہوئی۔ اسی جھنجھٹ میں کئی مہینوں تک مائی کی کوئی خبر نہ لے سکی۔ ایک دن گوالے سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ مائی جولاہی کا بھولا چل بسا تھا۔ اس نے دل میں ارادہ کیا کہ خود جا کر مائی جولاہی سے تعزیت کرے گی۔

اگلے ہی روز شام کے وقت اس کے بچوں نے باہر کھانے اور گھومنے کا پروگرام بنایا۔ اس کے میاں انہیں ایک بالکل نئے تعمیر ہوئے کینال پارک ریسٹورنٹ میں لے آئے۔ کھانے کے بعد بچے ادھر ادھر کھیلنے لگے۔ عاصمہ کے دل کو ہُڑک لگی ہوئی تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ ریسٹورنٹ جھگی کے قریب ہی بنا تھا۔ اسی تلاش میں وہ نہر کے ساتھ ساتھ چلتی کافی آگے نکل گئی۔ پرانی راج باہ کے ساتھ جولاہوں کی جھگی کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا تھا۔ کھڈی کے لیے کھودی جگہ برابر تھی جس پر تازہ گھاس اگا دی گئی تھی مختلف کیاروں میں موسمی پھول اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ نہر کنارے ساری گرین بیلٹ دیکھنے والوں کو بہت خوب صورت نظارہ دے رہی تھی۔ جہاں کبھی جھگی ہوا کرتی تھی اس جگہ کسی ریسٹورنٹ کے مونوگرام والا سیمنٹ کا بنچ نصب تھا۔ عاصمہ نے حیران ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی عینک اتار کر شیشے فلالین کے نرم رومال سے صاف کیے پھر دوبارہ عینک لگا کر گہری نظر سے ادھر ادھر دیکھا اور لڑکھڑا کر بنچ پر بیٹھ گئی۔

وے سائیں تیرے چرخے نے
اج کت لیا کتن والی نوں

☆☆☆☆

ڈیپارچر لاؤنج

نعیم بیگ (لاہور، پاکستان)

ایک ہاتھ میں اعلیٰ چمڑے کا براؤن بیگ' دُوسرے میں پاسپورٹ اَور دیگر سفری کاغذات تھامے' ڈاکٹر بدرالدین ہادی قدرے پھولی سانس کے ساتھ طویل وعریض بزنس کلاس ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ اُس نے اپنی نشست کے لیے کوئی مناسب جگہ منتخب کرنے کی خاطر ایک طائرانہ نظر پورے لاؤنج پر ڈالی اَور پھر زیرلب مسکرا کر لاؤنج کے اُس کونے میں جا بیٹھا جہاں سے قدآور شیشوں کے پار ایئرپورٹ سے باہر کا حصہ مکمل نظر آرہا تھا۔ صبح صادق کی سپیدی کے باوجود' ایئرپورٹ کی روشنیاں ابھی تک جگمگا رہی تھیں۔ کئی ایک ایئرلائنز کے جہاز' قطار اَندر قطار' اپنے اپنے جیٹ وے سے جڑے' مسافروں کو اُتار رہے تھے۔ یہ منظر اُس کا ہمیشہ سے پسندیدہ رہا تھا۔ اُس نے زِندگی کو بھی جیٹ وے ہی کی طرح سمجھا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ لاکھوں لوگ صبح شام اِن جہازوں کی نسبت سے آسمانوں کی وسعتوں میں کھو جاتے ہیں اَور پھر کسی نئے سفر کا آغاز کرنے کے لیے واپس زمین پر اُتر آتے ہیں۔

سکول ٹیچر کی حیثیت سے اُس نے زِندگی کا آغاز کرتے ہوئے کمپیوٹر پر مہارت حاصل کی اَور پھر رفتہ رفتہ خطابت کا شوق اُسے ملکی اَور عالمی منظر نامے پر لے آیا۔ لندن سے ڈاکٹریٹ کی ڈِگری حاصل کرنے کے بعد اَب وہ عُمر کے چالیسویں سال ہی میں کئی ایک کتابوں کا مصنف تھا اَور پورے عالم میں مذہبی سکالر اَور پُرجوش خطیب مشہور ہو چکا تھا۔ لوگ اُس کے اَبرو کی جنبش پر اپنی جان چھڑکتے تھے۔ زِندگی سے بھرپور اُس کی شخصیت اَور اُس کا

مزاج، مذہب کی علامت اَور انسانی جبلتوں کا حسین امتزاج لیے ہوئے تھا۔اولوالعزم ہونا اُس کا خواب تھا اَور بلندی اُس خواب کی تعبیر!

جونہی وہ نپے تلے قدموں سے اپنی منتخب نشست پر آ کر بیٹھا، کئی ایک مسافروں کے چہروں پر شناسائی کے تاثرات ابھرے جنھیں اُس نے کمال بے اعتنائی سے نظر اَنداز کر دیا۔ اُس نے اپنے سفری کاغذات چرمی بیگ میں ڈالے، بیگ نشست پر ایک طرف رکھا، اُونی سیاہ کوٹ کی جیب میں سے چمک دار موبائل فون نکالا اَور چند ساعتوں تک اُس پر اپنی انگلیاں پھیرتا رہا، اور اُسے پھر جیب میں رکھنے کے بعد بیگ میں سے اپنا جدید ٹیبلٹ نکال کر، کچھ دیر اُس پر کام کرتا رہا اَور پھر بند کر کے اُسے واپس بیگ میں رکھ دیا۔اُس کے جہاز کی اُڑان میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے باہر کی جانب دیکھنے لگا جہاں ایک بڑی ایئر لائن کا جہاز ٹیکسی کرتا ہوا اپنی اُڑان بھرنے کے لیے رن وے کی طرف نکل رہا تھا......ایک اَور نئے سفر کا آغاز......اُس نے ایک گہری سانس لی اَور پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنی آنکھیں موند لیں۔

....

دیکھو وے بدرو، تیرے باوا کو کیا ہوا ہے!

''وہ جونہی گھر پہنچا، اُس کی ماں نے ایک ہانک ماری۔

''اچھا ماں......دیکھتا ہوں، سانس تو لینے دو!

''اُس نے تلملا کر ماں کو جواب دیا۔

''جون کے مہینے میں چلچلاتی دُھوپ اَور لو میں نصف گھنٹے کا پیدل سفر، سکول کے بچوں کے ساتھ دِن بھر کی مغز کھپائی سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتا جسے وہ اکثر یہ سوچ کر سہہ جاتا کہ اُسے یہاں رکنا نہیں تھا۔اُسے یقین تھا کہ اُس کی منزل آسمانوں میں، دُور کہیں ستاروں کے درمیان ہے!

اُس نے اپنے باپ کے ماتھے کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو وہ بخار کی تپش میں جل رہا تھا۔

''ماں! باوا کو تو بہت تیز بخار ہے! اِسے کچھ کھانے کو دیا تم نے؟

''نہیں بدرو، صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے اِس نے......بس ایک خون کی اُلٹی کی تھی؛ جب

سے یونہی بےسدھ پڑا ہے!

اچھا دیکھتا ہوں۔شاید بڑے رام جی کوئی اُور دوا دے دیں!

یہ سوچ کر وہ باہر نکل آیا۔ بڑے رام جی قصبے کے واحد حکیم تھے' جنھیں باپ کا سارا اَحوال سنا کر اُس نے نئی دوا لے لی۔ چلنے لگا تو رام جی نے کہا:

سن بدرو! تمھارے باوا کی زِندگی اب زیادہ نہیں۔معدے کا زخم پھٹ چکا ہے۔زہر پھیل کر کبھی بھی اُس کی جان لے سکتا ہے۔تم چاہو تو اُسے شہر لے جاؤ لیکن وہاں بھی اَب علاج نہ ہو پائے گا۔تم لوگوں نے دیر کر دی ہے!

رام چاچا' ہم کیا کرتے...... تبھی کہو' باوا کبھی شہر جانے پر راضی ہوئے کیا...... جب بھی کہا' اُنھوں نے اِنکار کر دیا!

اِتنا کہہ کر وہ لاپروائی سے واپس چلا آیا۔

گھر جاتے ہوئے اُس نے باوا کے بارے میں سوچا۔کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک شخص کسی عورت کے عشق میں کئی دہائیاں گزار دے اُور زخموں بھرے معدے کو لیے موت تک پہنچ جائے...... کیا سبھی حساس اِنسانوں کو زندہ رہنے کے لیے اُداس اُور غم زدہ رہنا پڑتا ہے...... کیا زندگی میں خوش رہنے کے لیے بےحسی ضروری ہے!

شش...... بدرو!

ایک مہین سی نسوانی آواز نے اُسے پکارا۔ اُس نے مڑ کر چاروں طرف دیکھا، گلی سنسان تھی۔آواز حویلی کی اَدھ کھلی کھڑکی میں سے آئی تھی۔وہ جانتا تھا کہ وہ ماجو ہے...... اُس کی بچپن کی ساتھی...... مہ جبیں...... چودھری صاحب کی سب سے بڑی بیٹی۔اُس نے سنی اَن سنی کر دی؛ مگر وہ حویلی کے صدر دروازے تک پہنچا تو ماجو دروازے کی اوٹ میں آن کھڑی ہوئی۔اُس کی آنکھیں نمناک تھیں۔وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن بدرو کے قدم رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔مگر ماجو نے تیزی سے آگے بڑھ کر کپکپاتے ہاتھوں سے بدرو کو تہ کیا ہوا ایک کاغذ تھما دیا۔

ایک اُور محبت نامہ...... یہ سوچ کر اُس نے وہ کاغذ جیب میں رکھا اُور مزید تیزی سے چلنے لگا۔اچانک اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ماجو ابھی تک دروازے میں کھڑی تھی۔اُسے جھلملاتی

چمک دار، روشن آنکھیں جھیل میں تیرتے اُس پھول کی طرح لگیں جو رفتہ رفتہ پانی کی غیر محسوس لہروں پر ہچکولے کھاتا ساحل سے دُور ہو جاتا ہے۔ وہ ماجو کو دِل سے چاہتا تھا لیکن اِس سے پہلے وہ خود آسمانوں پر جگمگاتے چمک دار ستاروں کی کہکشاں کا حصہ بننا چاہتا تھا...... ماجو اُس کی دُوسری ترجیح تھی۔

وہ گھر کے سامنے پہنچا تو ایک شور بپا تھا۔ اُس کی ماں بین کر رہی تھی۔ آس پاس کی عورتیں جمع تھیں۔ جونہی وہ اَندر داخل ہوا اُس کی ماں نے اُس کا بازو پکڑ کر ایک زوردار چیخ ماری اَور اُس کی بانہوں میں جھول گئی۔

باپ کو دفن کرنے کے بعد اُس کے پاس قصبے میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ''سوتیلی ماں تو سوتیلی ہوتی ہے نا!'' ایک دفعہ کسی دوست نے سکول میں کہا تھا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ لیکن گریجویشن کے بعد قریبی گاؤں کے سکول میں جب اُس کی تعیناتی اُستاد کے طور پر ہوئی تو اُس میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ وہ اِنسان دوست تھا لیکن اِس سے پہلے خود پسند۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ کسی اَور دُنیا کے لیے بنا تھا؛ لیکن غلطی سے صدرالدین کے ہاں پیدا ہو گیا تھا۔

....

ڈیپارچر لاؤنج میں ایک ہلکی سی مترنم آواز کی گونج نے اُسے ایک جھٹکے سے ہلا دیا۔ تازہ اعلان کے مطابق اُس کی فلائٹ تاخیر کا شکار ہو چکی تھی۔ بدرالدین کا وقت پر لندن پہنچنا بہت ضروری تھا۔ اُسے شام سات بجے برٹش ہال ویسٹ منسٹر ایبے میں ''عالمی مذاہب وسیاسیات'' پر لیکچر دینا تھا۔ فلائٹ میں تاخیر کی خبر اُس پر بجلی بن کر گری۔ اُس کے ماتھے پر کئی ایک بل نمودار ہو گئے۔ وہ گزشتہ ایک ہفتے سے کئی ایک اہم سماجی اَور مذہبی سیمیناروں میں شرکت کی وجہ سے دبئی میں مقیم تھا اَور مجوزہ فلائٹ کے حساب سے اُسے آج دو بجے دوپہر تک لندن میں ہونا تھا۔ اُس نے فوراً اپنا ٹیبلٹ نکالا اَور متعلقہ انتظامیہ کو ضروری اطلاعات پہنچانے لگا۔ پھر اُس نے اپنی قریبی دوست عروج سے بات کی جو یونیورسٹی آف ڈیٹرایٹ مشی گن میں ادب پڑھاتی تھی۔ کل شام ہی اُس نے اُسے تفصیلی ای میل کے ذریعے پاکستان میں اپنے طویل قیام اَور مذہبی وسماجی نقطۂ نظر پر روشنی ڈالی تھی۔ وہ خود کو اِنسانیت پرست اَور گلوبلائزیشن کا حامی سمجھتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ انسان آفاقی

نظریات کے ساتھ پیدا ہوا تھا' اِس لیے اِس کی جبلت عالمی اور آفاقی نظریات کی پرچارک ہے۔ وہ کسی ثقافتی' لسانی اَور سماجی تقسیم کا قائل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے سائنس کی بنیاد پر سکڑتی دُنیا بہت پسند تھی۔ وہ اُس دِن کے اِنتظار میں تھا جب پوری دُنیا میں شہریت کا تصوّر ختم ہو جائے گا اور ہر انسان اپنے اولین حق کو نہ صرف پہچان جائے گا بلکہ اُسے حاصل بھی کر لے گا۔ اُس کی خواہش تھی کہ عالمی طور پر سب انسانی اَقدار مشترک ہوں اَور مذہب' ذاتی معاملے کی حد تک ہو اَور بس!

ہیومن اِزم سوچ کے ساتھ' وہ اپنی زِندگی کو اِنتہائی مصروف دائرے کے اندر رکھے ہوئے تھا۔ اُس نے مستقل سکونت امریکہ میں اختیار کر رکھی تھی۔ وہ اکثر اپنے ملک بھی جاتا رہتا تھا۔ برسوں بعد اُسے خبر ملی تھی کہ ماجو کی شادی وہیں کسی جاگیردار سے ہوگئی تھی۔ ماجو کا آخری خط اَب بھی اُس کے پاس تھا جس میں اُس نے بدُرو کو اپنی منگنی کی اطلاع دی تھی اَور اُسے اپنی محبت کا واسطہ بھی دیا تھا؛ مگر وہ تو بہت اُونچی اُڑان میں تھا۔ اپنی ماں اَور سوتیلی بہن عصو کی طرف سے بھی وہ بےفکر ہو چکا تھا کیونکہ اُن کے رہنے کے لیے اُس نے معقول بندوبست کر دیا ہوا تھا اَور اُن کے اخراجات کے لیے وہ معقول رقم بھجواتا رہتا تھا۔ اُس کی سالانہ آمدنی کا ایک بڑا حصہ اُس عالمی رفاعی ادارے کو جاتا جو اُس کے خطابات کو پوری دنیا میں پھیلانے پر مامور تھا۔ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ چکا تھا اَور کامیابیاں اُس کے قدم چھو رہی تھی؛ مگر پھر بھی اُسے کچھ کچھ احساس ہونے لگا تھا کہ سب کچھ حاصل کرنے کے باوجود زِندگی میں کچھ کمی ضرور رہ گئی ہے۔ تنہائی اپنی جگہ لیکن اُسے یوں لگتا کہ اَندر سے وہ خالی ہوتا جا رہا ہے۔ عروج نے اُسے کئی بار گھر بسانے کا مشورہ دیا لیکن اُسے شادی میں کوئی نیا پن نظر نہیں آتا تھا۔

اَب کچھ دِنوں سے ڈاکٹر ہادی کو اپنی طبیعت میں زود رنجی' اِضطراب' جھنجلاہٹ' غصے اَور ہائپرٹینشن کا احساس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ چونکہ وہ خود ہر کام انتہائی نفاست سے بروقت کرنے کا عادی تھا' لہٰذا اُسے کسی بھی تاخیر یا معمولی خرابی سے نفرت تھی۔ مغربی دُنیا میں رہتے ہوئے درحقیقت وہ خود کو پرفیکشنسٹ تصوّر کرنے لگا تھا۔

سپیکر پر پھر ایک اعلان اُبھرا کہ لندن کی پرواز مزید ایک گھنٹے کی تاخیر سے روانہ ہوگی۔

اُف میرے خدایا...... یہ سب کیا ہے!

جھنجلاہٹ سے اُس کے چہرے پر تناؤ کے تاثرات اُبھر آئے۔ اُس نے جھٹ سے اپنے سیاہ موبائل کی سکرین روشن کی اَور اُس کی اُنگلیاں تیزی سے سکرین پر گھومنے لگیں۔ کچھ ہی دیر میں عروج کی تصویر سکرین پر اُبھری:

بدر، تمھارے چہرے پر اِتنا تناؤ کیوں ہے!

اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

کچھ نہ پوچھو...... میں تو اِس ایئر لائن پر سفر کرنے سے ہمیشہ کتراتا تھا۔ بس اِس دفعہ ویسٹ منسٹر ایبے والوں کی بات مان لی۔ لگتا ہے، آج شام کا لیکچر تو گیا!

تو کیا ہوا...... یہ لیکچر دوبارہ بھی ہوسکتا ہے۔ تم اتنی ٹینشن مت لو ڈارلنگ!

عروج نے کمال محبت سے اُسے چھیڑا۔

یہ مذاق کا وقت نہیں، عروج پلیز! میرے لیے آج کا یہ خطاب بہت اَہم ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے کئی ایک ممبر اِس میں مدعو ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ قریب سے اُٹھ کر وزیرِاعظم بھی آجائیں۔ میں اس لیکچر کو مس نہیں کرسکتا۔ مجھے ہر حال میں وہاں پہنچنا ہے۔

تو اِنتظار کرو، شاید فلائٹ نکل جائے۔ تمہارے پاس ابھی بہت وقت ہے!

تم نہیں سمجھو گی، میرے پاس وقت نہیں۔ اگر یہ ڈیپارچر بروقت نہ ہوا تو میں ہمیشہ کے لیے محروم ہوسکتا ہوں......

اُس نے سنجیدگی سے کہا:

اچھا ایک کام کرو......تم اپنی یونیورسٹی سے ایئر لائن کو ایک ای میل کرو کہ میں یہاں ڈیپارچر لاؤنج میں لیٹ ہو رہا ہوں، وہ مجھے اٹینڈ کریں۔ یہی بات میں یہاں سے ویسٹ منسٹر ایبے والوں کو ٹیکسٹ کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ایئر لائن والوں کو معلوم ہی نہ ہو کہ ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ مسافر بھی یہاں موجود ہے۔

تم فون بند کرو، میں دیکھتی ہوں! عروج نے جواب سنے بغیر ہی رابطہ ختم کردیا۔ سکرین دوبارہ ہوم پیج پر آگئی۔ ڈاکٹر ہادی نے لندن پیغام بھیجا اَور نشست پر ٹیک لگا کر گہرا سانس لیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے بائیں بازو اَور سینے میں کچھ تناؤ سا ہے۔ اُس کی طبیعت متلا رہی تھی۔

اُس نے پاس سے گزرتے ہوئے لاؤنج کے ویٹر کو ہاتھ سے اِشارہ کیا اَور اُسے پانی اَور کافی لانے کو کہا۔

آج نجانے اُسے باوا کیوں یاد آرہے تھے..... ماجو اماں اَور عصو کی آوازیں بھی آرہی تھیں ۔نہر کے کنارے دُور تک پھیلا گاؤں اُس کی ایک ایک پگڈنڈی اَور لہلہاتے سنہری کھیت سب کچھ اُس کے سامنے تھا۔ ماضی جسے وہ کئی ایک سالوں سے بھول چکا تھا' آج اُس کے ذہن کی سکرین پر اُسی طرح روشن تھا جیسے فون کی سکرین پر عروج۔ اُسے یوں لگا کہ وہ کہیں دُور بہت آگے آ چکا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔'' گاؤں' باوا' ڈیپارچر لاؤنج''...... یہ الفاظ اُس کے ذہن میں گڈ مڈ ہورہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دیکھا کہ سامنے سے دو۲ باوردی شخص اُس کی طرف بڑھتے چلے آرہے تھے۔قریب پہنچ کر اُنھوں نے شستہ انگریزی میں اُسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا:

ڈاکٹر بدرالدین ہادی؟

اُس نے اِثبات میں سر ہلایا تو اُنھوں نے فلائٹ میں تاخیر کی معذرت کی ۔ اِس کے ساتھ ہی اُنھوں نے اُسے ریستوران میں مدعو کیا۔ اُس نے بظاہر اُن کی معذرت خوش دِلی سے قبول کر لی لیکن اُنھیں نہایت شائستگی سے بتایا کہ:

آج میری زِندگی کا اَہم ترین دِن ہے اَور اگر میں نے یہ موقع کھو دیا تو کئی ایک دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔

ابھی وہ اُن سے بات کر ہی رہا تھا کہ قریب پڑا فون روشن ہو گیا۔ ڈیٹریاٹ سے عروج کی کال تھی ۔ڈاکٹر ہادی نے اُن سے معذرت کرتے ہوئے کال لے لی:

ہاں عروج، شکریہ! ایرلائن کے لوگ میرے پاس آ چکے ہیں اور معذرت کر رہے ہیں۔ تم ذرا ہولڈ کرو!

وہ اُن کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا تو ایک آفیسر بولا:

رِسپیکٹڈ ڈاکٹر ہادی...... دراصل ہم آپ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ بدقسمتی سے آپ کی فلائٹ تین ۳ گھنٹوں کی مزید تاخیر کا شکار ہو چکی ہے جس کا اعلان ہونے والا ہے۔ ہمیں آپ کی

خدمت پر مامور کر دیا گیا ہے۔ آپ ریستوران میں ہمارے مہمان ہیں۔

یہ سنتے ہی اُس کا چہرہ فق ہو گیا اَور اُسے غصے کی ایک شدید لہر نے جکڑ لیا۔ وہ قدرے اُونچی آواز میں بولا:

آئی کانٹ مس دِس لیکچر...... کیا آپ نہیں جانتے...... آئی نیڈ ٹو بی اِن لنڈن ایٹ فور او کلاک ناؤ...... دیٹس اِٹ!

سوری سر......

دونوں افسروں نے اُس کے غصے بھرے لہجے کے باوجود اپنے آپ پر قابو پائے رکھا:

سر، یہ تیکنیکی مسئلہ ہے...... ہم اِس میں بے بس ہیں...... وی کانٹ ڈو اینی تھنگ!

یہ کہہ کر وہ دونوں واپس چل پڑے۔ اُنھیں یوں جاتے دیکھ کر اُس کا غصہ اِنتہا کو پہنچ گیا: یو کانٹ گو بیک لائک دِس...... لسن ٹو می...... آئی ایم ڈائنگ...... آئی کانٹ مس دِس لیکچر!

اُس نے ہسٹیریائی کیفیت میں چیختے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ اُن کی طرف بلند کیا ہی تھا کہ سینے میں یک دم درد کی ٹیس اُٹھی، جس نے پورے جسم کو لمحہ بھر میں مفلوج کر دیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا، دِل اچھل کر حلق میں آ گیا اَور سانس اکھڑنے لگی۔ اُس کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک گھپ اندھیری سرنگ میں داخل ہو رہا ہے۔ اُس نے نہایت بے بسی کے عالم میں ساتھ پڑے فون کی طرف دیکھا جس پر عروج اُونچی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے فون اُٹھایا اَور بولا:

آئی کانٹ مس اِٹ، عروج ڈارلنگ...... آئی کانٹ مس اِٹ!

اُس کی آواز ڈوبتی گئی...... اُس نے عروج کو پہلی دفعہ ڈارلنگ کہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں اَور درد کی شدید لہر تیزی سے اُس کے پورے جسم سے نکل کر ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی اَور ڈیپارچر لاؤنج میں صوفے پر ٹیک لگائے ڈاکٹر ہادی جگمگ کرتے روشن موبائل کو تھامے کسی نئے سفر پر روانہ ہو چکا تھا!

☆☆☆☆

ڈولی

پیغام آفاقی (دہلی، انڈیا)

دو ڈھائی سال پہلے میں ایک سرکاری کام کے سلسلے میں چمپارن، بہار گیا تو مجھے خیال آیا کہ وہیں آس پاس میں کہیں میرے طالب علمی کے زمانے کا ایک دیرینہ دوست کا گھر تھا جو بہار پبلک سروس سے اب ریٹائر ہوکر اپنے گاؤں میں ہی رہتے تھے—ان کا فون نمبر میرے موبائل میں موجود تھا— میں نے فون کیا اور بات ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ ان کا گھر وہاں سے کوئی ساٹھ کیلو میٹر پر تھا— دلی شہر میں تیس برس رہنے کے دوران ان کے علاقے میں جانے کی خواہش مجھے اکثر ہوئی تھی کیونکہ میرے اندازے کے مطابق وہ ایسی دور دراز کی جگہ تھی جہاں آج بھی پچھلے زمانوں کا ماحول موجود تھا اور میں وہاں کی زندگی کو دیکھنا چاہتا تھا۔

دوسرے دن کام ختم ہونے کے بعد میں ایک ٹیکسی لے کر چل پڑا اور ہری بھری کھیتیوں کے بعد جنگلوں سے گزرتا ہوا ایک کھلی وادی میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ان کا گاؤں وہیں کچھ دور آگے سڑک کے کنارے ہے—جب دور سے ایک مسجد نظر آئی تو ان کے بتانے کے مطابق میں سمجھ گیا کہ یہی ان کا گاؤں ہے— مسجد سے آگے جا کر ایک طرف کافی کھلی جگہ کے بعد ایک پرانے طرز کی کوٹھی سی نظر آئی جس کا صف کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا اور اس کے احاطے میں نئے طرز کے چند مکان بن گئے تھے— میں نے وہاں گاڑی رکوائی تو دیکھا کہ بشیر عالم وہیں دکانوں کے سامنے میرے ہی انتظار میں ہی کھڑے تھے— ان پر نظر پڑتے ہی جیسے پینتیس سال پرانی دوستی کے جذبے نے میری رگ رگ میں ایک عجیب سی شادمانی کی لہر دوڑا دی— وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے گھر میں

لے گئے — ان کے ہاتھوں کے لمس نے چند لمحوں میں وقت کی دیوار چین کو نیست و نابود کر دیا۔ ان کے اس سرگرم استقبال کے بعد جب ہم ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے پرانی باتوں میں محو تھے مجھے دیوار پر ایک بڑی سی تصویر آویزاں نظر آئی۔

تصویر کے نیچے لکھا تھا: 1911 تا 2011

لیکن اس میں کسی آدمی کی تصویر نہیں تھی بلکہ تصویر میں ایک جنازہ تھا جسے لوگ اٹھائے ہوئے سڑک پر جا رہے تھے — میری نظر اس تصویر پر ٹک گئی تو بشیر عالم بولتے بولتے خاموش ہو گئے اور خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے اور ایک قلم کو بغل کی تپائی سے اٹھا کر یوں ہی اس کے ڈھکن کو کھولتے اور بند کرتے رہے۔

میں نے پوچھا "یہ کیا ہے'

"یہ میری ماں کے جنازے کی تصویر ہے'

بات کچھ عجیب سی تھی۔

'اس تصویر کو دیکھ کر مجھے کچھ محسوس ہو رہا ہے لیکن کیا محسوس کر رہا ہوں یہ میں خود نہیں سمجھ پا رہا ہوں — اسے لگانے کی تو ضرور ہی کوئی خاص وجہ ہوگی — کیونکہ کسی ڈرائنگ روم میں جنازے کے تصویر میں پہلی بار ہی دیکھ رہا ہوں'

'اس کی کچھ خاص وجہ تو ہے۔ تبھی تو لگی ہوئی ہے۔' انہوں نے قلم کا ڈھکن بند کر کے اسے واپس تپائی پر رکھ دیا۔' میری ماں اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اس کوٹھی کے سامنے برآمدے میں اکثر بیٹھا کرتی تھیں۔ بالکل آخری دنوں میں ایک دن جب گاؤں کی ایک خاتون کا جنازہ جانے والا تھا تو جنازہ لے جانے کا وقت معلوم کر کے بطور خاص باہر آ کر بیٹھ گئیں اور جہاں سے بائیں جانب سے جنازہ سڑک پر نمودار ہوا وہاں سے اسے سڑک پر گزرتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ دوسرے جوان کے آس پاس بیٹھے تھے ان کو اس طرح جنازے کو دیکھتے ہوئے دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ سب کو یہی خیال آیا تھا کہ وہ اب عمر کی جس منزل کو پہنچ گئی تھیں اس کے بعد ان کے دماغ میں شاید اب یہی خیال بار بار آتا ہوگا۔

اسی دوران انہوں نے کہا — "میں بھی اسی طرح جاؤں گی۔'

اس کے کچھ ہی دنوں بعد ان کا انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ہمیں وہ منظر ہمارے ذہن میں گھومنے لگا اور ہمیں محسوس ہوا کہ ان کے لئے یہ منظر بہت خاص تھا— میں نے ایک لڑکے کو ہدایت دی کہ وہ اس وقت جب ان کا جنازہ مسجد کے سامنے سے اٹھنے کے بعد وہاں سامنے سڑک سے گزر رہا ہو تو وہ یہیں برآمدے میں کھڑے ہو کر اس کی تصویر لے لے۔ یہ وہی تصویر ہے۔ اب جو آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ تصویر کے نیچے سو برسوں کے وقفے کے سال لکھے ہوئے ہیں تو یہ ان کی پیدائش اور انتقال کے سال ہیں۔ عام طور پر لوگ مرنے کے قریب آنے پر مذہبی باتوں پر زیادہ دھیان دیتے ہیں یا پھر اپنے خاندان و جائداد کے متعلق وصیت وغیرہ کرتے ہیں لیکن وہ تو جیسے اپنے متعلق سارے انتظام اپنے ہاتھوں سے کئے جا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی قبر پر لگانے کے لئے خود ایک کتبہ بنوا کر منگایا تھا اور یہ ہدایت کی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی قبر پر وہ کتبہ لگا دیا جائے جس پر انہوں نے اور کچھ نہیں لکھوایا بلکہ سنگتراش سے اپنا نام لکھنے کو بھی منع کر دیا۔ اس پر انہوں نے صرف اپنی پیدائش کا سال کھدوا دیا تھا اور وفات کے سال کے دو ہندسے بھی کھدوا دئے تھے۔ وہ اس بارے میں اتنی سنجیدہ تھیں کہ سب دیکھنے والے چپ رہے۔ ان کی قبر پر یہی کتبہ لگا ہوا ہے۔'

بشیر عالم اتنا بتانے کے بعد اچانک گہرے خیالوں میں کھو گئے۔ میں نے ان کو بالکل نہیں چھیڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آگے کہنے لگے۔

زندگی میں تو کبھی ہم نے ان کی طرف اتنا دھیان نہیں دیا لیکن ان کی شخصیت نے ان کی وفات کے بعد ہم لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

یہ کہہ کر بشیر عالم خاموش ہو گئے اور سر نیچا کر کے کچھ سوچنے لگے۔ میں ان سے اس بارے میں مزید سننے کے لئے ان کو دیکھنے لگا۔

شاید یہ تصویر اس لئے لگائی گئی ہے کہ ہر وقت یہ یاد رہے کہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہے۔

یہ تو ایک ایسی بات ہے جو عام طور سے لوگ کہتے ہی رہتے ہیں اور یاد بھی رہتی ہے لیکن اس تصویر سے ایک بہت بڑا ذہنی جھٹکا جڑا ہوا ہے جس نے ہم لوگوں کی پوری زندگی بدل دی اور ہم آج بھی اس کے اثر سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ آسمان سے ایک بجلی گری تھی۔

میں بالکل دم سادھے خاموشی سے ان کو سننے لگا۔ اور انہوں نے پوری بات بتائی

شروع کی جو 1911 تا 2011 کی ایک طویل تفسیر تھی۔

کتبے پر لکھا تھا: 'نورالنساء۔ 1911 تا 2011' یہ مرنے والی کی وصیت کے مطابق لکھا گیا۔ انگریزی کا سن بھی ان کی مرضی کی وجہ سے ہی لکھا گیا تھا۔ نہ جانے ان کے دل میں کیا تھا ورنہ اس گئوں کے قبرستان میں کسی قبر پر اس طرح کا کچھ لکھنے کا رواج نہیں تھا— شاید وہ صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ سوسال زندہ رہیں۔ شاید یہ کہ انہوں نے دنیا کو سوسال تک دیکھا۔ شاید یہ کہ وہ وقت کا ایک ایسا ٹکڑا تھیں جس کی لمبائی سوسال کی تھی۔ شاید وہ اس سے اپنے عہد کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا چاہتی تھیں اور یہ سمجھ رہی تھیں کہ یہ سن ان کی زندگی کی پوری تاریخ اور ان کی سوانح کو بغیر ایک لفظ کی مدد کے بیان کرنے کے لئے کافی تھا۔

کیا وہ اتنا سوچتی تھیں؟ یہ اندازہ کسی کو بھی نہیں تھا کہ وہ کتنا سوچتی تھیں— لیکن ان کی زندگی کے آخری برسوں میں سب کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ انہوں نے زندگی اور دنیا کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ انہوں نے گاؤں کے ایک پرانے مکان کے آنگن اور گھر میں اپنی پوری زندگی گزاری تھی لیکن ان کے بچے اس دن چونکے تھے جب انہیں اندازہ ہوا کہ وہ انگریزی کے ہزاروں الفاظ سمجھ سکتی تھیں۔ یہ کسی کو اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو ایک دن اتفاق سے پوچھ لیا کہ کنڈیشن کا معنی سمجھتی ہیں تو جواب دینے کی بجائے بولیں کہ تم لوگ کیا سمجھتے ہو، تو بچوں نے دس پندرہ اور الفاظ کے معنی پوچھے— پٹیشن، انٹری، بیک گراؤنڈ، روٹیشن، ٹرمینیٹ، اور ان جیسے لگ بھگ بیس تیس الفاظ کے معنی جب وہ بتا گئیں پھر سبھی چونکے اور ہنسنے لگے— انہوں نے مسکرا کر بچوں جن میں ایک انگریزی کے پروفیسر تھے اور ایک کلکٹر رہ کر ریٹائر ہوئے تھے اور ایک ہائی کورٹ میں وکیل تھے ایسے دیکھا جیسے وہ اپنی حماقت کی وجہ سے ان کو بدھو سمجھ رہے تھے۔

تم لوگ میری گود میں پلے ہو۔ اور تب سے تم لوگوں کی آوازیں سن رہی ہوں۔

ان کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں اور سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ابتدائی تعلیم تو سب نے گھر سے ہی اسکول جا کر حاصل کیا ہی تھا، جب چھٹیوں میں گھر آتے تو پرانے برآمدے میں ہی دنیا بھر کی باتیں کرتے اور مسئلے مسائل پر بحثیں کرتے جس میں ان کے والد بھی اکثر شریک رہتے— انہیں آج اندازہ ہوا تھا کہ جو ہاتھ انہیں کھانا کھلاتے تھے وہ ان کی باتوں کو بھی سنتے اور ان سے

لطف اندوز ہوتے تھے۔

بچوں کی پرورش میں انہوں نے کافی پریشانیوں کا سامنا کیا تھا لیکن کسی بچے کو کبھی محسوس اس لئے نہیں ہوا تھا کہ ان کی پوری توجہ پڑھائی کی طرف مبذول کر دی گئی تھی اور گھر کے کسی بھی معاملے میں دلچسپی لینے پر سخت پابندی تھی— زمینداری ختم ہونے کے بعد کے دنوں میں اتنے بچوں کی پرورش اور تعلیم کو نبھانا پہاڑ کاٹ کر نہر لانے جیسا تھا لیکن میرے والدین کا ذہن اس بارے میں بالکل واضح تھا کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے اس لئے یہ سفر آسان ہو گیا۔ بچوں کو کہہ دیا گیا تھا کہ جب تک وہ سب کے سب پڑھ نہیں لیں گے ان کے مکان میں کوئی مزید تعمیر نہیں ہوگی، کپڑے جوتے سب تعلیم کے بعد خود بخود ہو جائیں گے۔ بس مقوی غذائیں اور صحت اور پڑھائی ہی اس وقت ضروری ہیں جن کی بعد میں بھرپائی نہیں ہو سکتی لہذا دودھ والی گائے اور بھینس مسلسل گھر میں ہوتیں باقی ہمارے کپڑے جب تک پھٹ نہیں جاتے تب تک بدلے نہیں جاتے تھے۔ جب پڑھائی کا خرچ بڑھا اور خاندانی دشمنوں کی طرف سے ان کی پڑھائی کو روکنے کے لئے جھوٹے مقدموں کا یلغار ہوا تو زمینیں گروی ہوئیں اور آمدنی سکڑتی گئی لیکن اس کے بعد ایک بیٹے کے وکیل بنتے ہی مقدموں کی تعداد اچانک کم ہونے لگی۔

اس پورے دور میں میری ماں نورالنساء نے شوہر کا بھرپور ساتھ دیا اور برسوں تک صرف ایک دو معمولی کپڑوں سے تن بدن ڈھکنے کو ہی اپنا دستور بنا لیا۔ انہوں نے اپنے سارے ارمان اپنے مستقبل کے خوابوں میں بسا لئے۔ بچے بڑے ہوں گے۔ دلہنیں آئیں گی۔ تب وہ گھر میں ملکہ ہونگیں— ایک تنکے کو بھی خود اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اپنی زندگی کے بیسوں برس انہوں نے ان خوابوں کے ساتھ گزار دئے تھے۔

اس کے بعد وہ عہد آیا تھا جب پہلی بار گھر میں ایک بیٹے کی شادی ہوئی اور دلہن آئی۔ دلہن کو کیسے سنبھالا جاتا ہے اس کی تربیت انہیں خود اپنی ساس سے ملی تھی۔ لیکن تندہی سے زندگی کی مشقتوں میں لگے رہنے کی وجہ سے انہیں کبھی یہ سوچنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ ان بیس تیس برسوں میں زمانہ بدل رہا تھا۔ بڑے بیٹے کی شادی کے چند مہینوں کے اندر بہو اپنے شوہر کے ساتھ شہر میں رہنے چلی گئی اور بیٹے کی آمدنی سے ان کی توقعات ایسے بندھی تھیں جیسے برسات کے بادلوں سے بارش کی بندھی ہوتی ہے— لیکن بیٹا اپنے باپ کو کچھ بھی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ اس کی

وجہ سے مقدموں کے اخراجات کم ہو گئے۔

میرے والد بہت سخت جان تھے۔ وہ اپنے راستے پر چلتے رہے۔ دوسرے بیٹے کی شادی کے بعد بھی وہی ہوا— ایک ایک کر کے سب کی شادیاں ہو گئیں۔

ایک ایک کر کے لڑکے پہلے پڑھنے کے لئے باہر جاتے، اس کے بعد نوکری سے لگ جاتے اور اس کے بعد ان کی شادی ہوتی اور ایک دو ماہ گھر پر رہنے کے بعد وہ اپنی دلہنوں کو لے کر چلے جاتے۔ ہم سب نے یہی کیا۔ تو کہیں نا کہیں تو کوئی خواب تھا ساس بن کر جینے کا۔ وقت کی ہواؤں نے وہ خواب تباہ کر دئے — جب تیس تیس پینتیس پینتیس سال گزارنے کے بعد سبھی دھیرے دھیرے واپس لوٹے تب تک ان کے اپنے اپنے الگ الگ گھر بن چکے تھے اور وہ سیدھے اپنے گھروں میں اتر رہے تھے۔ وہ گھر ان کے تھے اور ان کی دلہنیں ان گھروں کے کچن سے لیکر ڈرائنگ روم تک کی کرتا دھرتا تھیں۔ اب ماں کو وہاں رہنے کے لئے مہمان کی طرح بلایا جاتا اور کسی کے یہاں جانے کے بعد وہ محض ایک فرد بن کر رہ جاتی تھیں— ان کی عزت احترام، خدمت، کسی چیز میں کوئی کمی نہیں رکھی جاتی لیکن وہ واپس اپنے پرانے گھر میں جانے کا فیصلہ کر لیتیں۔

اس درمیان انہیں کچھ تلخ تجربے ہوئے تھے جن کا ہم لوگوں کو علم نہیں ہوا اور نہ ہی انہوں نے کبھی ہمیں بتایا۔ بہوؤں نے عام طور پر یہ جتایا تھا کہ انہیں صرف اپنی خدمت کا حق ہے لیکن وہ ان کے تابع نہیں تھیں اور یہ ان کا گھر تھا۔ برسوں تک اپنے اپنے گھروں کی مالکن رہنے کے بعد ساس ان کے لئے ایک الگ ذات بن چکی تھیں۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ انہیں کیسا محسوس ہوا ہوگا تو دل رونے جیسا ہو جاتا ہے۔

ماں نے بھی ٹھان لیا کہ وہ اکیلی رہیں گی۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ ساتھ رہیں گی تو کچھ نہ کچھ بولیں گی ہی اور کسی کو بھی کوئی ایسی پرچھائیں اچھی نہیں لگتی تھی جو خود بخود پرانی ساسوں کی موجودگی کا احساس دلا دیتی تھیں۔ میری ماں اتنے کھلے ذہن کی تھیں کہ ایسا کچھ بھی نہیں چاہتی تھیں— نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے تو کچھ نہیں کہا لیکن اس بات کا سب کو یقین ہو چلا تھا کہ ان کو بہوؤں اور بیٹوں سے جس طرح الگ رہنا پڑ رہا تھا اس ماحول میں کوئی ان کو بہکا دے گا اور وہ مرنے سے پہلے وہ جائداد جو ان کے نام سے تھی کسی کو لکھ دیں گی لیکن بیٹے بھی اپنے باپ کی طرح

ہی خوددار تھے اور وہ ماں کو یہی جتاتے رہے کہ وہ ماں کی عزت کرتے ہیں لیکن دولت کے لالچ میں کچھ بھی نہیں کرتے۔

یہ ایک زمیندار گھرانا تھا۔ اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ اولاد تا زندگی اپنے اجداد کے اختیار میں ہوتی تھی، پہلی بار ایک لڑکا وکالت کے پیشے میں گیا تھا تو اس کے اندر بغاوت دکھائی دینے لگی تھی اور وہ اپنی آمدنی کو اپنی سمجھنے لگا تھا اور اس بات پر والد کو اس سے کمائی کا پیسہ مانگتے ہوئے 'مانگنے' کا احساس ہونے لگتا تھا۔ ایک دن انہوں نے اپنا یہ درد اپنی ماں سے بیان کیا اور اس کے بعد وہ بار بار یہی کہتے کہ وہ کسی سے مانگیں گے نہیں۔ مرتے وقت ان کو صرف یہ فکر تھی کہ کہیں ان کی بیوی کو مانگنا نہ پڑ جائے۔ ایک دن ان کی بیوی نے ان سے کہہ دیا کہ وہ اس معاشی آزادی اور کسی کا دست نگر نہ ہونے کے احساس کے ساتھ ہی پوری زندگی گزار دیں گی۔

بشیر عالم اس پوری بات کا ذکر ایسے کر رہے تھے جیسے وہ اپنے ابا امی کا ذکر نہیں کر رہے ہوں بلکہ دو ایسے افراد کا ذکر کر رہے ہوں جس کو کبھی اپنے حال پر بالکل تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔

جب والد بستر مرگ پر تھے اور ڈاکٹر نے اشارہ کر دیا کہ وہ اپنی وصیت وغیرہ کرنا چاہیں تو کر ڈالیں تو انہوں نے بیگم سے بہت سی باتیں کیں اور آخر میں بچوں کا دھیان رکھنے کی ہدایت کر کے چپ ہو گئے۔

بیگم نے پوچھا 'اور میرے لئے کیا کہہ رہے ہیں۔'

'میں جا رہا ہوں — لیکن میں نے آپ کے لئے اتنا انتظام کر دیا ہے کہ آپ کو بچوں کا منھ نہیں تکنا پڑے گا — بس آپ کو اپنا دھیان رکھنا پڑے گا کیونکہ وقت بہت بدل رہا ہے — مجھے نہیں لگتا کہ بچے آپ کا دھیان رکھیں گے — اس لئے آپ اس دھوکے میں مت پڑیے گا۔'

یہ سن کر ان کی آنکھیں نم ہو گئیں — انہیں وہ دن یاد آ گئے جب ان کے شوہر سخت مالی مشکلات میں ہوتے تھے اور پیسوں کے انتظام میں پریشان پھرتے تھے لیکن بیٹوں نے کبھی ان کو اپنی کمائی کے پیسے لا کر نہیں دئے اور ان کو ہمیشہ یہ انتظام اپنی جائداد سے ہی کرنا پڑے۔

ان کے شوہر کے یہ جملے انہیں تلخ تجربوں کی پیداوار ہیں — انہوں نے سوچا۔

انہوں نے اپنے شوہر کے چہرے کو غور سے دیکھا، ان کو لگا کہ ان کے شوہر نے ان کو جو ہدایت کی ہے وہ ان کے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے اور اسی حکم میں ان کے مستقبل کا تحفظ پوشیدہ ہے

—انہوں نے اپنے دل سے اپنی ممتا کے سارے ارمان مٹا دئے اور اسی لمحہ اپنے بچوں پر بھروسہ کرنے کا خیال دل سے نکال دیا—انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک ان کے شوہر کی روح اپنی زندگی کی تمام تلخیوں کے ساتھ ان کے اندر حلول کر گئی ہو اور وہ اس روح کی امین بن گئی ہوں۔ انہوں نے اپنے شوہر کے جانے سے پہلے ہی شوہر کے ساتھ بچوں کے ذریعے ہوئے سلوک کو اپنی آن کا مسئلہ بنا لیا—انہوں نے طے کر لیا کہ وہ اپنے شوہر کے سر کو کبھی جھکنے نہیں دیں گی—انہوں نے اپنے آپ کو ختم کر لیا اور اب وہ شوہر کے نقش قدم پر چلنا چاہتی تھیں۔

باپ نے سب کو اپنے مکان بنانے کے پلاٹ دے دئے—اور ایک ایک کر کے سب کے مکان بھی بننے لگے—اس کے ساتھ ہی سب اپنے اپنے مکان میں رہنے لگے—ان گھروں کا پورا اختیار رکمانڈ ان کی دلہنوں کے ہاتھ میں تھا۔

شوہر کے مرنے کے بعد وہ اپنے پرانے مکان میں ہی رہ گئیں—ایک دن آخری دلہن بھی باہر چلی گئی—وہ اپنے مکان میں ہی رہیں—بیٹوں نے ان کو اپنے اپنے یہاں آ کر رہنے کے لئے کہا لیکن وہ نہیں مانیں—لیکن سب کے یہاں آتی جاتی رہیں۔

اسی دوران ایک دن وہ کسی گھریلو معاملے میں مشورہ دے رہی تھیں اور کسی نکتے پر زور بھی دیا۔

'اماں، آپ ان معاملات میں مت پڑئے—یہ لوگ اب خود دادا نانا ہو چکے ہیں—ہمیں اپنے طور پر سوچنے سمجھنے دیجئے"—میری بیوی نے کہا"—آپ کو اب کسی بات سے کیا لینا دینا—آپ کو اپنے لئے جو چاہئے بتا دیا کیجئے'

تقریباً سارے بیٹے موجود تھے—سب کو یہ بات اچھی لگی۔

لیکن ماں اچانک خاموش اور سنجیدہ ہو گئیں—انہیں ایسا لگا جیسے ان کے اور ان کے بچوں کے درمیان ایک گہری کھائی چلی آئی ہو اور وہ ان سے بہت دور ہو گئی ہوں—"ٹھیک ہے بیاٹا۔اب میں تم لوگوں کے ذاتی معاملات میں نہیں بولوں گی—"انہوں نے خشک لہجے میں کہا لیکن کسی نے اس خشکی کو محسوس نہیں کیا—اس کے بعد ان کے اندر ایک عجیب سنجیدگی پیدا ہو گئی—وہ جیسے رفتہ رفتہ اپنے اردگرد سے دور رہنے لگیں—وہ سب کی باتیں سنتیں لیکن خود بہت سنبھل کر کچھ بولتیں—انہوں نے اب پہلے سے زیادہ توجہ سے اپنا دھیان رکھنا شروع کر دیا—ان کی گفتگو اب گھر کی سب سے بڑی خاتون کی بجائے ایک بزرگ جہاندیدہ خاتون کی طرح ہونے لگی—

بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ وہ اپنے پرانے مکان میں ہی رہیں اور ان کا خرچ دیا جائے— بھائیوں نے یہ طے کر دیا کہ وہ سب مل کر ہر مہینے ایک خاص رقم انہیں دے دیں گے— جس سے ان کے اخراجات چلیں گے— نوکرانی، مہمان، باورچی خانہ اور دیگر اخراجات جوڑ کر ماہانہ رقم طے ہوگئی۔ اس سے ان کو آزادی کا احساس تو ہوا لیکن علحدگی کا بھی احساس ہوا— یہ احساس ان کے دل میں کہیں گہرائی میں اتر گیا— خاندان کی بیشتر زمینیں ان کے نام سے تھیں— دو تین زمینیں ایسی تھیں جن کو وہ بالکل اپنی نجی زمینیں مانتی تھیں کیونکہ یہ انہیں مہر کے عوض میں ملی تھیں۔

جب ان کا کوئی ایسا بیٹا گھر آتا جس نے ابھی مکان نہیں بنایا تھا تو وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ انہیں کے پاس ٹھہرتا— کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ گھر میں بالکل اکیلے ہوتیں— سبھی شام میں دیر تک وہاں بیٹھے، بستی کے اور ملنے والے بھی وہیں آتے— ان کے بھائی اور دوسرے رشتے دار بھی ان سے ملنے وہیں آتے۔ انہیں ان تمام لوگوں کی خاطر داری کرنے کی پوری آزادی چاہئے تھی— لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ اس عمر میں اکیلے کیوں رہتی ہیں لیکن انہیں اپنی آزادی پیاری تھی—

آٹھ دس برس اور گزر گئے— اس دوران انہوں نے کسی کے گھریلو معاملے میں کچھ نہیں کہا۔ سب لوگ اب ان کی پہلے سے زیادہ ادب بھی کرنے لگے— کوئی ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ وہ اس بات کو محسوس بھی کرتیں اور محسوس بھی کروا دیتیں۔

ان کے اندر اپنے ملکہ ہونے کا احساس تھا— انہوں نے اپنی بیوگی کا کسی کو احساس نہیں ہونے دیا— اور ایسا کرتی بھی کیوں— ان کے شوہر نے ہمیشہ اس بات کا ذکر کیا تھا کہ وہ نہ تو اپنی اولاد کا محتاج ہونا چاہتے ہیں اور نہ انہیں ہونے دینا چاہتے ہیں— اس لئے انہوں نے کبھی اپنی اولاد سے ان کی کمائی سے کچھ نہیں مانگا اور سخت سے سخت مالی مشکلات کے زمانے میں بھی خود ہی اپنی جائداد سے اپنی ضرورتیں پوری کیں— تنہائی میں والد بھی ان کو یہی ہدائت کر گئے تھے— شروع کے دنوں میں جب انہوں نے دیکھا کہ نورالنسا کی اچھی باتیں بھی بہوؤں کو اچھی نہیں لگتیں اور ان کے جواب سے نورالنسا کی خواہ مخواہ دلآزاری ہوتی ہے تو انہوں نے ایک دن انہیں دیر تک سمجھایا— اپنے شوہر کی بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی لیکن ان کے بیٹوں کو اس کا پتہ نہیں چلا— اب ہم

ان تمام باتوں اور چہروں کے تاثرات کے معنی سمجھنے لگے ہیں جو ان دنوں سمجھ میں نہیں آئے تھے۔

زمانہ بدل چکا تھا— گھروں میں چونکہ بیویوں کا راج تھا—اس لئے لڑکوں سے کچھ کہنے کا کوئی معنی نہیں تھا—ان کی نظروں میں تو بہوئیں ہی تھیں—اور ان کے سامنے اپنا مقام چھوڑنا ان کو پسند نہیں تھا—وہ تو اپنے کو اس ساس اور ساس کی ساس کی جگہ رکھ کر دیکھ رہی تھیں جن کی وہ بہو رہ چکی تھیں—زمانے کی زمین نیچے اترتی رہی لیکن انہوں نے اپنا آسمان نہیں چھوڑا۔

"میں کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی۔" ایک دن انہوں نے کہا تھا—سب نے اس بات کو بڑھاپے کی بڑبڑ سمجھا—بیٹوں کا منہ تکتے تکتے وہ بیزار ہو گئی تھیں۔

ان کو دنیا اور زندگی سے مایوس ہوتے یا الجھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ بچوں کی ذمہداریوں سے فارغ ہوئیں تو ان کی نظر زمانے پر چلی گئی۔ زندگی کے کتنے ہی واقعات تھے جن کا ذکر وہ اپنی گفتگو میں کیا کرتی تھیں—بڑھتی عمر کے ساتھ یہ مشاہدے اور بھی بڑھتے گئے تھے۔

اب وہ گاؤں کے بچوں اور جوانوں تک کے لئے ایک کتاب بن چکی تھیں۔

وہ دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں سناتی تھیں—انگریز، جاپان، رنگون— کہ جب جاپانی برما تک پہنچ گئے تو انگریز ادھر سے ہو کر کس طرح بھاگ رہے تھے—انگریزوں کے اس طرح بھاگنے کا ذکر کتابوں میں تو کہیں تھا ہی نہیں۔

آزادی اور بٹوارے کی کہانیاں۔

وہ ہندوستان اور چین کی لڑائی کی کہانیاں سناتی تھیں— قحط سالی کے قصے اور مختلف طرح کی سرکاری ریلیف میں ملنے والی اشیا اور اس میں خرد برد کی کہانیاں۔

بٹوارے کے بعد ہونے والی فرقہ وارانہ کشیدگی کی کہانیاں—اس زمانے میں دور دور سے آئی ہوئی کہانیاں۔ جنگوں سے لوٹے ہوئے سپاہیوں کے ذریعے سنائے گئے محاذ جنگ کی کہانیاں۔

آدمی کے چاند پر جانے کا واقعہ۔

آسمان پر چھوڑے گئے راکٹوں کے تاروں کی طرح چلنے کا منظر اور امریکہ اور روس کے مقابلوں کی کہانیاں۔

کبھی کبھی گھر کی پرانی کہانیاں سناتیں۔

زمینداری کے زمانے کے زمینداروں کے دبدبے کی کہانیاں۔

گھر میں بھائیوں میں ہوئے بٹوارے میں مٹی کے برتنوں کو توڑ کر بانٹنے کی دلچسپ کہانیاں۔

بچوں کے سنگین طور پر بیمار ہوجانے اس کے نتیجے میں جھیلی ہوئی مشقتوں کی داستان۔

کبھی کبھی اپنے زمانے اور مستقبل کی پیشن گوئیوں کا ذکر کرتیں۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ جب چودھویں صدی آئے گی تو گھر گھر میں ناچ گانا ہوگا— میں سوچتی تھی کہ یہ کیسے ہوگا— یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

یہ بھی لکھا ہے کہ بچوں کے دل سے ماں باپ کی محبت ختم ہوجائے گی۔ وہی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔

اپنی ساس اور ساس کی ساس کی کہانیاں سناتے ہوئے وہ انتہائی روحانی سکون سے سرشار نظر آتیں— یہ ان کی وہ پسندیدہ کہانی تھی جو وہ بہت خاص موقعوں پر سناتیں— "مرتے وقت تمہاری دادی نے کہا کہ بہو میں اپنی ساس کی ذمہ داری تمہارے ہاتھوں میں چھوڑے جارہی ہوں —ان کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دینا— یہ میری ساس کی وہ ساس تھیں کہ جب اولاد نہیں ہورہی تھی تو بیٹے کی دوسری شادی کرنے پر بضد ہوگئی تھیں— یہ ہدایت انہوں نے مجھے مرتے وقت اپنی اس ساس کے لئے دی تھی— وہ بیٹے کی دوسری شادی کرنے کے لئے بضد ہوئیں تو ان کے شوہر نے ان سے کہا تھا کہ اگر پوتا پوتی دیکھنے کی اتنی شدید خواہش ہے تو وہ کرنے کی ہمت کرو جو میں بتاتا ہوں— ان کے بتانے پر وہ چالیس دنوں تک مسجد میں جاکر بتائی ہوئی دعا کی ورد کرتی رہیں— ہدایت تھی کہ جب وہ کوئی خوفناک چیز دیکھیں تو گھبرا کر بھاگیں نہیں ورنہ پاگل ہوجائیں گی انہوں نے یہ چیلنج قبول کیا— ایک رات انہوں نے اپنے چاروں طرف اژدہوں کو پھنکارتے ہوئے دیکھا — لیکن ٹس سے مس نہیں ہوئیں— ایک اور رات انہوں نے شیروں کو گرجتے ہوئے آتے دیکھا— اس کے بعد بالکل آخر کے دنوں میں ایک دن دیکھا کہ مسجد کی دیواریں ہٹ گئی ہیں اور دور تک چٹیل میدان ہے اور سفید پوش لوگوں کی قطاریں نماز پڑھ رہی ہیں— جب انہوں نے یہ منظر اپنے شوہر کو سنایا تو انہوں نے کہا کہ اب چمئین کو بلا کر دلہن کو دکھائیں— دکھانے پر معلوم ہوا

کی وہ حاملہ تھیں۔

اسی حمل سے ان لوگوں کے والد کی پیدائش ہوئی تھی— یقیناً دادی کو دونوں باتوں کا علم اور احساس تھا یعنی اولاد نہ ہونے پر دوسری شادی پر بضد ہونا اور ان کی گود ہری ہونے کے لئے ایسے خوفناک لمحات کا سامنا کرنا— ایک عورت کا حال عورت ہی بہتر سمجھتی ہوگی اور اس ساس کے لئے اس قدر خیال شاید اسی کا نتیجہ تھا— شاید وہ یہ کہنا چاہتی تھیں کہ تمہارا اس گھر کا بہو ہونا اسی بوڑھی عورت کی محنتوں کا ثمر ہے یہ مت بھولنا۔

زمانے کو یاد کرنا، اس کو بیان کرنا اور موجودہ زمانے کو دیکھنا ہی ان کی زندگی بن گئی تھی— ان کے پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں ان سے بے حد پیار کرتے تھے— ان کے لئے ان کے لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی— وہ ان سے ہنستیں، بولتیں، ان کی ہونے والی دلہنوں اور دولہوں کے حوالے سے مزاق کرتیں— بچیاں کبھی ان سے روٹھ جاتیں، پھر ان کے پاس جا کر ان سے پیار سے باتیں کرنے لگتیں— کبھی ان سے پرانے زمانے کی باتیں سنتیں، کبھی موجودہ زندگی سے متعلق اپنی ذہنی الجھن کو ان سے شیئر کر کے انہیں سلجھاتیں— ان سے بہتر شاید ان بچوں کے لئے پورے گاؤں میں دوسرا کوئی دوست نہیں تھا۔

وہ گھر میں اکیلی رہ گئی تھیں لیکن خوش تھیں— پورے گاؤں محلے کے لوگ ان سے ملنے آتے تھے— سامنے کرسیاں لگی تھیں— ایک تخت تھا— سامنے ہی گیس کا چولہا تھا اور نوکرانی وہیں کھانا بناتی تھی— اپنے تمام بیٹوں بیٹیوں اور پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں اور ان کی اولادوں کی خبر لیتی رہتی تھیں— ان کو اسی سے فرصت نہیں تھی۔ نوکرانیاں ان کے پاس کام کرنے میں اس وجہ سے خاص دلچسپی لیتی تھیں کہ وہ یہاں طرح طرح کے کھانا بنانا سیکھ جاتی تھیں۔

ان کی 99 سالہ آنکھوں نے، جو دور سڑک پر آتی جاتی ٹریفک کو دیکھ رہی تھیں، اس سڑک کا اسی برسوں کا طویل منظر دیکھا تھا اور اس منظر میں ہوتی ہوئی تبدیلیاں دیکھی تھیں— ان کے اوپر جب کبھی فلسفیانہ طبیعت کی بہار آتی تھی تو دنیا کے اوپر بہت معرکے کے کمنٹ کرتی تھیں— اکثر اس زمانے اور پرانے وقتوں کا موازنہ کرتی تھیں لیکن یہ موازنہ کبھی بھی زمانے میں برائیوں کے بڑھنے جیسی باتوں کا نہیں ہوتا تھا بلکہ دونوں وقتوں کے حالات آئینہ کی طرح سامنے آنے لگتے تھے۔

ایک دن ایک شادی کے جشن میں سامنے سے ٹریکٹر پر ایک لڑکی ڈسکو کرتی جارہی تھی

اور پیچھے پیچھے گاؤں محلے کے سیکڑوں لونڈے اور بچے چل رہے تھے— فلمی گانے کی بلند آواز آرہی تھی— انہوں نے دیکھنے کے لئے دروازے کے پٹ کھلوائے اور دلچسپی سے دیکھتی رہیں— ان کے دیکھنے کے انداز سے یہ سیکھنے کو ملا کہ زمانے کو کیسے دیکھا جاتا ہے۔

جب ٹریکٹر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو انہوں نے کہا۔

ایک آج کا یہ وقت ہے اور ایک پہلے کا وقت تھا:

ایک مرتبہ تمہارے ابا ہم لوگوں کو باغات دکھانے لے گئے— تمہاری پردادی بھی تھیں۔ ٹمٹم پر دونوں طرف سے پوری طرح پردہ کسا گیا، پھر اس میں ہم لوگ بیٹھے تھے— اب میری بیٹی مجھ سے لڑتی ہے کہ اسے اسکول کالج میں پڑھایا کیوں نہیں گیا— بتاؤ۔ اس وقت بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ یہ بات نہیں سوچتی— جب وہ یہ باتیں کہتیں تو ان کے لہجے میں اپنے اور اپنی بیٹیوں کے قیمتی لمحوں کی بربادی کی کسک اور اس بات کا افسوس صاف دکھائی دیتا تھا کہ یہ زمانہ آیا لیکن کتنی دیر سے آیا—

وہ بچوں سے الگ طرح کی باتیں کرتیں، لڑکیوں سے الگ طرح کی اور ہم لوگوں سے الگ طرح کی— ایک دن مجھے بتانے لگیں کہ اب ساری بہوئیں شہر میں جا کر رہ رہی ہیں— جن جن عورتوں کے شوہر عرب کمانے گئے ہیں ان میں کوئی بھی دیہات میں رہنا نہیں چاہتی— سب بچوں کو اسکولوں میں پڑھانے کے نام پر شہر میں کرائے کا مکان لے کر رہ رہی ہیں— انہوں نے کئی نام گنا دئے— ان کو سب معلوم تھا۔

ایک محلے کی لڑکی ہے— اس نے اپنی شادی سیلفون پر ہی دوستی کر کے طے کر لی— اس لڑکے سے گھنٹوں فون پر بات کرتی رہتی تھی— ان دنوں وہ ان کا کھانا پکانے بھی آتی تھی— ان کو اس افیئر کے بارے میں بتا بھی دیا— جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ لڑکا عرب مملک میں کام کرتا ہے تو وہ کچھ سوچنے لگیں اور پھر سختی سے تاکید کی کہ لڑکے کے گاؤں کسی کو بھیج کر معلوم کر لے اس کے بارے میں ٹھیک سے معلوم کر لے کہ وہ لڑکا کہیں شادی شدہ تو نہیں ہے لیکن لڑکی نے اپنی مستی میں دھیان نہیں دیا— پورے محلے کو اس افیئر کے بارے میں معلوم ہو گیا— اس کے بعد شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا— آخر میں بھید کھلا کہ اس لڑکے کے پہلے سے ہی سات بچے تھے اور بیوی بھی تھی اور دوسری شادی کا خیال اسے عرب میں رہنے کی وجہ سے آیا تھا— ظاہر ہے کہ اس لڑکی کے سیلفون

عشق کا یہ پورا معاملہ ان کو معلوم تھا— ان کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ وہ فون پر کسی اجنبی لڑکے سے کیوں بات کرتی ہے— ان کو اعتراض اس بات پر ہوا کہ جس سے وہ بات کرتی تھی اور جس سے اپنی شادی طے کر چکی اس کے بارے میں آگے چل کر معلوم ہوا کہ وہ سات بچوں کا باپ تھا— شادی کی بات ٹوٹی اور لڑکی بہت روئی اور ان کی گود میں سر رکھ کر کہنے لگی کہ میں نے آپ کی بات پر دھیان نہیں دیا اسی لئے یہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئی کھیت۔ دوسری لڑکیاں بھی اس معاملے میں 'دادی' کے مشورے کی حمایت کرتی رہیں۔

ہم نے ان کی زندگی پر غور کر کر کے بہت کچھ دیکھا اور سیکھا۔

ہم بچپن میں جوائنٹ فیملی کی بہت تعریف سنتے تھے اور تعجب ہوتا تھا کہ وہ لوگ کتنے خود غرض ہوتے ہوں گے جو اپنے خاندانوں کے بھرے بھرے ماحول سے الگ ہو کر اکیلے رہنا پسند کرتے ہیں لیکن اپنے خاندان کو جو تمام پیار اور محبت کے ساتھ بکھرتے دیکھا تو ایسا لگا کہ جوائنٹ فیملی بھی میری ماں کی طرح بدلتے وقت کا شکار ہو گیا۔

ہم اپنے بچپن میں یہ بھی سوچا کرتے تھے کہ بوڑھے لوگوں کا ذہن تبدیلیوں کو قبول نہیں کرتا ہے اور اس کی وجہ سے چڑ چڑے ہو جاتے ہیں لیکن میری ماں کے لئے تو بدلتا وقت ایک خوبصورت تماشا بن گیا تھا— مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ ایک لمبے زمانے کی تبدیلیوں نے انہیں وقت کی تبدیلیوں کے تئیں اتنا حساس بنا دیا تھا جتنا خود ہم بھی نہیں— وہ لوگوں کی سوچ میں ہوتی تبدیلیوں کو بہت دلچسپی سے سنتی تھیں اور ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرتی تھیں کہ یہ تبدیلی کن وجوہات سے آتی تھی۔

نئے زمانے کے بارے میں تو گویا ان کا ذہن کئی دہوں سے بنا ہوا تھا— وہ بچپن میں ہم لوگوں سے کہا کرتی تھیں کہ جب چودہویں صدی آئے گی تو کیا کیا ہوگا اور ایسا لگتا تھا کہ ہر چند کہ چودہویں صدی کو ذکر لوگ زوال کے طور پر کرتے تھے لیکن وہ ہمیشہ ایسے ذکر کرتی تھیں جیسے یہ نئی حیرت انگیز چیزوں کے نمودار ہونے کا عہد ہوگا— اور بعد کے دنوں میں ان کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ طویل زندگی پا کر اس عہد کو دیکھنا چاہتی تھیں اور قدرت نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی تھی— انہیں تو میں نے گذشتہ زمانے کے تئیں شاکی ہی پایا— وہ بار بار اس زمانے کے غریب لوگوں کی زندگی کی حالت اور زندگی کے قید و بند میں جانوروں کی طرح کی زندگی کا ذکر کرتے

ہوئے کہتی تھیں کہ اب حالت بہت اچھی ہے اور بہت پیار سے کہتیں کہ بابو وہ زمانہ اچھا نہیں تھا۔

آخری دنوں میں پوری فصل کی کٹائی پر ماں اپنی ضرورت کے لائق لے لیتیں اور باقی بیٹوں میں بٹ جاتی تھی — لڑکوں نے ان کے خراجات کو ان کے ذاتی اخراجات تک محدود رکھنا طے کر دیا تھا — شروع شروع میں تو وہ کبھی کسی ضرورت کے سامنے آنے پر بیٹوں کو بلا کر کچھ کہہ بھی دیا کرتیں لیکن جب انہوں نے دو تین بار دیکھا کہ انہوں نے آنا کانی یا ان سنی کر دی تو انہوں نے مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی اور یہی بات غلط ہو گئی تھی — والد اکثر یہ دھمکی دیا کرتے تھے کہ اگر بیٹے کما کر نہیں دیں گے تو وہ جائداد کو بیچنا شروع کریں گے حالانکہ انہوں نے آخری سانس تک ایسا کیا نہیں — اور اب یہی خیال ماں کے بارے میں آنے لگا تھا کیونکہ زمین کسی کو بھی لکھ دینے کا حق و اختیار انہیں کے پاس تھا اور آدھی سے زیادہ موروثی جائداد انہیں کے نام تھی — اور ماں کی مکمل خاموشی سے سب خوفزدہ تھے کہ وہ جائداد کے بارے میں ضرور کچھ ایسا کر بیٹھیں گی جس سے ان سب کو اپنے حق سے ہاتھ دھونا پڑے گا — اکڑ ایسی کہ کوئی ان سے بات کر لینا نہیں چاہتا تھا تا کہ کم از کم اندیشہ ہی دور ہو جائے — بیویوں کو تو اب بہت پریشانی ہونے لگی تھی یہ سوچ سوچ کر۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میرے ایک دو بھائیوں کو تو ان کے مرنے کا انتظار رہنے لگا تھا اور وہ اندازہ لگاتے رہتے کہ اب وہ کتنے دنوں اور زندہ رہیں گی اور ان کے اندازوں کے مسلسل غلط ثابت ہونے پر دوسرے ان کا مذاق بھی اڑاتے تھے — اتنی بات تو واضح تھی کہ وہ سب کے لئے مرنے سے پہلے مر چکی تھیں، مرنے سے کئی برس پہلے ہی اور اس بات کو شاید ان کو بھی احساس ہو گیا تھا لیکن انہوں نے زندگی سے ناتا توڑنا بالکل ضروری نہیں سمجھا — وہ زندگی کی آخری سانس تک زندگی کے تانے بانے کو اپنے طور پر ٹٹولنے میں دلچسپی لیتی رہیں۔

میں ان کا بیٹا ہوں اور مجھے اب یہ صاف صاف دکھائی دینے لگا ہے کہ وہ کیا سوچتی تھیں اور کیا محسوس کرتی تھیں — افسوس ان کی زندگی میں ہم لوگوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا، دھیان نہیں دیا — سچی بات تو یہ ہے جو ہمارے لئے اب بھی شرم کی بات ہے کہ انہوں نے تسلیم کر لیا تھا کہ انکے پیٹ سے پیدا ہونے اور پھلنے پھولنے والا پورا خاندان ایک مختلف دنیا بن چکا ہے اور وہ اس دنیا سے بہت آگے بڑھ آئی ہیں — اور اب اس سے ان کا رشتہ ہے لیکن یہ رشتہ خانہ بندی کا شکار ہو چکا ہے — اور وہ ایک الگ خانے میں ہیں — اور اس خانے میں وہ تنہا ہیں — اور گویا کسی پر

ان کی بات ماننا اب لازم نہیں اور ان کی اولاد انہیں بس ایک مقدس ذمہداری سمجھ کر اس ذمہ داری سمجھ کر نبھا رہی ہے۔ان کے بیٹوں کو اب اتنا بھی خیال نہیں آتا تھا کہ ہر روز کم از کم ان میں سے ایک ہی ان کے کمرے میں آ کر سو جائے تا کہ اگر انہیں رات میں کوئی ناگہانی تکلیف ہو جائے تو انہیں سنبھال لے۔وہ یہ بات ان سے کہنا نہیں چاہ رہی تھیں لیکن اس بات کو شدت سے محسوس کر رہی تھیں۔صرف میرا چھوٹا بھائی ان کے قریب زیادہ دن رہا۔وہ کاروبار کر رہا تھا اور گاؤں میں ہی رہ رہا تھا۔اس نے ماں کی بے حد خدمت کی۔جب ان کی طبیعت نازک ہوتی تو وہ رات بھر اٹھ اٹھ کر ان کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔لیکن وہ اس کمی کو کیسے پورا کر سکتا تھا جو کمی وہ دوسرے بیٹوں سے وابستہ توقعات کے پورے نہ ہونے کے سبب محسوس کرتی تھیں۔

شاید وہ یہ سوچنے لگی تھیں کہ کیا اب ان کی حیثیت اتنی سی باقی رہ گئی تھی کہ کسی دن ان کی آنکھ بند ہو جائے اور وہ ان کی آخری رسوم کی ادائیگی کر کے زندگی کے سفر میں آگے بڑھ جائیں۔یہ بات کوئی خاص مسئلہ بھی نہیں تھی لیکن ان کے لئے دلچسپ بات تو ایک ماں اور اس کی اولاد کے درمیان کے رشتے کا اس مقام پر پہنچ جانا تھا۔ادھر پندرہ بیس برسوں سے تو ان کا زیادہ تر وقت دنیا کو سمجھنے میں ہی کٹتا تھا۔وقت بھی کچھ ایسا آیا تھا کہ روز نئی نئی چیزیں سامنے آ رہی تھیں۔

لوگ ان کے اکیلے رہنے کے اسٹائل کو لے کر ان کی بارعب شخصیت کا ذکر کرنے لگے تھے۔حالانکہ ان کے اندر رعب والی بات ذرہ برابر بھی نہیں تھی لیکن عزت نفس کا احساس کہیں گہرائی میں اتنا مضبوط تھا کہ اس کا عکس ان کی شخصیت میں صاف نظر آتا تھا۔ کسی بہو کی ہمت نہیں تھی کہ ان کے سامنے اونچی آواز میں بات کرے اور جس میں تھی اس کے اوپر ان کے گھر کا دروازہ بند تھا۔اس سلسلے میں وہ کسی مصالحت کے لئے تیار نہیں تھیں۔بیٹے کبھی کسی مسئلہ پر اونچی آواز میں بول بھی دیتے تو بہت پیار سے تھوڑی ہی دیر میں وہ انہیں زمین پر اتار لاتی تھیں۔اس کے بعد وہ وہی چھوٹا بچہ بن جاتا۔

جنازے والا واقعہ انکے انتقال سے دو تین ماہ پہلے کا ہے۔ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ خاص طور سے برآمدے میں آ کر بیٹھی تھیں۔اس دن گاؤں میں ایک دوسری بزرگ خاتون کی وفات ہوئی تھی۔انہوں نے پہلے سے ہی معلوم کر لیا تھا کہ جنازہ کب جائے گا۔

میں اندر سے نکلا تو مجھے دیکھ کر بولیں۔

ایسا لگ رہا ہے کہ میں ہی جا رہی ہوں۔

میں سناٹے میں آ گیا کہ یہ اپنی موت کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔

وہ جنازے کو اتنے انہماک سے دیکھ رہی تھیں کہ جب وہ دروازے کی اوٹ میں جانے لگا تو بائیں طرف جھک کر دیکھنے لگیں اور تب تک دیکھتی رہیں جبتک وہ اگلے محلے کے مکانوں سے آگے کی طرف نہ چلا گیا— اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئیں تو ان کے چہرے پر ایک گہرا ٹھہراؤ تھا۔

میری پریشان نظروں کو دیکھ کر بولیں۔

اور کیا؟ مجھے بھی تو لوگ اسی طرح لے جائیں گے۔

مجھے محسوس ہوا کہ یہ سفر بھی اب ان کے لئے صرف ان کے ادھر ادھر چلنے پھرنے کے دوسرے قدموں کی طرح ایک معمول کا قدم تھا۔

ایک دن وہ بستر سے اٹھیں اور زمین پر پاؤں اتارے اور چپل پہننے کی کوشش کی تو انہیں محسوس ہوا کہ ان کے پاؤں میں کچھ بے حسی پیدا ہو گئی ہے— پاؤں اوپر کھینچ کر قریب سے دیکھا تو اس پر سوجن آ گئی تھی— انہیں احساس ہو گیا کہ ان کی منزل قریب تر آ رہی ہے— اس کے بعد وہ کچھ بے چین رہنے لگیں جس کی وجہ خود ان کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی— سوچتے سوچتے انہیں محسوس ہوا کہ ان کے دل ودماغ پر کچھ بوجھ سا ہے— غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ کچھ باتیں تھیں جو انہیں پریشان کر رہی تھیں— کچھ ایسی باتیں جنہیں وہ اپنے ساتھ لیکر مرنا نہیں چاہتی تھیں۔

بشیر عالم نے ایک گہری سانس لی اور آگے بولے۔

اپنی زندگی بھر انہوں نے کوئی جائداد نہیں بیچی— جو کچھ بیٹوں نے اپنی مرضی سے دیا اس پر صبر کیا— لیکن وہ اپنے غصے کو اپنے ساتھ لے کر مرنا نہیں چاہتی تھیں— انہیں ڈر تھا کہ یہ غصہ بددعا میں تبدیل ہو جائے گی— وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ ماں باپ کی بددعا وہ نہیں ہوتی جو وہ اپنے منھ سے بول دیتے ہیں، ماں باپ کی بددعا وہ شکایت بن جاتی ہے جو ان کے دل میں رہ جاتی ہے۔ انہوں نے اس پر کافی سوچا اور اس کے بعد اپنے ایک پوتے کو بلا کر اپنی ایک وصیت لکھوائی جس کے ذریعے وہ اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سزا دے کر اپنے شکوے کے اثرات کو ختم کر دینا

چاہتی تھیں۔

رات میں انہوں نے اپنے ایک پوتے کو بلوا کر یہ وصیت لکھوانے کے بعد اسے ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو نہ بتائے اور جس دن ان کا انتقال ہو اسی دن یہ تحریر ان کے بیٹوں کو دے دے۔

اس تحریر میں انہوں نے اپنے اس بیٹے کو مخاطب کیا تھا جو پروفیسر تھے اور اب ریٹائر ہونے والے تھے۔ "بیٹے خورشید، تم نے مجھ سے ایک بار پوچھا تھا کہ انسان بڑا ہے یا وقت اور تم نے کہا تھا کہ تمہاری سمجھ یہ کہتی ہے کہ وقت بڑا ہے۔ میری زندگی پورے سو سال کی ہونے جا رہی ہے۔ میں نے تمہاری باتوں پر بہت غور کیا اور مین سمجھتی ہوں کہ انسان بڑا ہے، وقت نہیں، کیونکہ انسان اپنی مرضی سے بدل سکتا ہے لیکن وقت اپنی مرضی سے نہیں بدل سکتا۔ وہ متحرک ہوتے ہوئے بھی ایک پتھر کی طرح ہے۔ میں نے تاریخ کے سو سال صرف دیکھے نہیں بلکہ جئے ہیں۔ تاریخ پیڑ کی طرح بڑھتی رہی اور میں بیل کی طرح اس پر چڑھتی رہی۔ میں نے تاریخ کے حسن کے کئی رنگ دیکھے ہیں اور اسے دیکھتے دیکھتے اپنی پوری عمر کاٹ دی۔ جو لوگ تبدیلیوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ دکھی رہتے ہیں۔ تم لوگ ان کتابوں کو اور ان فلسفیوں کو دوبارہ پڑھنا جن پر دن رات بحثیں کرتے تھے تو تم کو وہ کتابیں اور گہرائی سے سمجھ میں آئیں گی اور جب تم لوگ میری زندگی پر غور کرو گے تو تم لوگوں پر ان کتابوں کا کچا پن بھی کھلے گا کیونکہ میں نے ان مصنفوں سے زیادہ لمبی، پیچیدہ اور بدلتی ہوئی زندگی جی ہے اور یہ تحریر اس مقام سے لکھ رہی ہوں جہاں پہنچ کر ان میں سے کسی نے زندگی کو نہیں لکھا۔ وقت چلتا رہے گا کیونکہ اسے اختتام میسر نہیں۔ میں یہیں رک جاؤں گی کیونکہ میری عمر پوری طرح خرچ ہو گئی۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ ذرے کی طرح چمک رہا ہے اور میرے سامنے وقت تہی دامن ہو چکا ہے۔ اب میرے لئے وقت ایک ایسا ہمسفر مداری ہے جو دنیا کو مصروف رکھنے کے لئے ڈگڈگی بجاتا رہے گا اور تماشا دکھاتا رہے گا۔ اس کے پاس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

یہ دنیا کیسی ہے؟ یہ دنیا ہر انسان کے لئے ویسی ہی ہے جیسی وہ اس کے مشاہدوں اور تجربوں میں نظر آئی ہے۔ اسی لئے آج تک کوئی دنیا کی تصویر نہیں بنا پایا۔ یہ دنیا ایک آئینہ ہے اور ہر شخص کو اس میں اپنا ہی باہری حصہ دکھائی دیتا ہے۔ ہر شخص اس دنیا کا ہی ایک حصہ ہے۔ اور جس

قدر ہر شخص پراسرار ہے اسی قدر یہ دنیا بھی پراسرار ہے — رشتہ دار صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے وقت باقی سارے رشتے اسی کے تابع ہیں — تم وقت کی گود میں کھیلتے ہوئے ایک بچے ہو — ہر لمحے کو ماں کی گود سمجھو — یہی میری نصیحت ہے — زندگی کا ہر لمحہ تمہاری پرورش کا لمحہ ہے اس سے انکار مت کرو — اور تمہیں میری خوداعتمادی کا راز مل جائے گا۔

میرے مرنے کے بعد تم سب بہت روؤ گے یہ بھی میں دیکھ چکی ہوں — میں نے مرنے والی ماؤں کے بچوں کو روتے دیکھا ہے — یہ دنیا ہے۔ اس میں یہ سب بار بار ہوتا ہے — تمہیں میرے اٹھ جانے سے کسی بوجھ کے ختم ہونے کا احساس نہیں ہوگا — میں کتنی بدقسمت ماں ہوں کہ تم لوگوں نے مجھ سے دنیا کا یہ سب سے میٹھا احساس چھین لیا کہ میں تم لوگوں کی ذمہ داری تھی — تم نے مجھے آزاد کر کے دراصل ایک ماں کو اس کی ممتا کے احساس سے آزاد کر دیا تھا — میں صرف بیوہ نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے بعد میں اپنے بچوں سے آزاد ہو کر کچھ اور بھی ہو گئی تھی — لیکن اس میں تمہارا کوئی رول نہیں — یہ بھی وقت کا ہی ایک روپ تھا — اب تم سب لوگ میرے لئے دنیا کے سامان اور دنیا کے لوگوں کی طرح ہو اور وہ بھی ایسے سامان کی طرح جن کی مجھے اس عمر میں کوئی ضرورت نہیں — میرے لئے تو وہ چند کھیت کافی ہیں جو تم لوگوں نے میرے لئے مخصوص کر رکھے ہیں۔

مجھے وقت نے ایسا کڑوا گھونٹ پلایا کہ میں کئی برس سے دراصل صرف ایک زندہ روح بن کر رہ گئی ہوں جو اس دنیا کو ایک مسافر کی طرح دیکھتا ہے — اسی لئے جب بھی جسمانی تکلیف ہوتی ہے اور جی گھبراتا ہے تو کہتی ہوں کہ اللہ مجھے اٹھا کیوں نہیں لیتے — یہ بڑا حقیقی جملہ ہوتا تھا لیکن تم لوگوں نے اسے کبھی دھیان سے نہیں سنا — تم لوگوں نے اسے ہمیشہ ایک رٹا رٹایا جملہ سمجھا — انسان اس عمر میں یہ جملہ کہہ کر دنیا سے بدلہ لیتا ہے اور بتاتا ہے کہ دراصل اسے اب دنیا کی ضرورت نہیں ہے —

کل سے یا دو چار دنوں کے بعد سے یہ برآمدہ اور یہ آنگن سونے ہو جائیں — پھر یہ نئے سرے سے آباد ہوں گے — یہی ہیں میرے جواب تمہارے ان چند سوالوں کے جو تم میری عمر کی ایک بوڑھی عورت سے جاننا چاہتے تھے — میرے دل پر یہ سوالات ایک مدت سے بوجھ بنے ہوئے تھے اس لئے آج انہیں لکھوا کر میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا — بیٹا ایک بات اور، میں نے کبھی کبھی محسوس کیا ہے کہ میں اپنی روٹی، کپڑے اور دیگر چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے بھی اپنے

ان بیٹوں پر بوجھ محسوس ہوئی جن کے پاس کروڑوں کی جائداد اور آمدنی ہے— میں نے ان کو کچھ مانگنے پر سوچتے ہوئے دیکھا— مجھے ان کی یہ بزدلی پسند نہیں آئی— اپنے اخراجات سے اسقدر مت ڈرو— یہ میری آخری نصیحت ہے— اپنے حقوق کی ادئیگی میں کوتاہی کرنا ایسے ہی ہے جیسے غذا میں وٹامن کی کمی جو انسان کو بیمار کر دیتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر تکلیف نہیں ہوئی لیکن تم لوگوں کے لئے تشویش ضرور ہوئی— خیر میرا وقت میرے لئے اور تم لوگوں کا وقت تم لوگوں کے لئے— جیتے رہو۔ خوش رہو۔ تمہاری اولادیں خوش رہیں۔

اور میں نے اپنے حج کے موقع پر خرید کر لایا ہوا کفن خوشنودہ کی امی کے انتقال کے موقع پر بھجوا دیا تھا اس لئے کہ اس وقت میرے پاس پیسے نہیں تھے اور میں اپنی اس خواہش کا بوجھ تم لوگوں پر ڈالنا نہیں چاہتی تھی کہ میں اس غریب کے لئے کفن کا کپڑا بھیج دینا چاہتی ہوں— اس لئے حج والے کفن کے کُرتے کی میرے بکسے میں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرنا— میں نے اپنے کفن کے لئے الگ سے پیسے رکھ دئے ہیں اسی بکس میں ایک سرخ کپڑے میں۔ میری قبر تیار کرنے کے اخراجات بھی اسی سے پورے ہو جائیں گے اس کے علاوہ اس میں سے کچھ پیسے بچیں گے وہ فقیروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور میرے چالیسواں کے لئے اسی بکسے میں نیچے ایک تھیلے میں پیسے رکھے ہوئے ہیں وہ سارے پیسے چالیسویں میں خرچ کر دینا اور اس سے ایک پیسہ بھی زیادہ خرچ نہیں کرنا یہ میری سخت وصیت ہے— یہ پیسے پوری بستی کو کھانا کھلانے کے لئے کافی ہوں گی لیکن باہر سے تم لوگوں کو اپنے ان خاص لوگوں اور دوستوں کو بلانے کی اس میں گنجائش نہیں ہوگی جن کو بڑی تعداد میں تم لوگوں نے اپنے والد کے انتقال کے وقت بلایا تھا— یاد رہے کہ میری یہ وصیت کسی حال میں نہ توڑی جائے— اس کی کوئی خاص وجہ نہیں بس وجہ صرف یہ ہے کہ یہ تم لوگوں کی سزا ہے۔ میری جائداد میری اولاد برابر برابر بانٹ لے اور میرے مہر کے پیسے سے برگدوالی (پرانے برگد کے پیڑ کے قریب والے) جو زمین خریدی گئی تھی اس کی آمدنی میں مسجد میں چراغ جلانے کے لئے بھیجتی تھی، وہ جاتی رہے گی— میں نے ایک ایک کر کے ان تمام لوگوں سے اپنے قصور معاف کروا لئے ہیں جن کو میری زندگی میں کبھی بھی کوئی تکلیف پہنچی تھی پھر بھی لوگوں کو بتا دیا جائے کہ اگر مجھ سے کوئی بھول چوک ہوگئی ہو تو اسے معاف کر دیں— میں نے اپنے تمام بچوں اور بچیوں کا دودھ بخش دیا ہے اور میرے کسی بچے کی کسی بات سے اگر کبھی کوئی تکلیف پہنچی تو اسے بھی معاف

کر دیا ہے— میرے اوپر کسی کا کوئی قرض باقی نہیں ہے لیکن اگر کوئی کسی قرض کا ذکر کرے تو میرے زیورات میں سے کچھ زیور فروخت کر کے ادا کر دیا جائے اور باقی میری بہوؤں میں بانٹ دیا جائے کیونکہ ان میں سب نے کبھی نہ کبھی میری خدمت کی ہے— اور میرے کپڑے، فرنیچر اور برتن غریب غربا میں تقسیم کر دئے جائیں۔ نورالنساء۔

میت رکھی ہوئی تھی— جنازے کی تیاری چل رہی تھی— کفن کے لئے سب نے پیسے نکالے تھے لیکن بڑے بیٹے نے سب کو روک کر خود پیسہ دے دیا تھا اور ان کا چچا زاد بھائی کفن اور تدفین کے سامان لانے کے لئے جا چکا تھا اس کے ساتھ تیسرا بیٹا بھی گیا تھا— اسی بیچ اس لڑکے نے وہ کاغذ بڑے بیٹے کو دیا جس پر اس کی دادی نے وصیت لکھوائی تھی— بڑے بیٹے نے وصیت کو پورا پڑھا— دوسرے دیکھ رہے تھے اور جاننا چاہ رہے تھے— وصیت پڑھ کر ان کی خالی آنکھیں دیوار پر جا ٹکیں— بدن میں حرکت نہیں جیسے لکڑی ہو گئے ہوں— سب ان کا منھ دیکھ رہے تھے— انہوں نے وصیت اپنے سے چھوٹے بھائی کی طرف بڑھا دی— وصیت خاموشی کے ساتھ اور ہر ایک کو خاموش کرتی سارے بیٹوں کے ہاتھوں میں گردش کرتی ہوئی سب سے چھوٹے بیٹے کے ہاتھوں میں پہنچ گئی— اور وہیں جا کر ٹھہر گئی۔

مجھے ان کا یہ جملہ بے تحاشہ یاد آیا تھا کہ 'مجھے لگ رہا ہے کہ یہ میں خود جا رہی ہوں'

'جب اماں کا جنازہ مسجد کے سامنے سے اٹھ کر ادھر سے گزرے گا تو تم اس کی تصویر لینا "— میں نے ایک لڑکے کو کیمرہ دے کر ہدایت کر رکھی تھی— جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو ان کا بدن اتنا ہلکا محسوس ہوا کہ کندھے پر کسی شئے کے ہونے کا احساس تک نہیں ہوا— وہ اسی راستے چلی گئیں جس راستے پر اپنی عمر کے آخری حصوں میں جنازوں کو جاتے دیکھا کرتی تھیں۔

میں نے وہی تصویر یہاں لگا دی تھی— اور اس کے نیچے بھی وہی لکھ دیا تھا جو ان کی قبر کے کتبے پر لکھا گیا تھا۔ 1911 تا 2011۔ چونکہ تصویر سامنے تھی اور معلوم ہے کہ کس کی ہے اس لئے ہم نے مزید اختصار سے کام لیتے ہوئے تصویر پر ان کا نام نہیں لیا— ہم تو ان کو ان کے چہرے سے جانتے تھے— ان کے نام کا تو کبھی خیال ہی نہیں آتا تھا۔

قبرستان سے واپس آنے سے لے کر چالیسواں کے چند روز پہلے تک ہمیں کیا پریشانی ہوئی یہ میں بیان نہیں کر سکتا— میت کے دن تو جیسے تیسے وقت ٹل گیا کہ مہمانوں کو پڑوسی بلا لے گئے

تھے لیکن اتنے بڑے خاندان کے چالیسواں میں ان لوگوں کو نہ بلایا جائے جو بلائے جانے کی توقع رکھتے تھے یہ شرط پہاڑ کی طرح کھڑی ہوگئی تھی — ہماری سانسیں جیسے رک سی گئی تھیں۔

اس دن قبرستان سے واپس آنے اور میت میں شریک ہونے کے لئے آئے ہوئے عزیز واقارب سے فارغ ہونے کے بعد میں انگن میں جا کر ایک کنارے پڑے تخت پر ایک تکیہ اور چادر ڈال کر لیٹ گیا — میرا دل بہت اداس تھا۔ میں نے آسمان پر نظر ڈالی۔ کہکشاں آب وتاب سے ایک ابدی سڑک کی طرح دمک رہی تھی۔ اس کا وجود ایک لامتناہی کنارے سے ظاہر ہوا تھا اور ایک لامتناہی کنارے میں ختم ہورہا تھا۔

بشیر عالم کی باتیں سنتے سنتے مجھے اس تصویر میں کفن کے اندر ایک ایسی بوڑھی خاتون دکھائی دینے لگی جو سوسال کی زندگی گزار چکی تھی لیکن اب بھی پورے آب وتاب کے ساتھ زندہ تھی اور اپنے بچوں پر ماں جیسی حکمرانی کررہی تھی۔

میں نے بشیر عالم کو دیکھا جو اس داستان کو بیان کرتے کرتے خاتمہ کے قریب آ کر کسی قصوروار بچے کی طرح گھگیانے لگے تھے — انہوں نے بغیر کچھ بولے اٹھ کر ڈرائنگ روم کی ایک الماری کے پٹ کھولے اور سب سے اوپر کے خانے سے ایک پتلی سی کتاب جیسی چیز نکالی اور اسے لا کر سامنے بیٹھ گئے — اسے بوسہ دیا، کھولا اور اس کے اندر موجود دو تین صفحات پر ہتھیلی رکھتے ہوئے بولے — یہ میری ماں کی لکھوائی ہوئی وصیت ہے اسے سن کر آپ پوری بات سمجھ جائیں گے — یہ کہ کر وہ اس تحریر کو پڑھنے لگے اور پڑھنے سے پہلے بتایا:

اس کی اوریجنل کاپی میرے بڑے بھائی کے پاس ہے اور اس کی ایک ایک کاپی ہم سب بھائیوں کے پاس ہے — انہوں نے پوری تحریر پڑھ کر سنائی اور پڑھنے کے دوران ان پر کئی بار رقت طاری ہوگئی۔ پوری تحریر سنانے کے بعد بولے۔

ماں کی اس وصیت کو پڑھ کر ہم سب سناٹے میں آ گئے تھے — ہم ایک دوسرے سے آنکھ تک نہیں ملا پا رہے تھے۔ لیکن ابھی چالیسواں کے چند دن باقی تھے اور ہم سب اکٹھا ہو کر اسی مسئلے پر سوچ میں ڈوبے تھے کہ میرے سب سے چھوٹے بھائی پر سوچتے سوچتے دورہ سا پڑ گیا اور وہ کھڑا ہوا تو اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

وہ اچانک چیخ پڑا انہوں نے ایسی وصیت کر دی ہے تو کیا ہو گیا وہ ہمیں بچپن میں تھپڑ

نہیں مارا کرتی تھیں تو اس کے بعد کیا کرتی تھیں۔ وہ سب کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا اور اچانک ہم سب رو ہانسے ہو گئے اور ایک ساتھ اتنا روئے کہ زندگی میں اتنی ہچکیوں کے ساتھ کبھی نہیں روئے تھے — جب سب رو لئے تو میں نے وصیت کا کاغذ لیکر چہرے پر رکھا اور وہ میرے آنسوؤں سے بھیگ گیا — یہ انہیں آنسوؤں کے داغ ہیں۔

بشیر عالم نے وصیت کی کتابچہ گھما کر دکھائی۔ تحریر کی روشنائی بھیگ کر پھیل پھیل گئی تھی۔

ہم جیسے دوبارہ بچے بن گئے تھے اور ہم نے وصیت کی اس شرط کو زبردستی بھلا دیا۔ اور کاغذ کو سینت کر رکھ دیا لیکن وہ اب ایک ایسی دستاویز ہے جسے ہم اکثر نکال کر پڑھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ اس کو پڑھنے سے ہمارے ایمان پر گزرتے وقت سے پڑنے والا غبار صاف ہو جاتا ہے — اوپر سے یہ تصویر بھی ہمیں یاد دلاتی رہتی ہے کہ ہم کو اسی طرح ایک دن جانا ہے۔ اس تحریر اور اس تصویر کی وجہ سے ہمیں آج بھی لگتا ہے کہ ہماری تربیت دینے والی شفیق ماں اس گھر میں ہمہ وقت موجود ہیں اور ہمیں وقت تبدیل ہوتا ہوا تو دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے تسلسل کے ٹوٹنے پھوٹنے کا احساس نہیں ہوتا — رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ یہ کہانی ہمارے بچوں کو بھی معلوم ہو چکی ہے اور وہ اکثر ہم سے اپنی دادی کے متعلق کچھ نہ کچھ پوچھتے رہتے ہیں — اتفاق سے چالیسویں کے دن لوگوں کو اس وصیت کے بارے میں معلوم ہوا تو کچھ بزرگ اس بات پر بہت بہت ہنسے تھے۔

مجھے سنتے سنتے تصویر کو ایک بار پھر دیکھنے کا خیال آیا — تصویر کو دیکھتے ہوئے مجھے کچھ ایسے نظر آ رہا تھا جیسے کوئی ڈولی مسلسل سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی اور وقت دونوں طرف ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

☆☆☆☆

افواہ

ابرار مجیب (جھارکھنڈ، انڈیا)

میرے خلاف ایک نہ ایک افواہ جنم لے لیتی ہے اور چاروں طرف گشت کرنے لگتی ہے، یہ افواہیں کون پھیلاتا ہے، یا کون لوگ پھیلاتے ہیں مجھے نہ تو علم ہے اور نہ ہی اس کوئی اندازہ لگا سکتا ہوں۔ اپنے تعلق سے پھیلی ہوئی افواہ کا علم بھی مجھے کسی دوسرے کے ذریعہ ہوتا ہے، جب وہ شخص اس پھیلی ہوئی افواہ کے بارے میں مجھ سے تفتیش کرتا ہے کہ آخر ماجرا کیا ہے، یہ بات کیوں گشت کر رہی ہے۔ کیا وجہ تھی کہ میں نے یہ حرکت کی، اب اس حرکت کے ازالہ کی صورت کیا ہے یا میں اس غلطی سے عہدہ برآ کیسے ہوؤں گا وغیرہ وغیرہ۔ پہلے تو میں اس افواہ کے متعلق سن کر ہی ششدر رہ جاتا ہوں، جو بات میرے وہم و گمان میں نہ تھی وہ سارے شہر کو پتہ ہے، اوپر سے تابڑتوڑ سوالات، میں ان سوالات کا آخر کیا جواب دے سکتا ہوں؟ جب کہ اس قسم کی افواہ کا کسی بھی سطح پر میری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ابھی ہفتہ بھر پہلے کی بات ہے، شہر میں اچانک ایک پراسرار خاموشی رقص کرنے لگی۔ لوگ ایک دوسرے سے نظریں بچا کر گزر جاتے تھے، ایک دوسرے سے برائے نام گفتگو رہ گئی تھی، ایک عجب شک وشبہہ کا ماحول تھا۔ یہ ماحول بہت دھیرے دھیرے بنا تھا، اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں اسی سلسلے میں غلطاں وہ پیچاں تھا کہ ایک جاننے والے نے آکر کہا یہ شہر کا ماحول آپ کی وجہ سے خراب ہو رہا ہے۔ میری وجہ سے، میں حیران رہ گیا، آخر شہر کی پراسرار خاموشی اور شک وشبہہ کی فضا کو بنانے میں میرا کیا

ہاتھ ہوسکتا ہے۔ میں تو چپ چاپ گھر سے نکلتا ہوں، آفس جاتا ہوں، شام تک فائلوں میں سر کھپاتا ہوں اور واپس گھر آجاتا ہوں، ہاں کبھی سبزی یا پھل اور مٹھائی خریدنے کے لئے ادھر سے ہی بازار چلا جاتا ہوں۔ گھر آکر منہ ہاتھ دھوکر ایک پیالی چائے پیتا ہوں اور صبح کا اخبار اٹھا کر برآمدے میں رکھی کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اس دن جب میں برآمدے میں آکر بیٹھا، اسی وقت وہ شخص آگیا جس نے مجھے یہ خبر دی تھی کہ شہر میں پراسرار خاموشی کا سبب میں ہوں۔

''بھائی یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''جی ہاں۔'' اس نے میرے قریب کھسک کر مدھم لہجہ میں کہا۔ ''سب لوگ آپ ہی کے بارے میں بات کررہے ہیں۔''

''میرے بارے میں۔'' میں نے تعجب سے پوچھا۔ پھر بولا۔ ''بھائی اس معاملے سے میرا کیا تعلق ہے؟''

''لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے محلّہ سے جانے کا ارادہ کرلیا ہے، اور یہ بات آپ نے سب کے سامنے کہی تھی۔''

''ایک تو ایسا کچھ میں نے کہا نہیں، اگر کہا بھی ہے تو اس سے شہر کی پراسرار خاموشی کا کیا تعلق؟''

'''' یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، یعنی آپ کے اس فیصلے کا شہر کے ماحول سے کوئی تعلق ہی نہیں؟''

''بھائی محلے سے مکان خالی کرنے کے بارے میں، میں نے کبھی کوئی بات ہی نہیں کی۔ پتہ نہیں کون یہ افواہ پھیلا رہا ہے۔'' میں نے ناگواری کا اظہار کیا۔ ''دوسری بات یہ کہ اس سے شہر کے ماحول کا کیا تعلق؟''

''عجیب آدمی ہیں آپ بھی، ارے آپ کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی ہوشیار ہوگئے ہیں اور وہ بھی اپنا اپنا مکان خالی کرنے کے بارے میں سوچ رہے جو آپ کی طرح ان کے محلوں میں رہتے ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی، لوگ خواہ مخواہ مجھے بدنام کررہے ہیں۔''

''بدنام نہیں کر رہے ہیں ان کا خیال ہے کہ آپ کو اندر کی بات کا پتہ ہے کہ کیا ہونے والا ہے؟

اندر کی بات کا تو مجھے پتہ نہیں تھا لیکن اندر ہی اندر میں اضطراب کا شکار ضرور ہو گیا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ بات کسی سے نہیں کہی تھی، سامنے بیٹھے شخص پر مجھے بے انتہا غصہ آنے لگا، لیکن غصہ کو پیتے ہوئے میں نے سوچا اس شخص کا کیا قصور ہے، یہ تو مجھے پھیلی ہوئی افواہ کی جانکاری دے رہا ہے۔ میں نے تھوڑی دیر اور اس سے گفتگو کی اور چائے پلا کر اسے رخصت کر دیا۔ اس نے جو خبریں دی تھیں وہ خوف میں مبتلا کر دینے والی تھیں۔ اس نے بتایا کے میرے مکان خالی کرنے کے فیصلے کے دو دنوں کے بعد چوک پر ایک سمیلن ہوا تھا اور اس میں سادھو سنتوں کے علاوہ کچھ راج نیتا بھی شامل تھے۔ اس کے بعد دوسرے محلوں سے بھی لوگ اپنا بوریا بستر باندھنے لگے۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ میں نے مکان چھوڑنے کی بات بتانے کے باوجود ابھی تک اپنا مکان نہیں چھوڑا تھا جب کہ معاملہ اب بے حد نازک ہو چلا تھا۔ بہت دیر تک میں غور کرتا رہا کہ شاید میں نے مکان چھوڑنے کی بات کسی سے کہی ہو، لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آیا، یاد آتا بھی کیسے، آخر مکان خالی کرنے کوئی وجہ بھی تو ہوتی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں نے یہ بات کسی سے نہیں کہی تھی، اپنے گھر والوں سے بھی نہیں۔ میں کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا اور ایک سگرٹ سلگا کر پینے لگا۔ منہ سے نکلتے دھوئیں کے مرغولوں کو دیکھتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ ایک رات میں نے خواب میں دھوئیں کے گھنے بادل دیکھے تھے، یہ بادل زمین سے اٹھ رہے تھے اور گھنے دھوئیں کے غبار میں چہرے اور مکانات بے حد دھندلے نظر آ رہے تھے، اسی وقت میں سوچا تھا کہ یہ مکان خالی کر کے کسی محفوظ جگہہ پر چلا جاؤں۔ اب خواب میں کئے گئے ارادے کو کوئی دوسرا کیسے جان سکتا ہے؟ مجھے پورا یقین ہے میں نے اپنے خواب میں کئے گئے ارادے کا اظہار ہرگز ہرگز کسی سے نہیں کیا تھا۔

شہر کی اس عجیب صورت حال نے مجھے اندر سے بے حد پریشان کر دیا تھا، ایک ایسی بات جس سے میرا قطعی کوئی تعلق نہیں تھا پورے شہر کے لئے پریشانی کا باعث بن گئی تھی، میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس خطرناک صورت حال سے شہر کو باہر نکالنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے،؟ کیا

میں اعلان کر دوں کہ میں نے کبھی بھی محلے سے مکان خالی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا؟ لیکن اب اس اعلان کا کیا فائدہ؟ میرا نام تو اب ہزاروں قسم کی افواہوں کی گرد میں کہیں دب گیا تھا، لوگ متحرک ہو چکے تھے اور مختلف محلوں سے لوگوں کی مراجعت کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا، پھر کیا کیا جائے، بہت غور وخوض کے بعد مجھے ایک راستہ نظر آیا، کیوں نہ مقامی تھانے میں جا کر یہ بات بتادوں کہ شروع میں میرے تعلق سے جو خبریں پھیلائی گئی تھیں وہ محض افواہ تھیں اور یہ کہ میں اب بھی اسی محلے میں اپنے مکان میں بیوی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ یہ ایک بہتر آئیڈیا تھا۔ میں فوراً تھانے کے لئے روانہ ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟'' تھانیدار نے مشکوک نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا؟

''جی، اپنے بارے میں مجھے کچھ کہنا ہے۔'' مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کی شروعات کہاں سے کروں۔

'' کوئی رپورٹ لکھوانی ہے؟''

'' جی نہیں، بس میں اپنے بارے میں ایک حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔''

''حقیقت کا اظہار!'' تھانیدار نے غور سے میرا جائزہ لیا، پھر میز پر پڑے ہوئے ڈنڈے کو اٹھا کر ہاتھوں میں لیا اور اسے بڑے دھیان سے دیکھتے ہوئے اس نے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر اپنی ٹانگیں پھیلا دیں۔

''اچھا تو پھر؟'' اس نے ایک ہاتھ سے ڈنڈے کو گھماتے ہوئے پوچھا۔

''میرے بارے میں کچھ لوگوں نے غلط افواہ اڑا کر شہر کے ماحول کو خراب کر دیا ہے۔'' کسی تمہید کے بغیر میں نے کہا۔

''کون سی افواہ؟'' تھانیدار نے ڈنڈا میز پر رکھتے ہوئے مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

''یہی کے میں محلے سے مکان خالی کر رہا ہوں۔''

''کیا؟'' تھانیدار چونک گیا، پھر اس نے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے بہت لمبی ہوں کہی پھر گہری نظروں سے دیکھتا ہوا

بولا۔ ''کون سا محلّہ ہے؟''

میں نے محلے کا نام بتایا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر سخت لہجہ میں بولا۔ ''تم نے اب تک مکان خالی نہیں کیا؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب، میں بھلا مکان خالی کیوں کروں؟'' میں نے تعجب سے کہا۔

تھانے دار کچھ دیر تک مجھے گھورتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''دیکھو تمہارے بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ دوسرے محلے سے بھی لوگ اپنا اپنا مکان خالی کرنے لگے ہیں، حالات مسلسل بگڑ رہے ہیں، بلکہ بگڑ چکے ہیں جتنی جلد ہو سکے مکان خالی کر کے چلتے بنو۔''

اب تھانے دار سے کوئی توقع فضول تھی، میں جب تھانے سے باہر نکل رہا تھا تو تھانے دار نے انتہائی دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا کہ میں جتنی جلدی ممکن ہو مکان خالی کر دوں ورنہ وہ کچھ نہیں کر سکے گا، کچھ نہ کرنے کی دھمکی سے میں بخوبی آگاہ تھا، میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ سڑک پر آ گیا، باہر اندھیرا تھا، شاید لوڈ شیڈنگ، اوپر شہر کے مشرقی حصے میں آسمان سرخ ہو رہا تھا۔ اس شہر میں دفعتا ''پورا آسمان ہی سرخ ہو جاتا تھا، اس کی وجہ شاید وہ اسٹیل پلانٹ تھا جس کا پگھلا ہوا سلیگ راتوں میں ڈمپ کیا جاتا تھا۔ آسمان کے سرخ ہوتے ہی شہر میں گرمی بڑھ جاتی تھی اور لوگ پیاس محسوس کرنے لگتے تھے، مجھے بھی پیاس محسوس ہوئی لیکن آس پاس کوئی ریسٹورنٹ نہیں تھا

جہاں سے پانی لے کر پی لیتا، سوچا اب گھر پہنچ کر ہی پانی پی سکوں گا۔ اوپر بے شمار پرندے سرخ روشنی کے حصار میں قید پرچھائیوں کی صورت بے چینی سے پھڑ پھڑاتے نظر آ رہے تھے۔ یہ پرندے بھی روشنی کے عذاب میں مبتلا ہیں، ایک مسلسل سراب کی کیفیت، انہیں حیرت ہوتی ہوگی کہ اچانک اندھیری رات میں تیز روشنی کیسے پھیل جاتی ہے، یا صبح صادق کا منظر کیوں کر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہی اندھیری رات۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی، اس لئے میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر کی جانب بڑھنے لگا، اچانک مجھے احساس ہوا کہ چاروں طرف ایک عجیب سا سناٹا پھیلا ہوا ہے، سڑکوں پر ٹرافک نہ ہونے کے برابر تھی، لوگ بھی بہت

کم نظر آ رہے تھے، ہاں آوارہ کتے ادھر ادھر بھاگتے ضرور نظر آ رہے تھے۔ عام طور سے آوارہ کتے اتنے سویرے سڑکوں پر اودھم نہیں مچاتے تھے لیکن آج وقت سے پہلے چھا جانے والے سناٹے کی وجہ سے یہ بھی متحرک ہو گئے تھے، مجھے خیال آیا کہ کہیں کوئی ان میں سے اچانک مجھ پر حملہ آور نہ ہو جائے لیکن گھر تک پہنچتے پہنچتے ایسا کچھ نہیں ہوا، ایک دو بار ان کا غول مجھے چھو کر گزرا لیکن مجھ پر بھونکا نہیں۔

مکان کے دروازے کے سامنے کئی لوگ کھڑے ہوئے تھے، میرے اندر خوف کی ایک لہر دوڑ گئی، میں ان لوگوں کو نظر انداز کرتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا، اندر بیوی صوفے پر بیٹھی ٹی وی پر نیوز دیکھ رہی تھی، مجھے اندر آتا دیکھ اس نے میری طرف دیکھا، مجھے محسوس ہوا اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے تیر رہے ہیں۔ یوں بھی وہ اکثر خوف کی کیفیت میں مبتلا رہتی تھی اور اس کی وجہ تھی ہارر مووی اور خوفناک ناولوں سے اس کی دلچسپی۔ پچھلے مہینے کی بات ہے اس نے بہت ضد کر کے مجھ سے برام اسٹوکر کا ناول ڈرا یکولا منگوایا تھا، ناول پڑھنے کے دوران اگر کھڑکی ہوا کے جھونکے سے کھڑکھڑاتی تو اسے محسوس ہوتا کہ چمگادڑیں کھڑکی کے شیشہ پر سر پٹخ رہی ہیں، کئی بار اس نے مجھ سے کھڑکی مضبوطی سے بند کرنے اور پردوں کو ٹھیک سے برابر کرنے کے لئے کہا تھا، اس نے کئی دفعہ اس خوف کا اظہار بھی کیا تھا کہ کھڑکی یا دروازوں کی جھریوں سے دھوئیں کی شکل میں ڈرا یکولا اندر آ سکتا ہے، ایک بار وہ ایک دوڑتے ہوئے چوہے کو دیکھ کر بری طرح چیخ پڑی تھی، جب میں نے پوچھا کیا اسے چوہے سے بھی خوف محسوس ہوتا ہے تو اس نے بتایا نہیں دراصل ڈرا یکولا چوہے کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے، اس دن اس نے مجھ سے منت کی تھی کہ میں اسے لہسن کے پھول اور چرچ سے مقدس روٹیاں لا دوں۔ پہلے تو مجھے ہنسی آئی لیکن اس کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے مجھے لگا یہ چیزیں اس کی نفسیاتی گرہ کو کھولنے میں معاون ہوں گی۔ مقدس روٹیوں کا انتظام تو میرے ایک عیسائی دوست نے کر دیا لیکن سبزی مارکیٹ میں لہسن کے پھول کہیں نہیں ملے، گھر آ کر میں نے بیوی سے جھوٹ کہہ دیا کہ عیسائی پادری کا کہنا ہے کہ مقدس روٹی کے ساتھ اگر لہسن کے پھول نہ ہوں تو لہسن کو کچل کر کمرے میں ڈال دینا کافی ہوگا، دراصل ڈرا یکولا لہسن کی بو سے بھاگتا ہے خواہ وہ بو پھول سے آئے خواہ خود

لہسن سے۔اسے میری بات کی سچائی پر یقین آ گیا،اس نے لہسن کچل کر کمرے میں جگہہ جگہہ رکھ دیا،اس کی بو میرے لئے نا قابل برداشت تھی ، بلکہ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میں ہی دراصل ڈرا یکولا ہوں اور مجھے فوراً گھر چھوڑ کر بھاگ جانا چاہیئے ۔ان انتظامات سے میری بیوی بہت حد تک پرسکون ہوگئی تھی، لیکن ایک دن اس نے فرمائش کی کہ گھر میں ایک صلیب کا ہونا بھی ضروری ہے، میں بری طرح چونک پڑا، میں نے اسے سمجھایا لوگ کیا کہیں گے ہمارے گھر میں صلیب۔لیکن وہ بضد رہی ،اس نے کہا کہ ہمارا مقصد شیطان کو دور رکھنا ہے،اس کے علاوہ اور کچھ نہیں، خیر میں نے اسے ایک صلیب بھی لا کر دے دی تھی جسے اس نے کمرے کی دیوار پر ٹانگ دیا تھا۔ بہرحال ان دنوں میری بیوی بالکل نارمل تھی اور حالیہ دنوں میں نہ تو اس نے کوئی ہارر مووی دیکھی تھی اور نہ ہی کوئی ناول پڑھا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے ایسے ہی تھے جیسے اس کے ذہن میں تصوراتی ڈرا یکولا پھر سے زندہ ہو گیا ہو۔

''کیا بات ہے؟''میں نے بیوی کی بغل میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے سنا نہیں؟''اس کی آنکھوں کا خوف کچھ اور گہرا ہو گیا۔

''کیا نہیں سنا، صاف صاف بتاؤ۔'' مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی،ایک تو تھانے دار کے رویے کی وجہ سے میں پہلے ہی پریشان تھا اوپر سے یہ سسپنس پیدا کر رہی تھی۔

''وہ لوگ آئے ہوئے ہیں اور تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں، کیا باہر انہوں نے تم سے کچھ کہا نہیں۔''

بیوی نے اسرار برقرار رکھا اور میری جھنجھلاہٹ غصہ میں تبدیل ہونے لگی۔ میں نے یاد کیا باہر کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے، لیکن یہ لوگ مجھ سے ملنے آئے ہیں یہ بات میرے لئے تعجب خیز تھی، اور اگر وہ ملنے آئے تھے تو انہوں نے مجھ سے کچھ کہا کیوں نہیں،شاید میں بہت تیزی سے اندر آ گیا تھا اور انہیں کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا یا وہ چاہتے تھے کہ پہلے میں گھر کے اندر جا کر بیوی سے گفتگو کر لوں، پتہ نہیں۔

''تم بتا دو، کیا بات ہے؟''میں نے غصہ کو دباتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بغیر سر والا ، ادھر محلے کے جنوبی حصے میں، بغیر سر والا دوڑ رہا تھا اور اس کی گردن

سے خون کے فوارے ابل رہے تھے۔'' میری بیوی تھوک نگلتی ہوئی بے حد خوفزدہ آواز میں بولی۔
'' کچھ دیر دوڑنے کے بعد وہ گر گیا، یہ لوگ جو ہمارے دروازے پر کھڑے ہیں اسے جھنڈے میں لپیٹ کر لے جانے کے لئے آئے ہیں، انہوں نے بتایا مجھے، کچھ لوگ سر کی تلاش بھی کر رہے ہیں۔'' بولتے بولتے اس کی سانسیں ناہموار ہوگئیں۔

'' کیا۔'' میری چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

ہڑ بڑا کر کر میں باہر آ گیا، وہ لوگ ابھی تک موجود تھے، ان میں سے ایک آگے بڑھ کر میرے قریب آ گیا اور پھسپھسا تی ہوئی آواز میں بولا۔'' آپ ابھی تک یہیں پر ہیں، آپ کو تو سب سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہئے تھا، آپ کو تو صورت حال سے آگاہی تھی۔''

'' کون سی صورت حال؟'' میں نے غصہ میں پوچھا۔

'' محلے کے جنوبی حصے کا واقعہ آپ کو پتہ ہے؟''

'' ابھی میری بیوی نے بتایا ہے۔''

'' پھر؟''

'' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔'' میں نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

'' دیکھئے بھائی ہم نے اسے جھنڈے میں لپیٹ لیا ہے۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ آپ سے سختی سے کہہ دیا جائے کہ آپ مکان خالی کر دیں ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بار بار ہم جھنڈے لے کر آنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتے۔''

کچھ دیر تک وہ لوگ آپس میں گفتگو کرتے رہے پھر مجھے اشارہ کر کے چلے گئے۔ میں سخت تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ حالات واقعی قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ بغیر سر والے کے دوڑنے کا واقعہ انتہائی خطرناک تھا، میری بیوی بے حد خوفزدہ ہو چکی تھی اور مجھے اس طرح دیکھ رہی تھی کہ میں کوئی فیصلہ لینے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ میں نے انتہائی ٹھنڈے دل سے صورت حال پر غور کرنا شروع کیا، محلے کے جنوبی حصے میں جو واقعہ پیش آیا تھا اس کے بعد صورت حال کے مزید خراب ہونے کا اندیشہ تھا اور یہ جھنڈے کا استعمال تو بے حد خوفناک تھا۔ بیوی کا خیال تھا کہ ہمیں جلد از جلد مکان خالی کر دینا چاہئے اور یہ لوگ جس جگہ لے جانا چاہتے ہیں وہاں چلے جانا

چاہیئے۔موجودہ منظر نامے میں مکان خالی کردینا مجھے بھی مناسب لگ رہا تھا لیکن جہاں جانے کے لئے کہا جارہا تھا اس جگہہ کے بارے میں، میں مشکوک تھا۔ بیوی نے کہا چل کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے، بہرحال میں نے مکان خالی کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

وہاں عبادت گاہ کے سامنے ایک بہت بڑا میدان تھا، جس میں ٹینٹ لگائے گئے تھے، ہمیں بھی ایک ٹینٹ دے دیا گیا۔مختلف محلوں سے آکر لوگ یہاں ٹینٹوں میں جمع ہوگئے تھے۔ عبادت گاہ میں وقت کے مطابق عبادت جاری تھی اور جھنڈوں میں لپٹے لوگوں کو لاکر چبوترے پر رکھنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ پھر انہیں وہاں سے ایک ہجوم چوک پر لے جاتا، نعرے لگتے، عہد و پیمان ہوتے اور انہیں جھنڈے سمیت گاڑ دیا جاتا۔

ایک صبح میری چارپائی کے گرد لوگوں کا ہجوم جمع تھا، میں بے حد حیران ہوا کہ ماجرا کیا ہے، ٹینٹ کے ایک کونے میں میری بیوی زور زور سے رو رہی تھی اور کچھ عورتیں اسے سنبھالنے میں لگی تھیں۔ چارپائی کے ارد گرد کھڑے لوگ میری موت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، ساری سازش میری سمجھ میں آگئی راتوں رات کچھ لوگوں نے میری موت کی افواہ پھیلا دی تھی۔ مجھے اسی لئے یہ علاقہ مشکوک لگ رہا تھا اور میں یہاں آنا نہیں چاہتا تھا، میرا شک سو فیصد درست ثابت ہوا۔ چارپائی کے گرد کھڑے لوگ کہہ رہے تھے کہ اگر میں مکان پہلے ہی خالی کر دیتا تو آج زندہ ہوتا، انہیں مجھے جھنڈا میں لپیٹنا نہیں پڑتا، لیکن ہونی کو بھلا کون ٹال سکتا ہے۔ میں اندر ہی اندر غصے سے کانپ رہا تھا، میں چیخ چیخ کر کہنا چاہ رہا تھا کہ میری موت کی خبر افواہ ہے، میں زندہ ہوں لیکن میری آواز شاید بے انتہا غصہ کی وجہہ سے باہر نہیں نکل رہی تھی اور چارپائی کے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگ بھی میری طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد کچھ لوگوں نے مجھے نہلانا شروع کیا، نہلا کر مجھے سر سے لے کر پیر تک جھنڈے میں لپیٹ دیا گیا، پھر عبادت گاہ کے چبوترے پر رکھ کر سب لوگ عبادت میں مصروف ہوگئے۔عبادت سے فراغت پاکر ان لوگوں نے مجھے اٹھالیا، کسی نے زور سے کہا اسے چوک پر لے جاکر رکھا جائے، کسی دوسرے نے سوال کیا اسے کیوں؟ کئی آوازیں ابھریں ارے ہمیں دکھانا ہے کہ ہم ایسی باتوں سے نہیں گھبراتے۔ مجھے لے کر وہ چوک پر پہنچ گئے اور جھنڈے میں

لپٹے میرے وجود کو ایک اونچے چبوترے پر رکھ دیا گیا۔

جھنڈے میں لپٹا میں، سمجھ نہیں پا رہا ہوں کی اپنی موت کی افواہ کا سدباب کیوں کر کروں؟

☆☆☆☆

پورٹریٹ

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد (مونگیر، بہار، انڈیا)

آبادی سے تھوڑی دور ہٹ کر جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اسے گھنے جنگلوں سے خوف آتا۔ رام دین مالی کا لڑکا جو اس سے عمر میں چند سال بڑا تھا اسے لے کر جنگل کی سمت نکل جاتا۔ جہاں تک جنگل چھدرا رہتا اور سورج کی روشنی دکھائی دیتی اسے بڑا لطف آتا مگر جیسے ہی اندھیرا سروں پر چھانے لگتا وہ گھبرا کر کہتا۔

''سکھو! اب گھر چلو۔'' سکھو کو اس کی گھبراہٹ پر ہنسی آجاتی۔ وہ اور اندر جانا چاہتا مگر صاحب کے ڈر سے لوٹ جاتا۔

گذرتے وقت کی دھند ہر شے پر چھاتی جا رہی تھی۔ یادیں مٹ میلی ہو گئی تھیں۔ اسے لگتا جیسے درخت بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے تنے کھوکھلے ہو گئے ہیں اور وہ کسی تیز آندھی کے منتظر ہیں۔ وہ بہت ساری باتوں کو بھول چکا تھا اور بہت ساری جگہیں اور شکلیں بھی اس کے حافظے سے نکل چکی تھیں حتیٰ کہ اسے اپنے باپ کی شکل بھی بالکل یاد نہ رہی تھی کہ اسے گذرے ہوئے چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اس کا بڑا لڑکا اس سانحے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ ان دنوں وہ اپنی پہلی پوسٹنگ پر اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ کسی دور دراز کے شہر میں مقیم تھا۔ اس زمانے میں ٹیلی فون کی سہولت عام نہیں ہوئی تھی اور کسی کی پیدائش یا موت کی خبر دینے کے لئے ٹیلی گرام مقبول عام ذریعہ تھا۔ لیکن کبھی کبھی ٹیلی گرام بھی دیر سے پہنچتا۔ چنانچہ اس خبر کے ملنے کے

بعد جب وہ گھر گیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے باپ کو سپرد خاک کیا جا چکا ہے اور اس طرح وہ اس کے آخری دیدار سے محروم رہا تھا جس کا قلق اسے اب تک تھا۔ البتہ اس کی بڑی بہن جو قریب کے شہر میں بیاہی گئی تھی اپنے شوہر کے ہمراہ وقت پر پہنچ گئی تھی۔ چہلم کے بعد اس کی بہن اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی تھی اور وہ ماں کو اپنے ساتھ شہر لے آیا تھا۔ قصبے کے مکان میں تالا پڑ گیا۔

کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ اس کے دماغ میں کوئی جنگل اُگ آیا ہے جہاں اونچے گھنے پیڑ آپس میں جڑے کھڑے ہیں اور سورج کی روشنی ان کے بڑے بڑے پتوں سے ٹکرا کر وہیں رک جاتی ہے۔ نیچے گہرا اندھیرا ہے۔ وہ سوتے میں چونک اٹھتا۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کے قطرے محسوس ہوتے۔ وہ سات بار لاحول پڑھ کر دوبارا سونے کی کوشش کرتا۔ عموماً اسے نیند آ جاتی مگر تھوڑی ہی دیر بعد پھر اچٹ جاتی۔ بڑھاپے کی نیند کچے گھڑے کی مانند ہوتی ہے

اسے اپنی عمر بھی ٹھیک ٹھاک یاد نہیں رہی تھی۔ کبھی اسے لگتا کہ وہ ستر کا ہو چکا ہے مگر واقعات کے جوڑ گھٹاؤ میں اسے اپنی عمر پچھتر کی معلوم ہوتی۔ بالکنی میں آرام کرسی پر بوڑھی ہڈیوں کو دھوپ دکھلاتے وقت جب وہ انگلیوں پر حساب لگا رہا ہوتا تو اس کی بیوی کو شک ہوتا کہ اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ وہ اس کی جانب سے فکر مند رہنے لگی تھی۔ مگر درحقیقت ایسی بات نہیں تھی۔ وہ پابندی سے اخبار پڑھتا اور ٹی۔وی پر خبریں سنتا۔ اسے لگتا جیسے دنیا بہت بدل گئی ہے۔ پچھلی دفعہ جب اس کا لڑکا اس سے ملنے آیا تھا تو وہ اس کے لئے ایک موبائل لیتا آیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس بدلی ہوئی دنیا کا موازنہ اپنی دنیا سے کرتا تو اسے عجیب سا محسوس ہوتا۔ اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ اس کے انتقال کی خبر اس کے بیٹے کو چند منٹوں میں ہو جائے گی۔

گھنے جنگلوں میں جب کبھی زور کی ہوا چلتی ہے تو درختوں کے پتے شور مچاتے ہوئے چند لمحوں کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سورج کی روشنی بلا روک ٹوک زمین تک پہنچ جاتی ہے۔ تنہائی کی چادر اوڑھ کر اونگھتے ہوئے اچانک اس کے ذہن میں جھکڑ چلنے لگتے اور بہت ساری یادیں روشنی سے جگمگا اٹھتیں۔ مگر اسے یہ بالکل یاد نہ رہا تھا کہ اس کے باپ کی شکل وصورت کیسی تھی؟ ہاں! بچپن سے لے کر جوانی کے دنوں تک کی بہت ساری باتیں جن کا تعلق اس کے باپ سے تھا، اسے یاد تھیں۔

ایک چھوٹے سے قصبے میں اس کا بڑا سا آبائی مکان تھا۔ سڑک کی جانب گول ستونوں سے گھرا ایک طویل برآمدہ۔ اس کے بعد کشادہ ڈرائنگ روم۔ اندر تین طرف دالان، درمیان میں آنگن اور آنگن سے ایک دروازہ گلی میں کھلتا ہوا۔ دالان سے ملحق چھ رہائشی کمرے اور سب سے آخر میں اسٹور روم۔ اس کے باپ کو پرانی چیزیں ترتیب اور قرینے سے رکھنے کا شوق تھا۔ اکثر اس کی ماں کسی بیکار شے کو پھینکنا چاہتی تو اس کا باپ اسے اسٹور روم میں رکھنے کا مشورہ دیتا اور کہتا کہ داشتہ آید بکار۔ اس کی ماں اس محاورے سے چڑ جاتی حالانکہ اس کا باپ نہایت شریف آدمی تھا اور کسی نامحرم کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ اس آبائی مکان میں اس کا باپ اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد آ کر رہا تھا۔ زندگی کے بیشتر ایام کوارٹروں میں گذرے تھے۔ اس کا باپ بیک وقت شفیق بھی تھا اور سخت گیر بھی۔ اسے یاد تھا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھایا کرتا تھا اور اس کا باپ اپنی پلیٹ سے کوئی چیز مثلاً گوشت کی کوئی اچھی بوٹی یا کوئی میٹھی شے اس کی پلیٹ میں ڈال دیا کرتا تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس کا باپ ہی اسے نہلاتا تھا اور اگر نہانے کے دوران وہ کوئی شرارت کرتا تو اس کے باپ کا بے رحم طمانچہ اس کے گال پر پڑتا۔ اس نے جب اسکول جانا شروع کیا تو اس کا باپ اسے خود سے پڑھانے لگا اور پڑھاتے وقت ایک لمبی چھڑی اپنے پاس رکھتا۔

اسے اپنے باپ کے بہت سارے دوستوں کے دھندلے دھندلے چہرے اب بھی یاد تھے۔ بعض کی وضع قطع بھی یاد تھی۔ یادوں کے خزانے میں پھندنے والی سرخ ٹوپی بھی تھی اور بغیر چھت کی کار بھی۔ اور وہ رجسٹری آفس بھی جہاں سے اس کا باپ ریٹائر ہوا تھا۔ وکٹورین طرز کی سرخ عمارت، گول ستونوں سے گھرا ہوا طویل برآمدہ، بڑے بڑے دروازے جن کے پٹ روشن دانوں کی مانند کھلتے اور بند ہوتے اور ان کے اوپر سبز رنگ کی چق۔ ایک بڑا سا ہال۔ اجلاس، کٹہرے اور بنچیں۔ سامنے کھلا میدان اور میدان کے درمیان میں یونین جیک لہراتا ہوا۔ جب اجلاس ختم ہو جاتا تو وہ سکھو کے ساتھ برآمدے میں کھیلتا۔ کبھی کبھی اس کی بڑی بہن اسے تلاش کرتی ہوئی آتی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتی۔ اکثر وہ سکھو کے ساتھ مالی کے چھوٹے سے کوارٹر میں چلا جاتا جہاں سکھو کی ماں اسے گرم گرم لٹی کھلاتی۔ ایک دفعہ اس کی بہن نے یہ بات باپ کو بتا دی تھی۔ اس روز اسے کافی مار پڑی تھی اور مار کھانے کے دوران اس سے پیشاب خطا ہو گیا تھا۔

ان ہی دنوں اسے اپنے آس پاس کسی بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے جنگلوں میں چھپے بہت سارے سانپ، بچھو، شیر اور چیتے، بھالو اور بندر زمین پر چاروں طرف پھیل گئے ہیں۔ ان دنوں اس کا باپ بہت فکر مند نظر آتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی ماں کو کہتے سنا۔

''سب لوگ چلے جا رہے ہیں۔ آپ کے بڑے بھیا بھی بیوی بچوں کو لے کر چلے گئے۔ کیوں نہ ہم لوگ بھی.........''

''ہرگز نہیں۔'' اس کے باپ کی کرخت آواز گونجی تھی اور پھر خاموشی چھا گئی تھی۔

اور پھر پتہ نہیں کہاں سے آدمیوں کا جنگل اُمڈ آیا تھا۔ روتے بلکتے، ننگے بھوکے لوگ پوری کچہری اور پورے میدان میں بھر گئے تھے۔ لاریاں بھر بھر کر آتیں اور آدمیوں کا جنگل گھنا ہوتا جاتا۔ وہ لوگ اپنے کوارٹر تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

پھر جیسے کئی دنوں تک چھائے رہنے کے بعد جب بادل اور کہاسا ختم ہو کر سورج نظر آنے لگتا ہے اور منجمد زندگی میں حرارت پیدا ہونے لگتی ہے اسی طرح دھیرے دھیرے وہ سارے لوگ ان کے ساز و سامان، لاریاں اور خاکی وردیاں سب دھیرے دھیرے غائب ہو گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ سرخ پھندنے والی گول ٹوپی اور بغیر چھت کی کار بھی۔ اور یونین جیک کی جگہ ترنگا لہرانے لگا تھا۔ ان دنوں اس کی عمر تیرہ سال کی تھی۔

اس کے ایک سال بعد کی سردیوں میں اس کا باپ ریٹائر ہو گیا۔ اس بڑے میدان میں ایک گروپ فوٹو گرافی ہوئی تھی۔ اس کا باپ سوٹ پہنے درمیان کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ دائیں بائیں آفس کے دوسرے لوگ۔ پچھلی صف میں ڈرائیور، خاکروب، مالی، چپراسی اور اور آس پاس کے لوگ۔ بقیہ کرسی پر کچہری کے اسٹاف اور زمین پر ان کے افراد خانہ۔ اپنے باپ کے قریب وہ اور اس کی بڑی بہن بیٹھے تھے۔ اس کے باپ کے گلے میں گیندے کے پھولوں کا ہار ڈالا گیا تھا جسے اس کے باپ نے اس کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ ایک بڑے اسٹینڈ پر کیمرہ رکھا ہوا تھا اور فوٹو گرافر نے اپنے سر پر کالی چادر ڈال کر تصویر اتاری تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب اس کا باپ اپنے آبائی مکان لوٹا تو اس تصویر کو فریم کروا کے ڈرائنگ روم میں لگا دیا گیا۔ عرصے تک وہ تصویر ڈرائنگ روم

میں لگی رہی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیسے وہ تصویر ڈرائنگ روم سے ہٹ گئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ جس وقت اس کی بڑی بہن کی شادی ہورہی تھی اور گھر میں سفیدی پھیری جارہی تھی اس وقت وہ تصویر اسٹور روم میں رکھ دی گئی ہو۔

اس کے باپ کی پنشن قلیل تھی اور اس مکان کے علاوہ اس کے پاس کوئی جائداد بھی نہ تھی۔ جب وہ پہلی بار میٹرک میں فیل ہوگیا تو اس کے باپ نے اسے مارا تو نہیں مگر غصے میں تھرتھراتے ہوئے یہ ضرور کہا تھا کہ اگر اگلے سال بھی وہ فیل ہوگیا تو وہ اسے ننگا کرکے گھر سے باہر نکال دے گا مگر اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس نے وہ سارا سال پڑھنے میں گذار دیا تھا۔ اگلے سال وہ پاس ہوگیا اور آگے کی تعلیم کے لئے اس کا داخلہ شہر کے کالج میں کروا دیا گیا۔

کبھی کبھی کسی نیوز چینل کی تلاش میں ریموٹ کنٹرول کا بٹن دباتے وقت اسے عجیب بے ہنگم کپڑوں میں ملبوس اچھلتے کودتے طالب علم نظر آتے تو اسے لگتا جیسے واقعی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ لیکن جب اسے خبروں کے درمیان خون کے دھبے اور دھوئیں کے بادل دکھائی دیتے تو محسوس ہوتا کہ کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ وہ اکتا کر ٹی وی آف کردیتا اور کتابوں سے دل بہلانے لگتا۔ ایک دن کی کتابوں کی الماری سے ایک ناول نکل آیا Portrait of a lady۔ یہ ناول وہ کئی بار پڑھ چکا تھا مگر آج اس کے عنوان کو دیکھ کر ایک بھولی بسری یاد اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں روشن ہوگئی۔ جن دنوں وہ بی اے کا امتحان دے کر گھر آیا تھا ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جس شہر سے اس کا باپ ریٹائر ہوا تھا وہاں ایک شخص کے گھر میں آگ لگ گئی اور دوسری اشیا کے ساتھ مالک مکان رام اودھیش سنگھ کے ضروری کاغذات بھی جل گئے۔ ان کاغذات میں اس کے مکان کا قبالہ بھی تھا۔ اس کی رجسٹری اس کے باپ ہی نے کی تھی۔ وہ پریشان حال اس کے باپ کے پاس آیا۔ اس کا باپ فوراً اس کی مدد کو تیار ہوگیا۔ دونوں اس رجسٹری آفس میں گئے اور وہاں اس کے باپ نے اپنے اثر ورسوخ کی بدولت قبالے کی نقل بہت جلد اسے دلوادی۔ رام اودھیش سنگھ اس مہربانی سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے بہت سارے تحفے تحائف دینے کے ساتھ یہ بھی کیا کہ اپنے بیٹے سے جو کہ ایک پینٹر تھا اس کے باپ کا ایک قد آدم پورٹریٹ بنوا دیا اور پھر وہ پورٹریٹ گھر کے ڈرائنگ روم کی زینت بن گیا تھا۔

باپ کے انتقال کے بعد وہ اپنی ماں کو شہر لے آیا تھا اور قصبے کے مکان میں تالا پڑ گیا تھا۔ اس کی ماں کو جب کبھی اپنے گھر کی یاد ستاتی وہ اسے لے کر چند دنوں کے لئے وہاں چلا جاتا۔ اس طرح کئی سال گذر گئے۔ اس دوران بہت سی اچھی اور بری باتیں ہوئیں۔ اس کی ماں اور بڑی بہن کا انتقال ہو گیا اور اس کی بیوی نے تین بچوں کو جنم دیا۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں۔ اس کی ترقی ہوئی اور وہ اعلیٰ عہدے پر فائز ہوا۔ بیوی کہتی کہ قصبے کا مکان فروخت کر دیا جائے۔ اس کا بھی یہی ارادہ تھا مگر پیشے کی ذمہ داریاں اسے مہلت نہ دیتی تھیں۔ پھر بھی سال دو سال پر وہ گھر چلا جاتا اور ہر بار گھر کا کوئی نہ کوئی حصہ مخدوش پاتا۔ وہ اس کی مرمت کروا کر واپس چلا آتا۔ اس نے یہ بھی چاہا کہ کوئی کرایہ دار مل جائے تاکہ مکان کی دیکھ بھال ہوتی رہے مگر اس چھوٹے سے قصبے میں جہاں زندگی جوہڑ کے پانی کی طرح ٹھہری ہوئی تھی اسے اس مقصد کیلئے کوئی نہ مل سکا۔ تب اس نے یہ چاہا کہ کوئی یونہی رہنے کو تیار ہو جائے اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔ قصبے کا ایک شخص اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اس مکان میں رہنے کو تیار ہو گیا۔ اب وہ اس جانب سے بالکل بے فکر ہو گیا تھا اور کئی کئی برسوں تک وہاں جانے کی ضرورت محسوس نہ کرتا مگر مکان کی دیکھ بھال اور مرمت کے لئے ہر سال ایک معقول رقم اس شخص کو بھیج دیا کرتا۔

ان دنوں وہ سرحدی علاقے میں تعینات تھا جہاں چاروں اطراف گھنے جنگل تھے اور پھر ان جنگلوں سے چھن کر آتی ہوئی خون اور بارود کی بو نے اسے اپنے باپ کی یاد دلا دی تھی۔ ایک بار پھر آدمیوں کا جنگل اگ آیا تھا۔ روتے بلکتے ننگے بھوکے لوگ.... چھولداریاں..... لاریاں.... بوٹوں کی دھمک.... آنے والوں میں سے کسی نے بتایا کہ اس کے چچا مع اہل وعیال شہید کر دئے گئے۔ اس نے یہ خبر صبر وسکون کے ساتھ سنی لیکن کئی دنوں تک اسے ٹھیک طور پر نیند نہ آسکی تھی۔ پھر جب اس کی نوکری اسے شہر در شہر گھماتی اس شہر میں لے آئی تھی جہاں سے اسے سبکدوش ہونا تھا تو اس نے وہاں ایک بڑا سا فلیٹ خرید لیا تھا۔ لڑکا تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملک سے باہر چلا گیا تھا اور لڑکیوں کی شادی ہو چکی تھی۔

شام کے وقت ہر روز تو نہیں مگر اکثر وہ سامنے والے پارک میں ٹہلنے کے لئے چلا جاتا۔ جہاں اسے چند اور بوڑھے مل جاتے۔ وہ لوگ کسی بنچ پر بیٹھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے۔ ان کے پاس کہنے کو کچھ زیادہ نہیں ہوتا چنانچہ ان کے منہ سے الفاظ کم نکلتے اور خاموشی کا جنگل پھیلتا جاتا۔

ایک دن اسے ایک بوڑھا جس کا نام اسے معلوم نہ تھا بہت خوش نظر آ رہا تھا اور خلاف معمول لگاتار بولتا جا رہا تھا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ لگانا دشوار نہ تھا کہ وہ اپنے آبائی مکان میں چند روز گذار کر آیا ہے جس کی وجہ سے اس کی طبیعت میں بشاشت آ گئی ہے۔ پارک سے لوٹنے کے بعد اسے بھی اپنے آبائی مکان کے یاد بری طرح ستانے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے اپنے باپ کی یاد بھی آنے لگی مگر عجیب بات تھی کہ اسے اپنے باپ کی شکل اب بھی یاد نہیں آ رہی تھی۔ اس کے دل میں گھر جانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی مگر وہاں جانے کا کوئی بہانہ نہ سوجھتا تھا۔ دل کے بہلانے کو اس نے پرانے البم تلاش کئے اور ایک ایک البم کو دیکھ لیا مگر کسی میں بھی اس کے باپ کی تصویر نہ تھی۔ نہ ریٹائرمنٹ سے پہلے کی نہ ریٹائرمنٹ کے بعد کی۔ اس کی بیوی نے دریافت بھی کیا کہ آخر اسے کس چیز کی تلاش ہے مگر وہ ٹال گیا۔

ایک دن حسب معمول دن کے دو بجے وہ کھانا کھانے کے بعد آرام کر رہا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے ایک ادھیڑ عمر کے اجنبی کو پایا۔ اس نے بتایا کہ وہ قصبے سے آ رہا ہے۔ اب وہ قصبہ دھیرے دھیرے شہر میں تبدیل ہو رہا ہے اور ایک نئی فیکٹری کے سنگ بنیاد کے ساتھ ہی زمین کی قیمت بڑھنے لگی ہے اور نئے نئے لوگ وہاں بسنے کے لئے آ رہے ہیں۔ اگر وہ اپنا آبائی مکان فروخت کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے خریدنے کے لئے تیار ہے۔ اس دوران اس کی بیوی بھی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے نووارد سے کہا کہ اس کا آفر انہیں قبول ہے اور وہ لوگ جلد ہی اس مکان کو فروخت کرنا چاہیں گے۔ مکان کے تذکرے کے ساتھ ہی اسے اپنے باپ کا پورٹریٹ یاد آ گیا اور اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ اسے لیتا آئے گا اور یہاں ڈرائنگ روم میں آویزاں کر دے گا۔

دس روز بعد وہاں جانے کا پروگرام بنا جس کی اطلاع اس نے نووارد کے ذریعہ نگراں کو بھیج دی۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی کہ اگر کوئی کام کی چیز بچی ہو تو اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ اس نے اپنے بہنوئی کو فون کر کے صورت حال بتائی۔ اس کے بہنوئی نے کہا کہ وہ جو مناسب سمجھے کرے۔ جس روز وہ گھر کے لئے روانہ ہوا اسے راستے بھر اپنے باپ کی یاد آتی رہی۔ گاڑی جب اس کے شہر پہنچی تو شام ہو رہی تھی اور آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے

جس سے فضا نیم تاریک ہوگئی تھی۔ گھر کا نگراں ان لوگوں کا منتظر تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی اور بچے اب اس کے پاس نہیں رہتے تھے۔ اس نے ڈرائنگ روم کو صاف ستھرا پایا۔ نگراں نے بتایا کہ وہ اسی کمرے میں رہتا ہے۔ بقیہ کمرے بند رہتے ہیں مگر ان لوگوں کی آمد پر اس نے بیڈ روم صاف کروا دیا ہے۔ وہ اس کی باتیں بے دھیانی کے ساتھ سن رہا تھا اور اس کی نگاہیں دیواروں کا طواف کر رہی تھیں۔ پھر وہ بیڈ روم میں گیا۔ وہاں مسہری پر دھلی ہوئی چادر بچھی تھی اور تکیئے لگے تھے۔ اس اثنا میں رات گھر آئی۔ اس کی بیوی نے اسے مشورہ دیا کہ چونکہ وہ لوگ سفر کے تھکے ماندے ہیں لہٰذا انہیں رات کا کھانا کھا کر جلد سو جانا چاہئے۔ جگہ اجنبی تو نہیں تھی مگر اسے دیر رات گئے تک نیند نہیں آئی۔ رات کے پچھلے پہر زوروں کی بارش ہوئی اور وہ اندھیرے کمرے میں آنکھیں پھاڑے بجلی کی چمک اور گرج سنتا رہا تھا۔ اس کی بیوی گہری نیند سوئی تھی۔

دوسری صبح دونوں نے پورے گھر کا جائزہ لیا۔ عقبی حصے میں جہاں اس کے باپ کے وقتوں میں سبزیاں اُگائی جاتی تھیں، وہاں ایک بے ترتیب جنگل اُگ آیا تھا۔ نگراں نے بتایا کہ چونکہ وہ اکیلا ہے اور اس عمر میں جسمانی مشقت سے گریزاں ہے اس لئے اس نے سبزیاں اُگانی چھوڑ دی ہیں۔ اس کی بیوی نگراں سے باتوں میں مشغول ہوگئی۔ اسے ان دنوں کی گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے وہ اسٹور روم کی جانب بڑھ گیا۔ حالانکہ اسے ایسی کوئی جلدی نہیں تھی مگر وہ اس پورٹریٹ کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ صحیح سلامت ہے کہ نہیں۔ اسٹور روم کا دروازہ بند تھا مگر اس میں تالا نہیں تھا۔ اس نے کواڑوں کو دھکا دیا تو وہ ایک دھیمی کراہ کے ساتھ کھل گئے۔ اندر اندھیرا تھا اور سارے میں ایک ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا اور اندھیرے کمرے میں آنکھیں جمانے کی کوشش کرنے لگا۔ جب اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوگئیں تو اس نے اسٹور روم کا جائزہ لیا۔ وہاں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، ٹیبل، مٹی کے گھڑے، لوہے کے بکسے، لکڑی کی ایک بڑی الماری اور جانے کیا کیا بھرا تھا۔ آخر اس کی متلاشی نگاہوں کو ایک کونے میں رکھا وہ آدم قد پورٹریٹ نظر آ ہی گیا۔ پورٹریٹ پر گرد جمی تھی اور اس کے خد و خال نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے بدقت تمام کمرے کی کھڑکی کھولی جو عام روشن دان

سے ذرا سی بڑی تھی اور قدرے اونچائی پر تھی۔ کمرہ کچھ روشن ہوا۔ پورٹریٹ دیوار کے سہارے زمین پر کھڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تو ایسا تھا اس کا باپ۔ سر پر ہلکے سفید بال، چوڑی پیشانی، گھنی گھنی بھنویں، بھاری پپوٹے، ستواں ناک، پتلے ہونٹ اور دوہرے جبڑے۔ وہ کافی دیر تک بغیر پلک جھپکائے اسے دیکھتا رہا۔ اچانک کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ وہ چونک کر مڑا۔ دروازے پر اس کی بیوی کھڑی حیرت سے اسے تکے جا رہی تھی۔ جب اس نے اپنی بیوی کی جانب نگاہ اٹھائی تو اس نے پوچھا۔

''آپ اتنی دیر سے آئینے کے سامنے کیوں کھڑے ہیں؟''

☆☆☆☆

سمندر جہاز اور میں

ڈاکٹر افشاں ملک (علیگڑھ، انڈیا)

ابھی شام تھی اور ہم سفر پر جانے کی تیاری میں مشغول تھے۔ سورج دھیرے دھیرے مغربی آسمان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے گھر سے باہر نکل کر دیکھا تو ہمیشہ کی طرح آج بھی گندے میلے کچیلے اور پھٹے کپڑے پہنے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچے کوڑے کے ڈھیروں میں سے لوہے اور ٹین کے ٹکڑے چننے میں مصروف تھے۔ ان کے دائیں بائیں کچھ سوئر تھے جو کوڑے کے ڈھیر میں اپنی تھوتھنیاں گاڑے گندگی سے اپنے پیٹ بھرنے میں لگے تھے۔

میں واپس آیا اور دیکھا کہ میرے تینوں بچے گھر میں نہیں تھے۔ سوچا کہیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیل رہے ہونگے۔ بچپن ہوتا ہی ایسا ہے۔ بچے اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ وقت گزارنا اور کھیلنا کودنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میں نے برآمدے میں بیٹھی اپنی بیوی ثمینہ کی طرف نظر ڈالی ہی تھی کہ دروازے پر ''یا علی مولیٰ'' کی آواز گونجی۔ میں لپک کر دہلیز تک گیا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا فقیر کھڑا ہے لمبی داڑھی، بکھرے ہوئے بال، لمبا چوغا اور جھکی ہوئی کمر، لگا کہ یہ درویش عام فقیروں سے کچھ الگ ہے۔ اس نے دست سوال بھی دراز نہیں کیا۔ میں نے خود ہی اس کی طرف چند سکے بڑھائے۔ فقیر نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور نہ سکّے تھامے۔ کہنے لگا ''تم جانتے ہو کہ مرنے کے بعد تمہارا کیا حشر ہوگا؟'' میں نے جواب دیا ''میں نہیں جانتا۔ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ'' فقیر نے نرم لہجے میں کہا ''مرنے کے بعد تمہارا وہی حشر ہوگا جو تم سے پہلے والوں کا ہوا۔

''فقیر کا جواب سن کر میں اور الجھ گیا سمجھ نہیں پایا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ میں نے پوچھا ''اگلوں کا کیا حشر ہوا؟'' جواب ملا'' ویسا ہی جیسے یا جن الفاظ میں تم انھیں یاد کرتے ہو۔''فقیر نے جواب دیا اور چلا گیا۔ جاتے جاتے اسکی آواز میرے کانوں میں آئی۔''جیسا تم کرکے رخصت ہوگے ویسا ہی تم کو یاد کیا جائیگا۔'' فقیر کی بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ہم سے پہلے رخصت ہوجانے والوں نے جیسے اعمال کیے تھے انھیں کو سامنے رکھ کر ہم انھیں یاد کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم کر کے سدھارینگے اسی کی روشنی میں آنے والی نسلیں ہمیں یاد کرینگی۔'' میرے سامنے ان بچوں کی شبیہیں ابھر آئیں جو کوڑے کے ڈھیروں پر سوروں کے بیچ ٹین اور لوہے کے ٹکڑے چن رہے تھے۔

میں اس اجنبی فقیر کو دھیرے دھیرے دور تک جاتا دیکھتا رہا۔ واپس گھر میں آیا تو ثمینہ برآمدے میں تخت پر بیٹھی عصر کی نماز سے فارغ ہوکر دعا میں مصروف تھی۔اس کے ہاتھ آسمان کی طرف تھے اور پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی نورانی شکل اور چہرے کی بشاشت نے مجھے حصار میں لے لیا۔ میں نے اس کے چہرے کو چوما اور اسے باہوں میں لے کر اس کی گرمی کو محسوس کیا پھر ہدایت کی کہ سفر پر جانے کی تیاری شروع کرو کیونکہ بارہ بج کر دس منٹ پر اس جہاز کو روانہ ہونا ہے جو ہمیں اس جنت تک لے جائے گا جس کے خواب ہمیں ہمارے لوگوں نے اب تک دکھائے ہیں۔

ثمینہ سفر پر جانے کی تیاری کرنے کے لئے اٹھی تو کہنے لگی'' کل رات جو دخانی کشتی کچھ اور لوگوں کو لے کر روانہ ہوئی ہے ہم لوگ اس میں کیوں نہیں گئے اس میں تو جتنے لوگ تھے بیشتر ہمارے رشتے ناطے کے تھے۔''میں نے ثمینہ کو سمجھایا اور کہا'' ہم میں سے بہت سے لوگ اس اندیشے سے اس کشتی میں سوار نہیں ہوئے کہ اس کشتی کے ملاح پر ہم لوگوں کو اعتبار نہیں تھا۔ جن لوگوں نے اس کشتی کے ملاح پر بھروسہ کیا اور یہ یقین کر لیا کہ جس فردوس گمشدہ کی انھیں تلاش ہے یہ کشتی ایک دن وہاں ضرور پہنچ جائیگی بس وہی لوگ اس میں سوار ہوئے ہیں۔ ہمارا جہاز آج آدھی رات کے بعد سفر پر روانہ ہوگا۔''

شام اور نیچے اتر آئی تھی۔ سبھی لوگ سفر کی تیاری میں مصروف تھے۔ اس سفر کو طے کر کے ہمیں اس جنت میں پہنچنا تھا جس کے موائد ہم سے ہمارے ملاحوں نے بہت پہلے سے کیے

تھے۔رات ہوگئی تو ہم ایک ایک سیکنڈ گن گن کر بتا رہے تھے۔سفر کرنے والے سارے لوگ بیدار تھے۔کوئی ایک بھی سویا نہیں تھا سب کو یہ انتظار تھا کہ کب آدھی رات گزرے اور کب ہمارا سفر شروع ہو۔تینوں بچے کھانا کھا کر آرام کی نیند سو گئے تھے۔انھیں معلوم تھا کہ ہمیں آدھی رات کے بعد سفر شروع کرنا ہے۔لیکن بچپن فکر مند نہیں ہوتا۔اسے کوئی تردد بے چین نہیں کرتا۔

ثمینہ آدھی رات کے وقت سفر کرنے سے ڈر رہی تھی۔میں نے بستر پر اسے اپنے اور قریب کیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ خوفزدہ ہے اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔اس نے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا مجھے لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔میں نے پوچھا تو کہنے لگی کہ ''بچپن میں میری دادی نے ایک بار مجھے اسی طرح کے ایک سفر کی کہانی سنائی تھی۔وہ کہتی تھیں۔۔۔''صدیوں پہلے بھی ایک بادشاہ نے اپنی رعیت کو لیکر سمندر کا سفر کیا تھا وہ بھی ایک ایسے فردوس کا خواب لے کر اپنی رعیت کے ساتھ نکلا تھا جس میں خوبصورت طیور کے چہچہانے کی بشارت دی گئی تھی۔پیڑوں پر سونے چاندی کے پھل لدے ہونے ،دودھ اور شہد کی نہروں کے جال بچھے ہونے کی بات کہی گئی تھی۔''

میں نے ثمینہ کی بات کاٹی اور کہا۔۔۔''ہمیں بھی ایسا ہی یقین دلایا گیا ہے کہ ہم جس جنت کی طرف جا رہے ہیں وہاں سکھ،شانتی ہے،دودھ اور شہد کی نہروں کے جال ہیں۔پیڑ ہیں جو پھلوں سے ہر وقت لدے رہتے ہیں۔''

ثمینہ اپنی بات کا سلسلہ ٹوٹ جانے سے تھوڑی برہم ہوئی بولی''پہلے میری پوری بات سن لو۔دادی کہتی تھیں کہ بادشاہ اپنی رعیت کو لے کر سمندر کی طرف چلا۔اس نے پہلے سے تیار کرائے گئے جہاز میں ایک ایک کر کے سبھی لوگوں کو سوار کروایا اور پھر خود بھی اس میں سوار ہوگیا۔

فضا شانت تھی۔بستیوں میں دیے ٹمٹمانے لگے تھے۔آسمان پر ستاروں کی چادر بچھ گئی تھی۔تبھی ملاح نے لنگر اٹھایا اور بادبان کھول دیے۔جہاز دھیرے دھیرے پانی کی لہروں کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔جہاں تک نظر جاتی تھی کالے پانی کا پھیلاؤ ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا تھا۔ساحل کا نام ونشان کہیں نہیں تھا۔بادشاہ جہاز میں خصوصی طور پر بنائی گئی مسند پر جلوہ افروز ہوگیا تھا اور رعیت

کے لوگ ادھرادھر بیٹھے اس جنت کے خواب دیکھ رہے تھے جہاں اس سفر کے بعد انھیں پہنچنا تھا۔''

''دادی بتاتی تھیں کہ رعیت کے لوگوں میں ایک قبیلے کا سردار بھی تھا جس نے اپنے سامان کے ساتھ کئی پشتوں سے چلی آرہی کئی یادگاریں بھی ساتھ رکھ لی تھیں۔ ان میں سنگ مرمر سے تراشے ہوئے کچھ مجسّمے بھی تھے جو نسل درنسل ہوتے ہوئے ان تک پہنچے تھے۔ جہاز جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا مسافر امیدوں سے بھرتے جارہے تھے۔ انھیں لگتا تھا کہ وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ جانے والے ہیں جہاں سکھ ہی سکھ اور راحت ہی راحت ہے۔''

میں نے ثمینہ کی بات کاٹ کر اسے یاد دلایا کہ جہاز تو ہم لوگوں کو تاریخ کے ہر موڑ پر کہیں نہ کہیں لے جاتے رہے ہیں پر وہ جنّت آج تک نہیں ملی جس کے خوبصورت خواب دکھائے جاتے ہیں۔ تم جانتی ہوگی کہ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں بھی تو گرمٹوں کو پکڑ کر نہ جانے کہاں کہاں لے جایا گیا تھا۔ کلکتے کے بندرگاہ پر زبردست جم غفیر تھا، زیادہ تر گاؤں کے نوجوان تھے۔ کئی نوجوان اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ تمھیں ایک ایسے ملک لے جایا جارہا ہے جہاں کی مٹی زرخیز ہے اور وہاں کے دریا موتیوں سے بھرے ہیں۔ جب ہزاروں لاکھوں لوگوں کا یہ قافلہ کئی جہازوں پر سوار ہوکر اس ملک پہنچا تو زمینیں بنجر تھیں اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر بنا پھل والے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ سارے گرمٹوں کو پھاوڑے تھما دیے گئے اور پھر ان سے کڑی مشقتیں لی گئیں۔ عورتیں کم تھیں اور گرمٹ مرد کثیر تعداد میں تھے۔ کچھ عرصے بعد عورتوں کی ایسی زبردست چھینا جھپٹی ہوئی کہ اسکا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔''

ثمینہ نے مجھے یہ تذکرہ آگے بڑھانے سے روک کر کہا کہ ''تمھیں اچانک یہ واقعات کیسے یاد آ گئے۔ تم جن دنوں کا ذکر کررہے ہو وہ بہت پرانی بات نہیں ہے۔ گرمٹوں کو تو جبراً لے جایا گیا تھا اور ان سے کہا گیا تھا کہ انھیں کچھ عرصے بعد ایک اچھی زندگی گزارنے کو ملے گی۔ یہاں سے گئے ہزاروں گرمٹوں میں سے بہت سے وہیں مرکھپ گئے۔ بہت سے وہیں گھر بنا کر آباد ہوگئے اور کچھ واپس آ گئے۔ لیکن میں جس جہاز کا ذکر کررہی ہوں وہ اس سے بہت پرانی بات ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے لوگوں کو کتنی بار جہازوں سے لے جایا جاتا رہا ہے۔ ان جہازوں کے مسافروں نے یا تو خود اچھے اچھے خواب دیکھے یا انھیں آئندہ کے خوبصورت خواب دکھائے گئے۔

لیکن تم جس گرمٹ ہسٹری کا ذکر کر رہے ہو وہ کوئی بہت قدیم سلسلئہ واقعات کی کڑی نہیں ہے۔ اور اس کی نوعیت بھی وہ نہیں جو دادی کے بتائے ہوئے جہاز کے سفر کی تھی۔ گرمٹوں کا سفر مجبوری کا سفر تھا۔ لیکن میں جس جہاز کی بات کر رہی ہوں اس میں بادشاہ اپنی رعیت کو ساتھ لے کر فردوس کی تلاش میں نکلا تھا۔''

میں نے ثمینہ کی بات توجّہ سے سنی اور کہا کہ ''تم اس جہاز کا واقعہ سناؤ جسے بادشاہ اپنی رعیت کے ساتھ لے کر نکلا تھا۔'' ثمینہ نے بتانا شروع کیا کہ ''دادی بتاتی تھیں کہ جب جہاز بیچ سمندر میں پہنچا تو چودھویں رات کا پورا چاند آسمان کے بیچوں بیچ چمک رہا تھا۔ ہوا شانت تھی اور طوفان آنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ جہاز اچانک رک گیا۔ ملاحوں نے ہر چند کوششیں کیں لیکن جہاز ٹس سے مس نہیں ہوا۔ تب ملاح نے کہا کہ ہمارے ساتھ جو مسافر ہیں ان کے سامانوں میں کوئی ایسی چیز ہو سکتی ہے جو سعد نہ ہو۔ اور اس کی وجہ سے جہاز آگے نہ بڑھ رہا ہو۔ مسافروں کی تلاشی لی گئی تو اس میں وہ مجسمہ دکھائی دیا جو ایک خاندان اپنے بزرگوں کی نشانی کے طور پر ساتھ لے آیا تھا۔ جہاز کے نگہبانوں نے وہ مجسمہ اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ لیکن جہاز اب بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا تب بادشاہ نے حکم دیا کہ مجسمے کے مالک کو بھی اٹھا کر سمندر میں پھینک دو۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔''

ثمینہ دادی کی کہانی سناتے ہوئے یہیں تک پہنچی تھی کہ میں نے خوفزدہ ہو کر اسے چپ کرا دیا اور کہا ''سفر سے پہلے ایسی نامبارک باتیں منہ سے مت نکالو۔ کیونکہ سفر درپیش ہو تو ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہیے جو حوصلے کو توڑتی ہوں۔'' ثمینہ خاموش ہو گئی۔ میں نے دوبارہ اسی جنّت کا ذکر چھیڑ دیا جہاں ہمیں اس سفر کے نتیجہ میں پہنچنا تھا۔''

رات آدھی آئی تو سبھی لوگ جہاز پر جانے کے لئے گھروں سے نکلے۔ ہم نے بھی رخت سفر باندھا اپنے بچوں کو نیند سے بیدار کیا اور خورد و نوش کا ضروری سامان لے کر اپنے ٹوٹے پھوٹے اور خستہ حال گھروں سے رخصت ہو گئے۔ رات گرم تھی اور برسات کا موسم ہونے کے باوجود بارش کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

سارے ہی لوگ جہاز میں سوار ہو گئے۔ کوچ کا نقارہ بجا ملاحوں نے جہاز کا لنگر کھولا، بادبان اٹھا لیے گئے اور جہاز سمندر کی لہروں پر ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ابھی کچھ ہی دور

آ گے آئے تھے کہ سمندر میں اونچی اونچی لہریں اٹھنے لگیں، ہوا تیز ہوگئی اور ہمیں لگا جیسے ملاح دشا بھول گیا ہو۔ کنارے کا دور تک پتہ نہیں تھا۔ ہم لگا تار سفر کرتے رہے لیکن منزل قریب آنے کی جگہ اور بعید ہوتی چلی گئی۔ جہاز اس کنارے پر جا کر نہیں لگا جو ہمیں بتائی گئی جنت کی طرف لے جاتا مسافر شور مچاتے ہوئے ملاحوں کو بدلنے کا مطالبہ کرنے لگے۔

ملاّح بدل دیے گئے۔ رات تھی اور جہاز ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ کبھی وہ اتنا ترچھا ہو جاتا کہ ہمیں لگتا جیسے ہم سمندر میں گر کر غرق ہو جائینگے کبھی وہ اونچی اٹھتی ہوئی لہروں سے ابھر کر سیدھا کھڑا ہو جاتا جس سے اس کے پلٹ جانے کا خطرہ بڑھ جاتا۔ مسافر خوفزدہ تھے اور صحیح سلامت منزل پر پہنچنے کی دعائیں کر رہے تھے۔

اچانک ایسا ہوا کہ ہچکولے کھاتا ہوا جہاز سمندر کے بیچوں بیچ پہنچ کر ایک جگہ رک گیا۔ ملاحوں نے ہر چند کوشش کی لیکن جہاز ذرا بھی آگے نہیں بڑھا۔ کسی نے پھر وہی کہا جو دادی کے جہاز والے نے کہا تھا کہ جہاز میں ضرور کوئی ایسا شخص یا جنس ہے جس کی وجہ سے جہاز آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔

کچھ مسافروں نے جن کے بدن پر لمبے کرتے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو جہاز کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لمبی داڑھی کے بال ہوا سے اڑ اڑ کر اس کی گردن کے عین پیچھے لپک رہے تھے اور کہا کہ "یہی وہ ہے جس کی وجہ سے جہاز آگے نہیں بڑھ رہا ہے اس کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دو۔" جہاز کے نگہبانوں نے جبراً اس شخص کو دبوچ لیا اس کی تلاشی لی گئی اور پایا کہ جو سروسامان وہ ساتھ لایا ہے اس میں اس کے بزرگوں کا دیا ہوا ایک گنبد نما مرقع بھی ہے جسے وہ حفاظت سے تھامے ہوئے ہے۔ نگہبانوں نے سب سے پہلے اسی کو نامبارک سمجھا اور سمندر کی گہرائی میں پھینک دیا۔ لیکن جہاز ابھی بھی نہیں چلا۔ کچھ مسافروں نے پھر شور مچایا۔ ہنگامے اور دہشت سے جہاز کا ماحول پھر بھر گیا۔ نگہبان پھر اٹھے اور انھوں نے اس شخص کو کاندھوں سے پکڑ کر جہاز کے عرشے تک کھینچا۔ اس کام میں اب کی بار کچھ مسافر بھی ان کے مددگار تھے۔ اس پھٹے حال شخص کو اٹھا کر سمندر میں

پھینک دیا گیا۔ سمندر میں زبردست چھناکے کی آواز گونجی ایک بھیانک قہقہہ ابھرا اور اس قہقہے میں میں نے سنا کہ پھر اسی فقیر کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے جس نے کہا تھا کہ ''تمہارا حشر بھی مرنے کے بعد وہی ہوگا جو تم سے پہلے والوں کا ہوا۔''

جہاز اب تک وہیں رکا کھڑا ہے اور میں ثمینہ کا ہاتھ ہاتھ میں لیے اپنے ان اعمال کا حساب لگا رہا ہوں جن سے موت کے بعد کا حشر متعین ہوتا ہے۔

یہ جہاز آگے کب چلے گا میں نہیں جانتا۔

☆☆☆☆

نکیل

فرخ ندیم (اسلام آباد، پاکستان)

''ایدے نال لڑیں گا۔۔۔؟''

''لڑاں گا۔۔۔''

''جمہورے۔۔۔''

''واہ واہ۔۔۔!!''

''گھوم جا۔۔۔''

''گھوم گیا۔۔۔''

''جھوم جا۔۔۔''

''جھوم گیا۔۔۔''

''بھیڑ بڑی لیلا۔۔۔؟''

''لیلا۔۔۔''

''ساس بڑی نہوں۔۔۔؟''

''نہوں۔۔۔!''

''در فٹے منہ۔۔۔'' (لوگ ہنستے اور تالیاں بجاتے ہیں)

''جمہورے۔۔۔؟''

''واہ واہ۔۔۔''

''اُلٹا جمیا۔۔۔؟؟''

''نہیں۔۔۔!!''

''فیر۔۔۔؟''

''اُلٹا ہو کے ویکھنا۔۔۔''

''کی ویکھیا۔۔۔؟''

''نہ پچھ۔۔۔!!!''

''فیروی۔۔۔؟''

''پہلے زندگی دی ضمانت۔۔۔!!!''

جیون نے دونوں ہاتھ باندھ لیے۔ ڈمبرو اور ریچھ کی رسی کو بغل میں دبایا اور سانپ کو ہوا میں لہرا کر بولا۔

''مل گئی ضمانت۔۔۔''

''تے دال روٹی۔۔۔؟''

''اووی ملے گی۔۔۔سائیاں دے سائے چہ،تو بھکا نہیں مردا''

''پانچ دس روپے۔۔۔؟؟''

''سائیاں دے مال دی زکواۃ تے بالاں دے سر دا صدقہ''

''ملے گا۔۔۔؟''

''برابر۔۔۔''

مداری نے بانسری لبوں سے لگائی اور بغل سے ڈمبرو نکال کر تغ تغ تغ تغ تغر دڑ تغر دڑ کرنے لگا۔ دائرے کا چکر کاٹتے ہوئے مداری نے ریچھ کی نکیل کو اس طرح جھٹکا دیا کہ ریچھ کی بھر پور بھڑک سے مداری سمیت تماشائی چھلانگیں لگاتے ایک دوسرے پر گرتے پیچھے ہٹنے لگے۔

مداری کا یہ عمل جمہورے کو ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس نے اپنے اوپر بچھی بوسیدہ سی چادر کے نیچے سے تالیاں بجا کر بھالو کو داد دی پھر ''جمہورے'' کی گونجتی آواز نے سب کی گردنیں مداری کی طرف موڑ لیں۔

''واہ واہ۔۔۔'' جمہورے نے آواز سن کر کہا۔

''بول تم نے کیا دیکھا۔۔۔''

''بندہ سانپ بنڑدا ویکھیا۔۔۔''

''یااللہ توبہ میری۔۔۔''

''ڈنگ ماردا ویکھیا۔۔۔''

''یااللہ توبہ میری۔۔۔''

''یااللہ توبہ میری۔۔۔''

''اللہ دی مخلوق۔۔۔''

''سوہنے سائیں دی مخلوق۔۔۔''

''مردیاں ویکھی۔۔۔''

''ہائے ہائے۔۔۔''

''کرلاندیاں دیکھی۔۔۔''

''اللہ سوہنے دی مخلوق۔۔۔''

''کاری ہوندیاں ویکھی۔۔۔!!''

''ہرررررررر۔۔۔''

تماشائیوں کے درمیان کھسر پسر ہونے لگی۔ لوگ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ایسا لگتا تھا جیسے لوگ کسی کو ڈھونڈ رہے ہوں یا اس فکر میں ہوں کہ کہیں جمہورے کی آواز کسی نے سن تو نہیں لی۔ کچھ تو چادر کو غور سے دیکھنے لگے کہ اس کے نیچے سے ایسی باتیں کیوں باہر آ رہی ہیں۔ اس بے چینی کو مداری نے بھانپتے ہوئے کڑک دار آواز میں جمہورے کو مخاطب کیا۔

''جمہورے۔۔۔''

''واہ واہ۔۔۔''

''گھوم جا۔۔۔''

''گھوم گیا۔۔۔''

''جھوم جا۔۔۔''

''جھوم گیا۔۔۔''

''اس ریچھ سے لڑو گے۔۔۔؟''

لڑوں گا۔۔۔''

''سانپ سے لڑو گے۔۔۔؟''

''لڑوں گا۔۔۔''

''ایہہ جانور تُو انسان۔۔۔''

''میں فیروی لڑوں گا۔۔۔''

''جمہورے۔۔۔''

''واہ واہ۔۔۔۔''

''میں بڑا کہ تو۔۔۔؟''

''میں۔۔۔''

جمہورے کی اس بات پہ کچھ لوگ ہنستے اور تالیاں بجاتے ہیں۔

''وہ کیسے۔۔۔''

''تُو ریچھ توں ڈردا۔۔۔!!''

''آخو۔۔۔''

''تُو سانپ توں ڈردا۔۔۔''

''آخو۔۔۔''

''تو بندے توں ڈردا۔۔۔''

''ہاں بچہ میں بندے سے ڈرتا،اس کے ڈنگ سے ڈرتا، بندہ ریچھ بن جائے تو اس کے پنجوں سے ڈرتا،اس کے دانتوں سے ڈرتا''

باپ اور بیٹے کے اس انوکھے ڈائیلاگ پہ لوگ اور بھی بے چین ہو جاتے ہیں۔مداری کبھی اس قسم کی باتیں نہیں کرتے۔ان کو کیا معلوم کہ مداری جیون کے بھی یہی جذبات تھے۔بیٹا کیوں ایسا بول رہا تھا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔اسی لئے وہ بھی ڈرامائی تکرار کے دوران جمہورے کو اپنے جذبات سے آگاہ کر رہا تھا کہ وہ رٹے رٹائے بولوں کے علاوہ کچھ نہ کہے۔لوگوں کی توجہ ہٹانے کو اس نے پھر ڈگڈگی بغل سے نکالی اور تغ تغ تغر دڑ تغر دڑ کرنے لگا پھر جمہورے کے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔

''جمہورے۔۔''

''واہ واہ۔۔۔''

''اس سانپ سے لڑے گا۔۔۔؟''

''ہاں لڑوں گا۔۔۔''

''ایہہ زہر نال بھریا۔۔۔!!''

''کوئی بات نہیں بندہ وی زہر نال بھریا۔۔۔!!''

''نہیں جمہورے۔۔۔نہیں، بندہ بندے دا دارو تے سانپ سانپ دا ویری''

''نہیں مداری نہیں۔ایتھے سانپ سانپ دا دارو تے بندہ بندے دا ویری''

''جمہورے۔۔۔؟''

''واہ واہ۔۔۔''

''گھوم جا۔۔۔''

''گھوم گیا۔۔۔''

''جھوم جا۔۔۔''

''جھوم گیا۔۔۔''

''دیکھ کے بتاوہ کون سا سانپ ہے جو سانپ کا دارو ہے۔۔۔؟''

''کی دساں مداری ہر پاسے سانپ۔۔۔تیرے آسے پاسے سانپ ہیں مداری۔ یہ اپنوں کو ڈنگ نہیں مارتے، ہم جیسے غریبوں کو مارتے ہیں۔ جو مانے ٹھیک نئیں تو کاری۔ خلاص۔۔۔''

کاری کا نام سنتے ہی ہجوم میں ایک بار پھر بے چینی پھیلی مگر جلد ہی مداری جیون بھانپ گیا کہ معاملہ گڑ بڑ ہے۔ زور سے ہرررررررر کرنے کے بعد وہ جمہورے کی طرف پلٹا اور سانپ ہوا میں لہرا کر بولا۔

''تو بہت باتیں کرتا ہے۔۔۔، جمہورے۔۔۔پر یاد رکھ۔۔۔سپاں نال ویر نئیں رکھی دا۔ جنگل میں رہ کے شیر سے دشمنی!! یا اللہ توبہ میری۔۔۔ !!!اس سانپ کی طرف دیکھ ۔۔۔اسکے زہر سے ڈر۔۔۔اسکے ڈنگ سے پناہ مانگ بچہ۔۔۔!'' پھر وہ تماشائیوں کی طرف پلٹا اور سانپ کو گلے میں لٹکا کر دائرے میں چکر کاٹنا شروع ہو گیا۔ بانسری ہوا میں لہرائی اور کہنے لگا۔ ''اس بانسری کی قسم جس میں میرا رزق ہے۔ میرا ایک ہی پتر ہے۔ میرے گھر تے میرے فن کا وارث، پاپی پیٹ کی خاطر، آج اس زہریلے سانپ کے ڈنگ سے مر جائے تو کون والی وارث ہے۔۔۔''

اُسے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ ابھی چند دن پہلے کی تو بات تھی کہ وہ ایسے ہی آزاد تھا جیسے درختوں فصلوں اور پانیوں پہ اڑتے ہوئے پرندے۔ اب وہ نجی جیل کی ایک کال کوٹھڑی میں ایک ہفتے سے بند تھا۔ مستقبل کس کے ہاتھ میں تھا۔۔۔اسے کچھ علم نہ تھا۔ اس لئے تو سوائے ماضی کے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ پھر باپ نے چادر ہٹائی اور وہ عوام کے سامنے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا اور سانپ کا آمنا سامنا ہوا۔ مداری نے سانپ دائرے کے اندر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اور خود ڈمبرو کے ساتھ بانسری بجانے لگا تھا۔ لوگوں کی تفریح کے لیے اسے جوگی بن کے کوبرے کے گرد الٹا سیدھا رقص کرنا پڑا۔ سانپ کو قابو کر کے پٹاری میں ڈال کر وہ باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا اور بولنے لگا۔ اب بتا میں بڑا یا یہ سانپ!!؟'' بابا تو بڑا۔ آخر تو پتر کس کا ہے''۔ مداری کے اس جملے پہ قہقہے برستے ہیں۔ ''چل اب اس جنگل کے بادشاہ کو ہرا کر دکھا، پر یاد رکھ کہ کسی بھی جنگل کے

بادشاہ سے سوچ کر ٹکر لینا۔ جان کھینچ لیتے ہیں جسم سے اگر یہ بدلے پہ آئیں۔۔۔!''

''یہ میری طاقت نہیں جانتا۔۔۔''اس نے سینے میں سانس بھر کر جواب دیا تھا۔

''تم رستم ہو، سہراب ہو، انوکی ہو، جھارا ہو یا گوگا پہلوان ہو۔۔۔؟''

''ایہہ سارے مل جان تے میں اک بن دا۔۔۔''

''آئی شاباش ہرررررر''۔ تغ تغ تغ تغ تغر دڑ تغر دڑ

''آگے مت بڑھو جمورے دیکھتا نہیں اس جانور کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے، اس کی چمڑی دیکھ اور اپنا کملا سا جسم دیکھ''

اور اس طرح ہمیشہ کی طرح اُس نے اپنے بھالو سے لڑائی کی۔ اُس کے بال پکڑے اور اُن میں گدگدی کی۔ جواب میں بھالو نے بھی اُچھل اُچھل کر اس کا ساتھ دیا۔ جب بھی بھالو گرجتا ہوا اُس پہ چھلانگ لگانے کی کوشش کرتا تو مداری اُس کی نکیل کھینچ لیتا۔ بھالو اس تکلیف سے دھاڑتا، اُچھل اُچھل کے غصے کا اظہار کرتا مگر لوگوں کو تو تماشا چاہئے تھا۔ وہ ہنستے قہقہے لگاتے اور تالیاں بجا کر داد دیتے۔ اپنی روایتوں کے مطابق وہ ہر قسم کے کھیل تماشے دیکھنے کے عادی تھے۔ تماشے دیکھنے کے بعد یہ لوگ اپنے کام میں ایسے جت جاتے جیسے کولہو کے بیل یا جوتے ہوئے بے بس جانور ہوں۔ ان کے لئے تو وہ دن بھی بڑا تماشے دار تھا جب اسے نکیل ڈال کر بھٹے سے اس نجی جیل میں گھسیٹتے ہوئے لایا گیا۔ دیوار سے ٹیک لگائے وہ زمین پہ بیٹھا اپنی ناک میں گھسی نکیل کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اب باہر گھپ اندھیرا تھا اور اس جگہ روشنی بس اتنی تھی کہ قیدی مٹی کے بت نظر آ رہے تھے۔ پرندے پر پھیلائے گھونسلوں کو اُڑ چکے تھے۔ چھوٹے بڑے چرند پرند سبھی گھروں کی آغوش میں سکون بھرے سانس لے رہے تھے۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اپنی نکیل پکڑی اور دائیں ہاتھ سے کھڑکی میں لگے لوہے کے زنگ آلود سریے۔ اُس نے کھڑے ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ یہ رات اُسے بہت سیاہ لگی۔ شاید اس رات سے بھی زیادہ جب اس نے کسی کو کاری ہوتے دیکھا۔ تڑاخ تڑاخ تڑاخ فائر کی آواز آئی تھی اور سرونٹوں کے پار کسی کا بڑی چادر میں لپٹا جسم مٹی پہ ڈھیر بن گیا۔ چند روز پہلے۔ جس دن حبس بہت شدید تھا، اس علاقے میں پڑاو کا کوئی تیسرا ہفتہ تھا اور جمعے کا دن، وہ خوش نہیں تھا۔ وہ پکھی واس تھے یا

بنجارے یا جوگی، اسے کچھ نہیں معلوم۔ اسے یقین تھا کہ باپ اسے کچھ نہ بتائے گا۔ بس اتنا پتا تھا کہ وہ مداری تھے اور میلوں میں رہس ناٹک بھی کر لیا کرتے تھے۔ دونوں باپ بیٹا ماہیئے ٹپے گا کر بھی روزی روٹی بنا لیتے۔ وہ اس علاقے میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شاہ عنایت کے دربار کے پاس ڈیرے ڈالے جائیں۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی اسے یہی سننے کو ملا کہ بڑوں کی روایتیں انسانوں سے بھی بڑی ہوتی ہیں۔ اور وہ چپ ہو گیا تھا۔ جیسے بابا بولے۔ اور ایک دن وہ اس علاقے میں آ گئے۔ یہ شام ڈوبنے کا وقت تھا۔ پورے تیرہ سالوں میں پہلی دفعہ اس نے کچھ ایسا دیکھا۔ پوری شدت سے واقعہ اس کے اعصاب کو جکڑ چکا تھا۔ کھانا پینا ختم۔ سونے جاگنے کا ہوش ختم۔ کام کاج کا شعور ختم۔ تماشے کے بول گڈ مڈ ہو جاتے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ سب جھگیوں کے بچوں کو اُٹھا کر اونچی آواز میں سب کچھ بتا دے لیکن وہ انجام جانتا تھا۔ کئی کہانیاں سن چکا تھا مگر اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں تھا۔ اور اب کی بار اس نے دیکھ لیا۔ بار بار اس کا جی چاہتا کہ وہ لوگ یہاں سے بہت دور۔۔۔ بہت دور چلے جائیں۔ وہ جھگیوں کے گرد چیخ چیخ کے بھاگنا چاہتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ سخت تکلیف میں ہے مگر باپ کی مار پیٹ سے لے کر مقدس روایتوں کا بھرم سب کچھ وہ جانتا تھا۔ وہ مسلسل کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ چند قیدی اور تھے، جو اونگھ رہے تھے یا سو رہے تھے۔ اسی بڑے ہال نما کمرے میں انگریز کے دور کی یہ جیل کئی ناکوں میں نکیل ڈلتے دیکھ چکی تھی۔ اس رات اس بری حالت میں وہ ہی تھا کیونکہ اس کا جرم بہت بڑا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اس دن تماشے کے دوران وہ جذبات پہ قابو نہ رکھ سکا تھا۔ "یااللہ توبہ میری" 'توبہ یااللہ توبہ میری توبہ"۔ "اللہ دی مخلوق، سوہنے سائیں دی مخلوق" " کاری ہوندیاں ویکھی"۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی جگہوں پر وہ روایت سے ہٹ کر بولتا چلا گیا تھا۔ "تیرے آسے پاسے سانپ، پھنئیر سانپ، ڈھائی کنڈ ریئے اور ولیے سانپ، کوبرا اور سنگچو رسانپ"۔ پر کیا کرتا، اسے ہر بار یہی محسوس ہوتا جیسے کچھ ولیئے سانپ چپ کی بکل مار کر اس کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ ہاں اسے یاد تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ اس تماشے کو دیکھنے بھی سب سے آگے بیٹھ جاتے۔ اس دن تماشا ختم ہوا۔ آٹا دال روٹی جو سرا باپ بیٹے نے تھیلے میں رکھ لیا۔ اس نے بھالو کی رسی کھولی اور باپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔ جیون مداری سارے راستے میں چپ رہا حالانکہ اسے امید تھی اور وہ چلتے چلتے انتظار بھی کر

رہا تھا کہ باپ اس کو ڈانٹے گا، سمجھائے گا، کہے گا، اپنے کام سے کام رکھو۔ کہے گا تمہاری روٹی روزی کا مسئلہ ہے، رٹا رٹایا کیوں بھول جاتے ہو؟ اپنا کام ہے تو اپنا کماتے کھاتے ہیں مگر سارے راستے میں ایسا نہیں ہوا۔ اس کا باپ چلتے چلتے ایک درخت کی جڑوں پہ بیٹھ گیا، ستانے کو۔۔۔یا کچھ سمجھانے کو۔ سر سے پٹکا اُتارا۔۔۔پسینہ خشک کیا، پوچھنے لگا۔''شاہ عنایت کے مزار پہ ہم کب گئے تھے۔۔۔؟''

اتنی دیر میں ایک مذہبی جماعت کے لوگ اللہ کی یاد میں غرق ان کے پاس سے گزرے اور تھوڑی دیر کے لئے دونوں باپ بیٹا خاموش ہو گئے تھے۔ اللہ کے یہ نیک بندے ریچھ کے ساتھ دو انسانوں کو درخت کی جڑوں پہ بیٹھے دیکھتے تو بے اختیار استغفار کرتے چلے جاتے۔

''پچھلے مہینے کی تیرہ تاریخ کو۔۔۔بڑا سکون ملتا ہے وہاں۔۔۔اور، سنا ہے بڑی گہری بات کرتا تھا اور لوگ سمجھ بھی جاتے تھے "۔ اسنے تھوڑی دیر بعد بولا تھا۔

" گہری باتیں تو تو بھی کرنے لگ گیا ہے پتر۔ پر وہی بول جو دنیا سننا چاہتی ہے"

"بابا،،،، بس منہ سے نکل گیا، تم نہیں سمجھو گے،،، بس ایک چھلا کا مار کے کچھ ذہن میں آجاتا ہے"

" تم نے جو دیکھا سنا سب بھول جاؤ، ہم یہاں نہیں رہیں گے، شاہ عنایت کے پاس یہ گرمیاں نکالیں گے،،، تماشے کرتے کرتے کہیں خود تماشہ مت بن جانا،،، یہ دنیا جنگل ہے پتر،، یہاں بڑے جانور چھوٹوں کو کھا کر ڈکار بھی نہیں مارتے"

''بابا، دربار پہ گویوں کا ایک ایک لفظ روح میں اتر جاتا ہے۔ سب کچھ یاد ہو جاتا ہے۔ کیا کلام گاتے ہیں۔ میں تو پوچھ بھی لیتا ہوں آپ سے یا سیانوں سے اگر کچھ سمجھ نہ آئے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ مزار کے پاس ڈیرے ڈالے جائیں، پر تم لوگ میری سنتے کب ہو، اب میں کیا بتاوں تجھے،،،،''

" سمجھتا ہوں پتر، چپ بھلی۔ صبر دے منکے نال اندر کا زہر چوس لے نئیں تو شوکاں مارنے لگتا ہے۔ وہی بول جو تیرا باپ بولتا ہے، کملیا ہماری کونسی زبان،،، اچھا چل اٹھ دو تین پنڈ اور دیکھتے ہیں، شام ہونے سے پہلے جگیوں پہ پہنچنا بھی ہے، راستہ ٹھیک نہیں پتر،،؟"

رات تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ چچا فقیرو ابھی بھی جاگ رہا تھا۔ اس نے بھی شروع شروع میں بھٹے میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر مجبوریوں نے مجبور کر دیا تھا۔ وہ سب مزدوروں کی زندگیوں سے واقف تھا، ہمدرد تھا، سیانا تھا، راہنما تھا۔ پر منشی کا قتل اسے بھی اس جیل میں لے آیا۔ وہ بدستور وہیں کھڑے اپنی نکیل ہاتھ میں پکڑے سوچوں میں غرق تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مدھم سی لالٹین کی روشنی میں چچا فقیرو چادر کے دونوں کونوں کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پہ باندھ کے اس طرح آپس میں ٹکرا رہا تھا کہ دیوار پہ اس کے عکس سے کبھی جانور اور کبھی انسان لڑتے نظر آتے۔ اس نے غور کیا تو ایسا لگا جیسے اس کا بھالو کچھ جانوروں سے لڑ رہا ہو۔ وہ پھر کھڑکی کی طرف مڑا۔ اسے یاد آیا کہ وہ باپ بیٹا جب درخت کی جڑوں سے اُٹھے تو فائر کی آواز آئی تھی تڑاخ اور یکدم پرندوں کا ایک ڈار ایسے اُڑا جیسے یہ خطہ حرام یا پلید ہو گیا ہو۔ یہ تڑاخ کیسی تھی، دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ تڑاخ اسے بھی اُس وحشت بھری رات کی طرف لے گئی تھی۔ وہ چیخ۔۔۔اور پھر وہ فائر،،،تڑاخ۔۔۔۔اسے یاد تھا کس طرح وہ ہانپتا ہوا جھگیوں کے پاس پہنچا تھا۔ وہ رونا چاہتا تھا۔ دھاڑیں مار کر، اُس رونے کو روکتے روکتے اندھیری رات ہو گئی۔ اسے بھوک نہیں تھی اس لئے اماں نے جو روٹی دی اسے بھالو کے پاس لے گیا مگر اس کی نکیل دیکھ کر اسے اپنی ناک میں کھجلی ہونے لگی۔ پانچ سال سے بھالو ان کے پاس تھا ۔ انہی جھگیوں میں اس کے ساتھ کھیلتے بھالو جوان ہو رہا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بھالو کو بھی غور سے دیکھا پھر اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ جواب میں بھالو بھی اس کے ساتھ گردن رگڑ کے محبت کا جواب دینے لگا۔ اس نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ جب بھالو اسے پیار سے چاٹنے لگا تو اس کا دل چاہا کہ اس کی نکیل نکال دے۔ ایک دم بھالو نے گردن نیچے کی اور اس کے پاؤں چاٹنے لگا۔ اس نے بھالو کا منہ ہاتھوں میں لیا اور اپنی گردن پہ رکھ کے سسکیاں بھرنے لگا پھر وہ ایسا رویا کہ بھالو کا گلا بھی بھرا گیا۔ پھر وہ زارو قطار رو رہا تھا۔ آس پاس کی جھگیوں کے لوگ اس نئے تماشے کو دیکھنے جمع ہونا شروع ہوئے۔ باپ بھی لالٹین اُٹھائے وہاں پہنچ گیا۔ باپ نے جلدی سے بھالو کو اس کی جگہ پہ باندھا اور اس کو کھینچتا ہوا اپنی جھگی میں لے گیا۔ مگر جھگی کے پیچھے تین آدمیوں کو رات کے وقت دیکھ کر باپ بیٹے کے قدم رک گئے۔ آواز آئی۔۔۔

''جیون۔۔۔؟''

''ہاں میں جیون۔۔۔!'' پرتم لوگ کون ہواوراس وقت ادھر کیا لینے آئے ہو۔

''تمہارے چھوکرے کو۔۔۔''

''مطلب۔۔۔؟''

''ادھر بھٹے میں کام کرے گا۔۔۔منشی جی بھی ساتھ ہیں''۔''ہاں ہاں بڑے سائیں نے ہم تینوں کو بھیجا ہے۔تمہارا پتر کل سے بھٹے میں کام کرے گا''اس کے ساتھی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''مگر ہم تو اپنا کام کرتے ہیں۔فن کارلوگ ہیں۔آپ سخیوں کے سر کا صدقہ جو ملتا ہے شکرادا کرتے ہیں۔"

منشی ان کے چہروں پہ بیڑی مارتے ہوئے آگے بڑھا اوراس کی آنکھوں میں تیز روشنی پھینکتے ہوئے بولا۔یہی ہے ناں وہ جس نے کچھ دیکھا تھا۔منشی کے دوسرے ساتھی نے جلدی سے اس کے بازو مروڑ کے پیٹھ پہ لات ماری اور کہنے لگا۔کسی لگڑی رن کے بچے تماشے تماشے میں ہم لوگوں کو گالیاں دیتا ہے۔۔۔تیسرے نے اس کے بال کھینچتے ہوئے کہا، دیکھانہیں سالے یہاں تو کتے بھی ہمیں پوچھ کے بھونکتے ہیں پھر وہ اسے اس کے باپ پہ پھینکتے ہوئے بولے'' کاٹ کے رکھ دیں گے اس کو اگر زبان کھولی اس نے تو۔کل اگر یہ نہ آیا تو جس طرح ہم لے کے جائیں گے سارے جھگیوں والے دیکھیں گے''۔''سائیں معافی۔معافی سائیں، دو ہاتھ، منشی جی میرے دو ہاتھ، ہاتھ باندھ کر معافی مانگتا ہوں''۔باپ کے ہاتھوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اوراپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ اپنے قدموں پہ کھڑا ہوااور دوٹوک الفاظ میں بولنے لگا۔۔۔''کل ساتھ والے گاؤں میں میلہ ہےاور میں بھالو کو لے کر تماشا کرنے جاؤں گا۔۔۔''تو بھٹے پہ آئے گا۔۔۔زندہ یا مردہ۔دوسرے نے پھراس کو دبوچتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ زور سے مارتے ہوئے کہا،،۔'' تیرے بھالو کی ماں کی بھو۔۔۔'' پھر دوسرے نے ایک دم کرتا ہٹا کے پستول نکالی اوراسکی نال اسکی گردن میں ٹھونس دی۔وہ تینوں اس کواوراس کے باپ کو دھکے دیتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں بھالو بندھا تھا۔منشی موبائل پہ کسی سے کچھ بولتا جارہا تھا۔اسی اثنا میں فائر ہوا تڑاخ کی آواز آئی اور بھالو گالیوں کے شور میں وہیں ڈھیر ہو گیا۔تھوڑی دیر میں لینڈ کروزر آئی اور وہ اسے بھالو ہی کی رسی میں باندھ کر گاڑی میں زبردستی بٹھانے لگے۔اور۔۔۔کچھ لمحے تو اسے اپنی انکھوں پہ یقین نہ آیا۔

اپنے آپ کوان کے شکنجے سے آزاد کرا کر وہ واپس بھاگا تھا، روتے ہوئے اپنے بھالو پہ گر گیا۔ اسکی دکھ بھری چیخوں نے جھگیوں کی نیندیں اڑا دیں۔ بھالو کی گردن کے بال اسکے آنسوؤں سے گیلے ہو رہے تھے اور وہ کسی صورت اس کی گردن نہیں چھوڑ رہا تھا۔ پھر لاتوں اور مکوں کی بارش میں اسے بھالو سے علیحدہ کر کے گاڑی کی طرف لے جایا گیا تھا۔ باپ کے بعد ماں نے بھی منت سماجت کی ۔ بہت گڑگڑائے مگر حالات کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُسے سب کچھ یاد آ رہا تھا اور وہ ابھی تک وہیں کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ فقیرو چاچے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ بغیر کوئی بات کیے اُس نے پانی کا گلاس پکڑا قریب پڑی بالٹی سے پانی بھرا اور منہ سے لگا لیا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا کیونکہ بادلوں نے چاند ستاروں کی روشنی کو ایسے ڈھک لیا تھا جیسے روشنی کا کبھی وجود ہی نہ رہا ہو۔ وہ بدستور وہیں کھڑا تھا۔ اپنی ننگی پسلیوں کو تانے وہ وقت کی عدالت میں سزا کا منتظر تھا۔ اُسے فیصلے کا وقت قریب آنے کا احساس ہوا۔ اور وہ اپنے جواب سے مطمئن تھا۔ چچا فقیرو نے جو کیا ٹھیک کیا۔ اُس نے اپنے جسم پہ ہاتھ پھیرا۔ ننگی کمر پہ جگہ جگہ جمے ہوئے خون کے نشانات تھے۔ ایک ایک زخم کے اندر معتوب جھگیوں کی غربت، نفرت کے پھوڑے اُگا رہی تھی۔ اسے ان کی نفرت انگیز ٹھوکریں یاد آئیں ۔ اسکی پسلیوں اور منہ کا نشانہ لے لے کر مارا گیا تھا۔ بھالو کی رسی اس وقت اس کے گلے میں تھی جس کا دوسرا سرا ان ہاتھوں میں تھا جن میں اس علاقے کی تقدیر تھی۔ اس کے ماں باپ چند جھگیوں والوں کے ساتھ اُسے چھڑانے بڑے برآمدے والی حویلی آئے تھے۔ ماں تو اسے دیکھتے ہی اس پر گر گئی پر تماشائیوں کی آنکھیں اس کے ناک منہ سے خون نکلتا دیکھنا چاہتی تھیں، سو اُنہوں نے دیکھ لیا۔ جھگیوں والوں کی منت سماجت کے بعد پھر وہی فیصلہ ہوا کہ وہ بھٹے پہ کام کرے گا۔ اب بھی اس کے منہ سے نہیں نکلا۔ وڈیری چال نے اپنا کمال دکھایا۔ ماں باپ کی زندگی چاہتے ہو تو بھٹے میں کام شروع کر دو۔ علیحدگی میں اس کے والدین کو کہلا دیا گیا کہ چھوکرے کی زندگی چاہتے ہو تو حویلی سے بیس کوس دُور جھگیاں لے جاؤ۔ زہر کے گھونٹ پیتا وہ بھٹے پہ کام کرنے چلا گیا۔ ہر وقت اس پہ نظر رکھی جاتی۔ منشی ماں بہن کی ننگی گالیاں اس طرح دیتا جیسے مزدوری کے ساتھ گالیاں مفت ہوں ۔ چچا فقیرو سے یہیں اس کی ملاقات ہوئی تھی ۔ وہ بھی شاہ عنایت کا مرید تھا۔ حسب عادت اُس دن بھی منشی اس کو گالیاں بکتا چنی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر پہ کھڑا ہو گیا۔ پیچھے فقیرو چچا کھڑا تھا۔ منشی نے زور سے کہا، ''لو جی سنو یہ مداری دا بچہ کم نئیں کرے گا۔ اس کو بولو ایہہ وڈیرے دا بھٹہ

اے، ایدی ماں دی جھگی نہیں''۔ ابھی منشی نے یہی کہا تھا کہ ادھیڑ عمر فقیرو چچا کی زوردار اور نفرت بھری ٹکر منشی کی پسلیاں توڑتی ہوئی اور پہلے ساڑ اینٹوں پہ پھر گہری کھائی میں گراتی چلی گئی۔ یہاں بھی نیچے کھنگر اینٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ منشی سر کے بل ہی گرا تھا۔ تبھی تو لوگوں کے آنے سے پہلے وہ بھٹہ تو کیا دنیا بھی چھوڑ چکا تھا۔ اس نے بھی کھائی میں چھلانگ لگائی اور چچا فقیرو کو سنبھالتے ہوئے باہر نکل آیا۔ مالک بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ سارا الزام اسی پہ دھر دیا گیا۔ وہ یہ کہ سارے فساد کی جڑ یہی ایک وجود ہے۔ یہی ایک مچھلی ہے جو سارے تالاب کو گندہ کر رہی ہے۔ پھر وہی بھالو والی رسی جو پہلے ہی اس کی گردن میں لٹکی تھی۔ اس کی ناک میں ڈال دی گئی۔ ایسے ہی جیسے کسی جانور کو گرا کر ہاتھ پاؤں جکڑ کر ڈالی جاتی ہے۔ بس ایک فرق تھا جانور کو نکیل ڈالتے وقت سُوا آگ میں گرم کیا جاتا ہے۔ یہ رسی پتلی بھی نہیں تھی۔ اس کی روح چھلنی کر کے گزرتی چلی گئی۔ چچا فقیرو کو اس جیل بھیج دیا گیا اور اسے نکیل ڈال کر سارا گاؤں پھرایا گیا۔ راستے میں پھر وہی مذہبی لوگ اپنی پشتوں پہ بستر باندھے بھی ملے۔ اللہ کی یاد میں غرق، استغفر اللہ پڑھتے آگے گزرتے گئے۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، چچا فقیرو اب بھی انگلیوں سے جانور لڑا رہا تھا۔ بڑا دروازہ کھلا۔ اس کے منہ پہ سیل والی بیٹری کی روشنی پھینکتے ہوئے کچھ لوگ آگے بڑھتے جا رہے تھے، چچا فقیرو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔ اس کی نکیل اس طرح کھینچی گئی کہ اُسے ننگی کمر کو جھکانا پڑا۔ وہ تقریباً کبڑوں کی طرح ان کے پیچھے پیچھے پگڈنڈیوں پہ چل رہا تھا۔ جب بھی وہ لڑکھڑاتا منشی کے بھائی بھتیجے گالیوں کے چابک مارتے۔ درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس ایک نالہ ہے اُس کو چوایا سُوا بھی کہتے ہیں۔ اس کو وہیں لے جایا گیا۔

سامنے چوڑے پہیوں والی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ دروازہ کھلا اور اسے زور سے دھکا دے کر اگلے دروازوں میں تلّے دار جوتوں والے قدموں پر گرا دیا گیا۔ ان میں سے ایک گرج دار آواز میں بولا،''ماں خصم بول۔۔۔ کیا دیکھا تم نے؟ تو ہم سے لڑے گا۔۔۔!!''دوسرا بولا،'' اونہیں، اس طرح نہیں، مداری کر کے،،،،، ایسے۔۔۔ جمہورے۔۔۔، سائیں سرکار سے لڑے گا۔۔۔؟''وہ چپ تھا جیسے اُس نے تو کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے سامنے دیکھتا جا رہا تھا۔

سامنے ہریالی میں اس کا بھالو اس کو کھیلنے کے لئے بلا رہا تھا۔ وہ بھی قہقہے لگاتا بھاگتا جا رہا تھا، ہری بھری فصلوں میں۔ بھالو کبھی نرم نرم جھاڑیوں میں چھپ جاتا کبھی اسکے قدموں میں گر کر پاؤں چاٹتا۔ مگر،،، گال پہ پڑنے والے زناٹے دار تھپڑ نے اس کے قدم روک دیے۔ اس

نے سب کے چہروں کی طرف غور سے دیکھا۔جیسے پوچھ رہا ہو کہ وہ یہاں کیسے آیا۔اب کی بار اس کی نکیل اس طرح کھینچی گئی کہ اس نے اپنے سر کو گاڑی سے ٹکراتے ہوئے محسوس کیا۔''مداری کے بچے۔۔۔ہمیں سانپ کہتا ہے۔۔۔؟۔بول بزدل۔۔۔بولتا کیوں نہیں گیدڑ۔۔۔منشی کو مار کے تو سمجھتا ہے لیڈر بن جائے گا۔۔!!!تیرا باپ ہی نہیں سب جھگیوں والے ہمارے بھٹوں پہ کام کریں گے''۔پھرایک زوردار دھکے سے اسے نیچے گرا دیا گیا۔''سرکار سائیں سے لڑے گا۔۔۔؟؟؟منشی کے بھائی نے اکڑتے ہوئے پوچھا۔

''لڑوں گا۔۔۔۔''ساری طاقت لگا کے اتنی زور سے وہ بولا کہ روایتوں کا تقدس لڑکھڑانے لگا۔

''تڑاخ۔۔۔۔''

اوراب کی بار پرندے ایسے اُڑے جیسے اُن کا کوئی ساتھی حلال ہو گیا ہو۔

☆☆☆☆

پارکنگ لاٹ

نورالعین ساحرہ (میری لینڈ،امریکہ)

جہاں جھیل میں رنگ برنگی بطخیں تیرا کرتیں جنہیں کچھ ننھے بچے ڈبل روٹی کھلاتے جب کہ قریب ہی انکی مائیں بنچوں پر بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف ہوتیں، قریب ہی کچھ لوگ اپنے پالتو جانوروں سمیت شام کی سیر کے مزے لیتے تھے اور ذرا بڑی عمر کے بچے واک کے لئے بنی ٹریل پر سائیکل چلاتے یا اسکیٹنگ کرتے، وہیں روزی کا گھر تھا۔ اس کو آج اپنی جاب سے چھٹی تھی جبکہ اس کے ماما اور پاپا دونوں ہی اپنی اپنی جاب پر گئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی بالکونی میں کھڑی باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے کافی کا کپ اپنے ہونٹوں سے لگایا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے لمبے خوبصورت سیاہ بالوں کو سمیٹ کر پشت پر ڈالا اور گنگناتے ہوئے باہر دیکھنے لگی۔ وہ ہمیشہ سے فطرت کی خوبصورتیوں کی دلدادہ تھی۔ اس کا گھر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا جس کے دامن میں ایک خوبصورت جھیل تھی۔ یہ ایک بہت ہی خوبصورت شام تھی۔ یہاں بہار اور خزاں دونوں کا اپنا حسن تھا۔ نرم خوشبودار ہوائیں جب درختوں اور پھولوں کو چھوتی دروازوں کھڑکیوں پہ دستک دیتیں، اور اگر وہ دن چھٹی کا ہوتا، روزی کافی کا کپ تھامے درختوں پہ بیٹھے پرندوں کی آوازوں میں کھو جاتی یا لمبے لمبے خوبصورت بالوں سے شانے سجائے وہیں پارکنگ میں آ کر بیٹھ جاتی جہاں اس کے ہمسائے اس کا انتظار کر رہے ہوتے۔ فطرت کی گود میں یہ کنبہ ایک دوسرے سے ایسے مانوس تھا جیسے صدیوں کا سفر طے کر کے یہاں پہنچے ہوں۔

یہاں پر ہی چھ کاروں کے برابر کمیونٹی کی ملکیت وہ خالی جگہ موجود تھی جو باقاعدہ پارکنگ لاٹ تو نہیں تھی مگر زیادہ پارکنگ کے محتاج لوگوں نے ضرورت کے تحت بنالی تھی۔ ہر گھر کے سامنے صرف دو کاریں پارکنگ کرنے کے لئے جگہ مخصوص کی گئی تھی جبکہ اکثر گھروں میں تین یا اس سے بھی زیادہ ہوتی ہیں۔اس وجہ سے فالتو کاروں کو کافی دور مہمانوں کے لئے بنی گیسٹ پارکنگ میں لے جا کر کھڑے کرنا بھی دردِ سر تھا۔کبھی کبھی آدھی رات کو جاب سے لوٹنے والوں کے لئے سردی، گرمی، تیز بارش یا برف باری میں اتنی دور پارک کرنے جانا عذاب جاں بن جاتا تھا۔

محلے والوں نے اتنی دور جانے کی بجائے جھیل کے کنارے رہنے والی مسز سمتھ سے اجازت لے کر ان کے گھر کے ساتھ خالی پڑی کمیونٹی کی جگہ اپنی کاروں کے لئے مخصوص کر لی تھی۔ یوں ان کو بہت سہولت ہوگئی تھی۔ کہنے کو تو یہ پیپل کے پتے کی شکل کی جگہ محض پارکنگ لاٹ تھی مگر امن اور شانتی پھیلانے کے حوالے سے اقوام متحدہ کی وسیع وعریض عمارتوں اور دالانوں سے زیادہ طاقتور تھی۔شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں رشتے مفادات سے مشروط نہیں تھے۔ یہاں کسی اندرونی اور بیرونی دباؤ کے بغیر صرف انسانی قدروں نے مختلف دنیاؤں اور تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے جان، سمنتھا، ازابیل، ونود، مارتھا، سیلویا، ڈورتھی اور روزی کو اکھٹا کر دیا تھا۔ یہاں سب ایک برابر تھے اور کوئی کسی کو ویٹو نہ کر سکتا تھا۔سخت سردی یا طوفانی بارش کے علاوہ روزانہ صبح کے آٹھ اور شام کے چھ بجے یکے بعد دیگرے جاب پر جانے سے پہلے اور واپسی پر یہ سب لوگ یہاں اپنی اپنی کار لینے یا پارک کرنے آتے تو ان کی ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔شروع شروع میں یہ رسمی سلام دعا رہی مگر تین سال کی مدت میں یہ ہیلو، ہائے سے بڑھتے بڑھتے گہری دوستی میں بدل چکی تھی۔ وہاں پارکنگ میں جو بھی پہلے آ جاتا وہ رک کر باقی سب کا انتظار کرتا۔اب تو وہ لوگ وہیں کھڑے کھڑے موسم، ملکی معیشت اور ٹریفک کے علاوہ اپنے اپنے باسز، ہمسفروں اور بچوں کے شکوے شکایات تک ایک دوسرے سے کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے تھے اور تو اور تہواروں پر مبارکباد اور تحفوں کا تبادلہ بھی اسی جگہ ہونے لگا تھا۔ان کی دیکھا دیکھی سارے محلے والے شام کو وہاں جمع ہونے لگے تھے۔گویا روز ایک میلے کا سا سماں ہوتا اور قدم قدم پر زندگی مسکرایا کرتی تھی۔

اکثر شام کو مسز سمتھ اپنی بالکونی کا دروازہ کھول کر ان سب کے لئے کافی، سوپ، چاکلیٹ یا اپنے ہاتھوں سے بنائے بسکٹ لئے باہر نکل آتیں۔ سب مزے لے لے کر کھاتے۔

آدھے گھنٹے تک خوب محفل جمتی۔ بعد میں ان کا شکریہ ادا کرتے جو کسی ماں کی طرح ان سب کو بلا تخصیص چاہتی اور محبتیں لٹاتی تھیں۔

ان کا سترہ سالہ بیٹا گریگ جسے انہوں نے پڑھائی کے لیے قریبی شہر بھیجا ہوا تھا وہ جب بھی ان سے ملنے آتا تو اس پارکنگ لاٹ پارٹی میں شامل ہوکر خوب لطیفے سنایا کرتا۔ سب کو ہنساتا۔ اسے روزی بہت اچھی لگتی تھی مگر چونکہ عمر میں وہ گریگ سے پانچ سال بڑی تھی اس لئے ہر ملاقات میں وہ یہ شکوہ ضرور کرتا۔ کتنا اچھا ہوتا روزی، اگر تم مجھ سے پانچ سال بعد پیدا ہوئی ہوتیں۔ چلو خیر، اب اس کو تو نہیں بدلا جا سکتا مگر پلیز میرے لئے بھی اپنے ہی جیسی مشرقی حسن کا پیکر کوئی اپسرا ڈھونڈ دو ورنہ میں زندگی بھر شادی نہ کروں گا "یہ سن کر روزی بری طرح جھنپ جاتی، بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں جھک جاتیں اور اس کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہو جاتا۔ "اِسٹاپ دس نان سینس "۔ وہ بڑے ہونے کا فائدہ اٹھا کر اس کو ڈانٹتی تو شرمندہ ہونے کی بجائے وہ جھوٹ موٹ کا رومیو بن کر اسکے قدموں میں بیٹھ جاتا۔ باقی سب ہنس کر گریگ کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے، نعرے لگانے لگتے، لیکن جانے کیوں ونود کے چہرے پر ایک لمحے کو سخت ناگواری کا تاثر ابھرتا جسے چھپانے میں وہ ذرا بھی تردد نہ کرتا اور روزی بھی اس سے بے خبر معلوم نہ ہوتی تھی۔ ڈورتھی فوراً روزی کو اپنی آغوش میں لے لیتی اور گریگ کو پیار بھرے غصے سے ڈانٹ کر کہتی۔ ''اس معصوم بچی کو پریشان مت کیا کرو۔ اس کے کلچر میں ایسے مذاق کو بہت برا سمجھا جاتا ہے'' یہ سن کر وہ چونک جاتا، پھر حیران ہو کر کہتا ''لیکن مذاق کون کر رہا ہے؟ میں تو بہت سنجیدہ ہوں۔ کیا خواہش، محبت، پیار اور جذبات بھی کبھی کسی کلچر کے تابع ہو سکتے ہیں؟ ہم سب صرف انسان ہیں اور ہمارے درمیان محبت اور انسانیت ہی تو سب سے اہم کلچر ہے''

خزاں کی آمد آمد تھی اور امریکا کے اس علاقے میں خزاں، بہار سے بھی زیادہ رنگین ہوتی ہے۔ درختوں نے پت جھڑ سے پہلے ست رنگا لباس زیب تن کر لیا تھا۔ ہر درخت کے پتے اودے، لال، تیز پیلے، ہلکے، گہرے سبز اور بنفشی رنگوں میں رنگے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے درخت نہ ہوں گویا شعلے ہوں، جو بجھنے سے ذرا پہلے پوری قوت سے بھڑک اٹھے ہوں۔ جھیل کے قریب ہی دو ہرن خاموش کھڑے کسی تصویر کا حصہ لگ رہے تھے۔ تبدیلی کے اس منظر میں روزی مکمل طور پر کھو چکی تھی۔ اس کے آس پاس قدم قدم پر خوشی، خوبصورتی اور زندگی کی امنگیں بکھری

ہوئی تھی لیکن کچھ ہی دن بعد موسم اور زندگی نے ایک ساتھ کروٹ لی اور سارے ماحول میں ایک ملگجا پن روزی کو جھنجھلا سا گیا تھا۔ ایک دن اچانک ان دوستوں کو دو بری خبریں ایک ساتھ ملیں۔ ایک تو انڈیا میں ونود کے بابا کی وفات ہوگئی تھی۔ بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے اسے اپنی ماں اور تین بہنوں کے پاس ہمیشہ کے لئے فوری انڈیا واپس چلے جانا تھا۔ دوسرا مسز سمتھ اپنا گھر بار بیچ کر گریگ کے ساتھ دوسرے شہر منتقل ہو رہی تھیں۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ وہ لوگ کچھ بھی نہ کر سکے بس آنکھوں میں آنسو بھرے ان کو جاتا دیکھتے رہے۔ جاتے جاتے مسز سمتھ روزی سے لپٹ گئیں اور روتے ہوئے بولیں " کبھی بھی یہاں سے جانے کا نہ سوچتی اگر بیٹے کی پڑھائی کا مسئلہ نہ ہوتا، جس طرح تم نے اس علاقے کو آنگن بنائے رکھا اس کا میں کیسے شکریہ ادا کروں، دیکھو ہمیں پتا ہی نہ چلا اور یہ دن بھی آ گیا، اپنا خیال رکھنا سوئیٹ ہارٹ " گھر پہنچنے تک روزی کا رنگ اتر چکا تھا۔ بوجھل قدموں سے اس نے ڈریسنگ ٹیبل پہ اپنا بیگ رکھا، کھڑکی کھولی اور ہوا سے گرتے پتوں اور نیچی پرواز کرتے پرندوں کی اڑان دیکھنے لگی۔

مسز سمتھ اور ونود کے چلے جانے تک سارے درختوں کے پتے جھڑ چکے تھے۔ منظر وہی تھا پس منظر بدل گیا تھا۔ ٹنڈ منڈ درخت عجیب ویرانی اور اداسی بڑھانے کا سبب بن رہے تھے۔ زمین پر بکھرے ہزاروں پتے جیسے خواہشوں کے بے جان لاشے نظر آتے۔ روزی کا بس چلتا تو سب کو اٹھا کر دوبارہ درختوں پر چپکا دیتی اور رنگوں سے پینٹ کر دیتی۔ ہر منظر میں پھر سے خوبصورتی بھر دیتی لیکن کیسے؟ یہ سمجھ نہ پاتی تھی۔ وہ شام کو باقی رہ جانے والے سب ہی دوستوں کو اکٹھا کرتی، زندگی بحال کرنے کی کوشش کرتی، رشتوں کو سہارا دیتی اور مسز سمتھ کی طرح گھر سے چیزیں تیار کر کے سب کو پیش کرتی۔ مگر جیسے ہی مسز سمتھ اور ونود کے خالی گھر پہ نظر پڑتی تو سبھی چہرے مرجھا جاتے۔ باقی لوگ تو اب بھی موجود ہوتے مگر پہلے کی طرح خوش نہ ہو پاتے۔ کچھ کھونے کا احساس اور ایک ویران بنجر زمین جیسا منظر اردگرد پھیلنے لگا۔ روزی ان کے چہروں کو بھانپ جاتی اور اپنے علاقے کے دلچسپ واقعات اور قصے کہانیوں سے ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔ نویں کلاس کی طالبہ سیلویا سے اس کے سکول کے بارے میں باتیں کرتی، بوڑھے جان کی دوا دارو کا پوچھتی۔ بچوں سے کارٹون والی کہانیاں سنتی۔ ایک دن تو مارتھا کی چھوٹی بچی

سوزن واکر سے لڑھک ہی گئی ہوتی اگر روزی وقت پہ نہ پہنچتی تو وہ ڈھلوان سے نیچے بھی گر سکتی تھی۔اسی پت جھڑ میں چند دن اور گزر گئے۔ایک مہینے کے بعد مسز سمتھ کے گھر میں ایک ادھیڑ عمر جوڑا اپنی تیرہ سالہ بیٹی سمیت رہنے کے لئے آ گیا۔وہ عجیب آدم بیزار سے لوگ معلوم ہوتے تھے۔سلام دعا تو در کنار، مسکرانا بھی جیسے گناہ سمجھتے۔یہ سب لوگ مسز سمتھ اور ونو کو یاد کر کے آہیں بھرتے اور جان اکثر نئے لوگوں کو دیکھ کر کہا کرتا "یہ ضرور کوئی مفرور مجرم ہیں۔کسی اور سٹیٹ میں فراڈ کر کے یہاں روپوش ہونے آئے ہیں۔اسی لئے اتنے اب چھپتے پھرتے ہیں "اسی گھر کی خاتون کو شام کے وقت ان لوگوں نے بالکونی میں کئی بار کھڑے دیکھا مگر اسکے چہرے پر ایسی ترشی اور نخوت چھپی ہوتی کہ کوئی بھی مخاطب کرنے کی جرات نہ کر پاتا تھا۔

ایک دن جب وہ لوگ جاب سے واپس آئے تو دیکھا کہ اُن کی پارکنگ لاٹ کو فیتے سے گھیر کر بند کر دیا گیا تھا اور وہاں "نو پارکنگ " کا بڑا سا بورڈ انکا منہ چڑا رہا تھا۔ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ اب روزانہ اتنی دور گیسٹ پارکنگ میں جانے کا تصور ہی ان کو دہلائے دے رہا تھا۔روزی نے اپنا سیل فون نکال کر کمیونٹی ہلپ لائن کا نمبر ملایا اور اسپیکر کھول دیا تاکہ سب لوگ گفتگو سن سکیں۔وہاں سے معلوم ہوا کہ اس گھر میں نئے آنے والے لوگوں کی شکایت پر اس جگہ کو بند کر دیا گیا ہے۔

گھر کے نئے مالک چاہتے ہیں کہ ان کے گھر کے ساتھ والی جگہ کو پارکنگ لاٹ کے طور پر استعمال نہ کیا جائے۔سپاٹ لہجے میں گھر کی نئی مالکن نے بتا دیا کہ ان کو یہ شور شرابہ بہت ناگوار گزرتا ہے اور ان کی پرائیویسی بھی متاثر ہوتی ہے۔اس لئے کمیونٹی نے اپنی جگہ واپس لے لی تھی۔یہ سن کر وہ سب دکھی دل سے بوجھل قدموں کو گھسیٹتے گیسٹ پارکنگ کی طرف جانے پر مجبور ہو گئے۔آج وقت نے ان کو ویٹو کر کے اپنی اہمیت اچھی طرح جتادی تھی۔کوئی نہیں جان سکتا کہ اس سے کب، کہاں اور کیا چھین لیا جائے یا اس کے اختیار کی مدت کتنی طویل ہے۔

روزی نے جاتے جاتے مڑ کر اسی منظر میں ماضی کو کھوجنا چاہا مگر اداسی کی دھند نے ان دونوں کے درمیان اجنبیت کا ایک دبیز پردہ تان دیا تھا۔جہاں زندگی، اپنائیت اور چہروں کی رونق

تھی اب جا بجا اداسی اور خاموشی کے ڈھیر لگے ہوتے جوانسانی بے بسی کا احساس دلاتے تھے ۔موسم کافی بدل چکا تھا اگلے ہی دن شدید برف باری شروع ہوگئی ۔یخ بستہ ہوائیں سائیں سائیں کررہی تھیں ۔سردی اتنی زیادہ تھی کہ منہ سے بولے جانے والے لفظ بھی ہواؤں میں جمتے محسوس ہورہے تھے۔

روزی نے جیسے ہی گیسٹ پارکنگ میں اپنی کار موڑی تو وہاں اس وقت صرف بوڑھا جان برف میں پھنسی اپنی چھوٹی سی کار نکالنے کی کوشش میں لگا نظر آیا۔اتنی مشقت کی وجہ سے وہ ہانپ رہا تھا۔وہ جلدی سے کار سے باہر نکلی اور اسکی مدد کرنے لگی۔برف کے طوفان میں تیزی آتی جارہی تھی۔اب تو ایک دوسرے کی طرف دیکھنا اور بات کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔وہ دونوں برف میں پھنسی کار نکالنے میں ہلکان ہورہے تھے ۔جتنی کوشش کرتے اتنا ہی زور سے انجن گڑگڑاتا مگر پہیے وہیں کے وہیں گھوم کر رہ جاتے ۔زیادہ زور لگانے سے گاڑی کے بے قابو ہوکر کسی بھی چیز سے ٹکرانے کا خطرہ تھا۔روزی اپنی کار سے برش نکال آئی اور زمین پر لیٹ کر کار کے پہیوں کے سامنے سے برف ہٹانے لگی۔آدھے گھنٹے کی شدید مشقت کے بعد وہ بڑی مشکل سے کار پارک کر کے گھر کی طرف چلے ۔ان کے پیر بار بار پھسل رہے تھے ۔اگر وہ اپنی پرانی پارکنگ میں سے گزرتے تو راستہ مختصر ہوجاتا مگر ذرا ڈھلوان ہونے کی وجہ سے روزی نہیں مان رہی تھی۔جان کے اصرار پر اوراس کی حالت دیکھتے ہوئے رسک لے لیا۔

وہاں گھپ اندھیرا دیکھ کر اسے یاد آیا کہ مسز سمتھ ان کے آنے سے پہلے ہی ہمیشہ پارکنگ کی لائٹ جلادیا کرتی تھیں تاکہ ان لوگوں کو زحمت نہ ہو۔لیکن آج وہی جگہ خود سے بھی چھپی ہوئی تھی ۔ نئے مکینوں نے مکانیت کا مفہوم ہی بدل دیا تھا۔اندھیرے کی وجہ سے جان اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پھسل کر پیٹھ کے بل گر گیا۔روزی نے ایمرجنسی کال کر کے بہت مشکل سے اسے اسپتال پہنچایا۔وہیں پر معلوم ہوا کہ چوٹ کی وجہ سے ریڑھ کی ہڈی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

اب آتے جاتے روزی پیپل کے پتے جیسی پارکنگ میں برف کو سوتے دیکھتی تو سبھی چہرے اس کی آنکھوں میں گھومنے لگتے۔۔پیپل کے پتے والی پارکنگ کیا بند ہوئی انکی محفلیں بھی جیسے اجڑ گئیں۔گیسٹ پارکنگ میں سب کو الگ الگ جگہ ملتی، پھر کوئی بھی کسی کا انتظار نہ کرتا۔کئی لوگوں کے دفتری اوقات بدل گئے۔کبھی کبھی روزی کی بھی نائٹ شفٹ لگ جاتی۔واپسی پر سب کو گھر جانے کی جلدی ہوتی۔شام ہوتے ہی لوگ اپنے گھروں میں دبک جاتے اور کھڑکی بند کر کے روزی بھی اپنے بستر پہ گر جاتی۔پھر کچھ ایسا ہوا کہ سبھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔خاص کر ایشیائی باشندے۔

بعض اوقات کسی کے کئے کی سزا کسی اور کو بھگتنی پڑتی ہے، سو اس بار روزی نشانہ بنی ایک دن وہ اور ازابیل اپنی نائٹ ڈیوٹی کر کے ایک بجے پارکنگ سے اپنے گھر کی طرف آ رہی تھیں کہ کچھ ٹین ایجرز نے خنجر مار کر اسے کافی زخمی کر دیا اور پرس لے کر بھاگ گئے تھے۔خبر ملنے پر وہ سب بھاگم بھاگ اسپتال پہنچے۔ازابیل ڈری ڈری سہمی سہمی آواز سے سب کو پورا واقعہ سنانے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ روزی ایمرجنسی میں آنکھیں موندے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔اس کے والدین پاکستان گئے ہوئے تھے۔اس نے سختی سے انہیں اطلاع دینے سے منع کر دیا تھا۔اس کے زخمی ہونے کی خبر نئے ہمسائیوں تک بھی پہنچی۔کچھ دن اس نے ہسپتال میں گزارنے تھے سب اسکی کمی شدت سے محسوس کرتے اور اس کے واپس خیریت سے گھر لوٹنے کے لئے مختلف تیاریاں کرتے رہتے۔سلویا بار بار اس کو یاد کرتی، اس نے تو روزی کو سرپرائز دینے کی خاطر اس کی تصویر کا پنسل سکیچ بھی بنا ڈالا۔باہر برف گر رہی تھی، سناٹا یہاں ہڈیوں کی مخ تک اتر چکا تھا مگر وہ روزی کی تصویر میں رنگ بھرنے کا سوچ رہی تھی۔روزی کا تصور رنگوں خوشیوں اور خوبصورتیوں سے جڑا تھا۔ وہ اس کی تصویر میں یہی زندگی بھرنا چاہتی تھی۔۔کتنے ہی پتے اس نے چن چن کر اس نے درختوں میں جڑ دیے۔پارکنگ میں ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ لگنے سے جان ہمیشہ کے لئے معذور ہو گیا تھا۔

تنہائی کا مارا کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا ہسپتال سے فارغ تو ہو گیا لیکن وہیل چئیر کے ساتھ۔ اپنی دوائیوں کو دیکھتا تو پارکنگ لاٹ میں روزی کے مشورے یاد آتے۔مسز سمتھ ہر روز ایزابیل کو فون کر کے روزی کی خیریت دریافت کرتی۔ اس کے بیٹے گریگ نے تو روزی کو پھولوں کا گلدستہ بھی بھیجا۔ ونود نے بھی سب کو ای میل کی اور روزی کی صحت یابی کے کئے دعاوں بھرے پیغامات دیئے۔ اپنے مستقبل کے لئے وہ روزی جیسی لڑکی کی تلاش میں تھا۔ مارتھا کے بچے روزانہ سوتے وقت روزی کے زخمی ہونے کی کہانی سنتے اور سو جاتے۔ ڈورتھی، روزی کی کمی پوری کرنے کی کوشش کرتی۔ جب بھی کافی بنا کر دوستوں کو پیش کرتی، روزی کو یاد کرتی اور بے چین سی ہونے لگتی۔

ایک ایک کر کے سبھی کی آنکھوں میں روزی کی کمی آنسو بن کر جھلملانے لگی تھی۔ جس دن روزی ہسپتال سے فارغ ہوئی اس دن شدید دھند تھی۔ کچھ دیر بعد ہی موسم بہتر ہونے لگا۔۔ ' سورج کی کرنیں درختوں کی ٹہنیوں کو چھونے لگیں تو پرندے سیٹیاں بجاتے دانا دنکا تلاش کرنے لگے۔ سیلویا کی پینٹنگ مکمل ہو رہی تھی۔ ایک مسکراہٹ اس کے چہرے سے اترتی سارے ماحول پہ پھیلنے لگی۔ کچھ پرندے تو اس جگہ سے ہجرت کر کے کہیں اور منتقل ہو چکے تھے جو اس موسم کی سختی سے آشنا تھے وہ گھنے درختوں کی ٹہنیوں میں وقفے وقفے سے آوازیں نکال کر اپنے ہونے کا احساس دلاتے۔ دھند پھلانگتے، سوچتے، روزی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس دن بھی ازابیل اس کے ساتھ تھی۔

جب وہ دونوں پارکنگ لاٹ کے قریب پہنچیں اور گاڑی سے اترنے لگیں تو انہوں نے پیچھے سے ایک غیر مانوس آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا تو مسز سمتھ کے مکان میں آنے والی اس مغرور عورت نے اسے بہت لجاجت سے پکارا تھا۔ روزی کو اس کی دبنگ شخصیت اور لہجے کا یہ تضاد بہت کھلا۔ "میں تم دونوں سے کچھ کہنا چاہتی ہوں "وہ عورت جھجکتے ہوئے بولی۔ "فرمایئے "ایزا بیل نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہو کہا۔ وہ ان دونوں کے قریب چلی آئی، دور آسمان سے دھند

چیرتے سورج کی ایک کرن اس چھوٹی سی جگہ کو روشن کرنے لگی تھی۔ پارکنگ لاٹ کی طرف روزی نے اور اس کی طرف کارکنگ لاٹ نے دیکھا۔ پھر اس کی نظر اس عورت پہ پڑی۔ آج چہرے کی سختی پگھلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جب سے اس کے شوہر کو فالج ہوا تھا اس کی در و دیوار سے برف پگھلنے لگی تھی۔ وہ ان دونوں کے سامنے نظریں جھکا کر وہ بولی "بہت دکھ ہوا تھا روزی اس حادثے کا سن کر، تمہیں واپس آتا دیکھ کر مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے ہے، ہم اپنے کئے پہ شرمندہ ہیں۔ اور ہمیں اس کی سزا بھی مل چکی ہے۔۔

میری بیٹی روزانہ بالکونی میں آتی اور تمھاری کھڑکی کے کھلنے کا انتظار کرتی۔ اسے تم بہت پسند ہو بلکہ اس کی آئیڈیل شخصیت ہو اور وہ بھی بڑی ہو کر بالکل تمھارے جیسی بننا چاہتی ہے۔ یہ سن کر روزی مسکرادی۔ اچھا۔۔۔ سنو۔ وہ عورت روزی سے کچھ کہتے کہتے جھجک سی گئی۔ کیا میں تم سے ایک درخواست کر سکتی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں تم ہر وقت سب کی مدد کرتی رہتی ہو؟" "جی جی کہیے پلیز میں آپکی کیا خدمت کر سکتی ہوں "روزی حیرت سے اسکا منہ دیکھ کر پوچھنے لگی جس پر کچھ عرصہ پہلے دنیا جہاں کی وحشت پھیلی ہوئی تھی۔ "وہ۔۔۔ دراصل تم تو نہیں جانتی ہو جب تم اسپتال میں تھیں تو فالج اٹیک کی وجہ سے میرے میاں ہمیشہ کے لئے معذور ہو چکے ہیں۔ میں نے پچھلے دس سال سے کوئی جاب نہیں کی۔ جہاں بھی جاب کے لئے جاؤں نا تجربہ کار کہہ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ ساری جمع پونجی ختم ہونے کو ہے۔ کبھی سنا تھا کہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔

ہمارے ساتھ بھی ویسا ہی ہوا۔ بنک سے قرضہ لے کر بزنس میں لگایا تھا۔ سب کچھ ڈوب گیا۔ صدمے نے میرے خاوند کو ہمیشہ کے لئے مفلوج کر دیا ہے۔ بیٹی ابھی چھوٹی ہے، پھر اپنے باپ کا خیال بھی رکھتی ہے۔ دو مہینے تک گھر کا کرایہ نہ دیا تو حکومت گھر چھین لے گی۔ کیا تم اور تمھارے دوست میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟ "اکھڑے اکھڑے سانسوں کے ساتھ اس نے اپنی بات مکمل کی۔" کیسی مدد "اس کی مجبور شکل دیکھ کر روزی کا دل پسیج گیا اور وہ بھول گئی کہ یہ

وہی عورت ہے جو کبھی ان کی تکلیف کا باعث بنی تھی۔ دور کسی درخت سے ایک پیپل کا پتا اڑتا، لہلہاتا ہوا روزی کے عین دل پہ آ گرا۔ اسی لمحے ڈھیل چیئر گھسیٹتا جان بالکونی میں چلا آیا۔

سارے محلے میں خبر ہو چکی تھی کہ روزی واپس گھر آ گئی ہے۔ ایک لمبا سانس لے کر وہ عورت بولی "پلیز، میرے لئے کوئی جاب ڈھونڈنے میں مدد کر دو اور دوسرا میرے گھر کی بیسمنٹ کرائے پر دینے کے لئے اپنے آفس میں اسکا اشتہار لگا دو۔ شاید وہاں سے کوئی کرائے پر لینے آ جائے۔ میں تو یہاں کسی کو جانتی تک نہیں ہوں۔ اگر جلدی ایسا نہ ہو سکا تو ہم بے گھر ہو جائیں گے" یہ سن کر روزی بھی افسردہ ہو گئی اور اس سے ساری معلومات لے لیں اور ایک مقامی اخبار کے دفتر فون بھی کر دیا۔ سب دوستوں کو بھی کہا۔ وہ لوگ اپنی سی ہر ممکن کوشش کرنے لگے۔ سمنتھا کی مدد سے اسے ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں بہت کم پیسوں پر نائٹ شفٹ میں جاب تو مل گئی مگر ان پیسوں سے گھر چلانا ممکن نہ تھا۔

اس نے ان لوگوں سے کہ سن کر اپنے گھر کے سامنے والی دو پارکنگ میں سے ایک پارکنگ بھی دو سو ڈالر ماہانہ کرائے پر ڈورتھی کو دے دی۔ ایسی کسمپرسی کی حالت میں یہ اضافی دو سو ڈالر ایک بہت بڑی مدد تھی۔ چند دن بعد ایک بار پھر اس عورت نے روزی کو پکارا جب وہ اپنے گھر کی سیڑیاں چڑھ رہی تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی اس کے پاس آئی اور بولی کہ وہ اپنی ایک غلطی کو سدھارنا چاہتی ہے۔ جس کے لئے مجھے تمھاری مدد چاہیے۔ اس کا لہجہ اس کے چہرے کے تاثرات کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیپر دبا ہوا تھا اور وہ چاہتی تھی روزی اس کے ساتھ محلے کے ہر گھر میں جا کر اس پر سائن کروائے تا کہ کمیونٹی سے وہ پارکنگ والی جگہ واپس لی جا سکے جو اسکے گھر کے ساتھ موجود تھی۔ جو اس نے پہلے خود اپنی مرضی سے بند کروائی تھی۔

جب انہوں نے کمیونیٹی کو درخواست لکھنے کا فیصلہ کیا اس دن برف پگھل رہی تھی تیز

سورج کی روشنی میں پورے علاقے کو تمازت بخش رہی تھی۔ اسی لئے کافی دن بعد وادی میں بھی چہل پہل نظر آنے لگی، روزی کے والدین بھی لوٹ آئے تھے۔ پارکنگ لاٹ میں بیٹھنے والے روزی کے گھر کی طرف چلنے لگے۔ ان میں سیلویا بھی تھی جو روزی کی رنگوں اور زندگی سے بھرپور پینٹنگ فولڈ کیے اپنی ماما کے آگے آگے چل رہی تھی۔ ہرن کلانچیں بھرنے لگے۔ بطخیں گیں گیں کرنے لگیں۔ سب کے سب ایک طرف روزی کو دیکھتے اور دوسری طرف اس عورت کو۔ روزی او رازابیل نے سب کے سامنے اس عورت کی کی درخواست رکھی جس پہ سب نے خوشی خوشی سائن کر دیے۔ کچھ لوگ وہیں سے اٹھے اور کمیونیٹی دفتر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ شام ڈھلے روزی نے اپنی کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور باہر دیکھنے لگی، بہت کچھ ویسے کا ویسا تھا اور بہت کچھ بدل چکا تھا۔ کمیونیٹی کا دفتر کچھ دور نہ تھا وہاں سے خبر ملی کہ اب کی بار کمیونٹی نے وہ جگہ واپس دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ چند دن بعد وہاں کمرشل استعمال کے لئے نئی عمارت تعمیر کرنے والے تھے۔ یہ خبر سن کر اس مغرور عورت کے چہرے پر ناامیدی ایسے کھنڈ گئی جیسے کسی قیدی کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی ہو اور وہ تھکے ہارے قدموں سے اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔

اچانک موسم کے تیور بدلنے لگے اور ہر طرف برفانی ہوائیں چلنے لگیں۔ آسمان سفید سفید برف کو موتیوں کی طرح برسانے لگا۔ روزی نے اپنی کھڑکی سے جھانکا تو اس کی نظر سامنے والے گھر پر جا پڑی۔ وہ مغرور عورت اپنی بالکونی میں بغیر گرم کپڑوں کے کسی بت کی طرح ایستادہ تھی اور سردی کے احساس سے عاری جھیل کی طرف نظریں جمائے جیسے کچھ کھوجنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ روزی کو ایک لمحے کے لئے ایسا لگا جیسے یہ ساری برف، سردی اور سرد مہری اس عورت کے جسم سے دھویں کی طرح پھوٹ رہی ہے اور پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ اسی اثناء میں ایک کار وہاں آ کر رکی جس میں سے ایک خوبصورت لڑکی اتر کر اندر چلی گئی۔ وہ عورت شاید اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ مکان کی قسط ادا نہ کئے دو مہینے ہونے والے تھے۔ کل آخری تاریخ تھی۔ اگر پیسے جمع نہیں ہو سکے تو پرسوں ان کا گھر زبردستی خالی کروالیا جاتا۔ سارا سامان اٹھا کر باہر

پھینک دیا جاتا۔اس کی آخری امید آج رات کو آنے والی ایک یہی لڑکی تھی جو اس وقت گھوم پھر کر بیسمنٹ کرائے پر لینے کے ارادے سے دیکھ رہی تھی۔اس کو وہ سب بہت پسند آیا تھا۔

مگر ایگریمنٹ سائن کرنے سے پہلے جیسے لڑکی کو اچانک کچھ یاد آیا اور وہ چونک کر بولی "ارے،سب کچھ طے کر لیا مگر پارکنگ کا تو آپ نے بتایا ہی نہیں۔وہ مجھے کہاں کرنی ہوگی کیونکہ آپکی اپنی پارکنگ میں تو پہلے سے دو کاریں کھڑی ہیں؟ "یہ وہ سوال تھا جس کا جواب دینے سے اس عورت کو اپنی جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ ابھی ملنے والی ساری خوشی دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہوگئی۔اس نے لمبی سانس کھینچ کر سوچا کہ کاش ہر آنے والا کرایہ دار اس سے آخر میں یہ ظالم سوال نہ پوچھا کرتا تو کتنا اچھا ہوتا۔اس نے شدید خوف اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کھڑکی سے باہر گھنے درختوں والے جھنڈ کے پیچھے کہیں نظر نہ آنے والی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔

''وہاں کہاں؟''

وہ لڑکی کچھ بھی سمجھ نہ پائی اور ہونق بنی اسکا منہ دیکھنے لگی۔"راستے میں آتے ہوئے تم نے گیسٹ پارکنگ کا بورڈ تو دیکھا ہوگا۔بس وہاں پر "یہ کہتے ہوئے عورت کی آواز بھرآئی اور اس کا دل امید و ناامیدی کے پنڈولم پر جھولنے لگا۔اس کا رواں رواں جیسے نوارد کے منہ سے ایک "ہاں "سننے کے لئے بھکاری بن گیا تھا۔

لڑکی نے ایک لمحے کو کچھ سوچا۔سائن کرنے کا ارادہ ترک کیا اور پریشانی سے نفی میں سر ہلا کر بولی "اوہ۔۔نو "اتنی دور؟میری تو اکثر نائٹ ڈیوٹی ہوتی ہے۔میں تو رات کو بہت دیر سے گھر آتی ہوں۔مجھے لازمی گھر کے قریب کہیں پارکنگ چاہیے۔آئی ایم سوسوری۔حالانکہ میں تو آج آنے والے طوفان کی وجہ سے بیسمنٹ پسند آجانے کی صورت میں رات یہیں رکنا چاہ رہی تھی۔مگر اب بہت معذرت چاہتی ہوں آپکا قیمتی وقت ضائع کیا مگر میں یہ بیسمنٹ کرائے پر نہیں لے سکتی۔

یہ کہنے کے بعد وہ لڑکی دنیا کی سب سے زیادہ مجبور اور بے بس عورت کی طرف دیکھے بنا تیزی سے باہر نکلی تو "نو پارکنگ "والے بورڈ کے ساتھ ہی پیپل کے پتے کی جیسی پارکنگ پہ

اس کی نظر پڑی، وہ حیرت سے اس کا جائزہ لینے لگی۔اسی لمحے اپنے گھر کی کھڑکی سے روزی بھی پارکنگ لاٹ کو دیکھنے لگی، ادھیڑعمر مغرور عورت کی تیرہ سالہ بیٹی نے اپنی کھڑی سے روزی کو دیکھا تو مسکرائی اور لاشعوری طور پر روزی کے انداز میں ٹوپی اور اسکارف گلے میں لپیٹ لیا۔ نقاہت سے بھرا بوڑھا جان وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے کمبل اوڑھنے لگا۔ مارتھا کے بچوں نے روزانہ کی طرح آج بھی روزی کی کہانی سنی۔ ہرنوں نے اپنے ٹھکانوں کی راہ لی اور آنکھیں موندنے لگے۔

سیلویا، روزی کو اپنے اسکول فنکشن پر لے جانے کا پروگرام بنانے لگی۔۔۔۔کرایہ دار لڑکی نے اپنی کار میں بیٹھنے سے پہلے حیرت سے مڑ کر اس نو پارکنگ والی جگہ کو دوبارہ غور سے دیکھا اور خود کلامی کے سے انداز میں بولی "یہ جگہ کتنی آئیڈیل ہے۔کاش۔۔۔۔ میں یہاں اپنی کار پارک کرسکتی "تو ابھی یہ بیسمنٹ کرائے پر لے لیتی۔ پھر مایوسی سے سر ہلایا اور خود سے پہلے آنے، آکر جانے والے کرایہ داروں کی طرح کبھی واپس نہ لوٹنے کے لئے اندھیرے راستے پر قدم بڑھا دیے۔اس کے پیچھے سے ادھیڑ عمر عورت چلائی۔

"رکو،سنو، پلیز مت جاؤ۔تم روزانہ اپنی کار میرے گھر کے سامنے کھڑی کر لیا کرنا۔ میں اپنی پارکنگ تمھیں دے دوں گی اور خود روزانہ گیسٹ پارکنگ میں اپنی کار کھڑی کیا کروں گی" اس لڑکی کو روکتے وقت زمانے بھر کا درد التجا بن کر اس عورت کے لہجے میں سمٹ آیا تھا۔ یخ بستہ برفیلی ہوائیں چیختی ہوئی دروازوں اور دیواروں سے سر ٹکرا رہیں تھیں، رات گہری ہوتی جا رہی تھی ۔برف کا طوفان بڑھتا جا رہا تھا۔روزی کھڑکی کے پردے برابر کرنے لگی تو دیکھا کہ وہ کرایہ دار لڑکی اپنی کار اس عورت کے گھر والی پارکنگ میں کھڑی کر چکی تھی اور وہ مکان مالک خود برف میں گرتے پڑتے بمشکل لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی کار تک پہنچی اور اس میں بیٹھ کر گیسٹ پارکنگ کے اندھیروں کی طرف بڑھنے لگی۔

☆☆☆☆

کباڑیا

خاقان ساجد (راولپنڈی، پاکستان)

چھاؤنی کی حدود سے باہر مضافات کی طرف جانے والی سڑک کے اردگرد جہاں کبھی سرسبز کھیت اور اینٹ گارے سے بنے اکادکا مکانات ہوا کرتے تھے' وہاں اب بے ہنگم رہائشی کالونیاں وجود میں آچکی تھیں۔سڑک کے دونوں جانب دور تک ہر طرح کی دکانیں' گودام' سی این جی اسٹیشن' تعمیراتی سامان کے بڑے بڑے سٹور اور ماربل فیکٹریاں بن گئی تھیں۔راجا مشکور کا ''آر کو آکشن مارٹ'' بھی یہیں واقع تھا۔پندرہ سولہ مرلے کے پلاٹ کے ایک تہائی حصے پر چند بڑے بڑے کمروں اور برآمدے پر مشتمل سادہ سی عمارت ہر طرح کے فرنیچر' برقی آلات' انواع واقسام کے آرائشی سامان اور الم غلم اشیاء سے بھری ہوئی تھی۔ برآمدے میں گتے اور کاغذ کی ردی کے ڈھیر لگے رہتے۔جبکہ صحن لوہے اور پلاسٹک کی بے کار چیزوں' کانچ کی بوتلوں اور ٹین ڈبوں سے اٹا پڑا تھا۔کباڑ کے انبار ہمالہ آثار کے ساتھ جستی چادروں سے بنے شیڈ کے نیچے تلائی کے دو بڑے کانٹے اور باٹ رکھے تھے۔اسی جگہ 70 سی سی کی ایک پھٹیچر موٹر سائیکل چھوٹے اسٹینڈ پر ترچھی کھڑی ہوتی۔قریب ہی تین ٹانگوں والی کرسی پر بیٹھ کر سرتاپا لنڈے میں ملبوس راجا مشکور گاہکوں کی راہ تکا کرتا۔سرسری نگاہ سے دیکھنے پر وہ خود بھی اردگرد ڈھیر کاٹھ کباڑ کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔کرسی کی چوتھی ٹانگ لگوانے کی اس نے ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔کئی برسوں سے اینٹیں جوڑ کر اسے سہارا دے رکھا تھا۔کوئی بے تکلف بیوپاری یا گاہک اس حوالے سے عار دلاتا تو ہنستے ہوئے جواب دیتا:

''او جی! کام ہی چلانا ہے ناں! پانچ سالوں سے بہترین کام چل رہا ہے۔ ورنہ صحیح سلامت نئی کرسیاں اندر ڈھیر پڑی ہیں۔۔۔''

''کام ہی چلانا ہے ناں۔'' موصوف کا تکیہ کلام تھا اور اسکی مخصوص ذہنی ساخت' سوچ اور اپروچ کا مظہر۔ کام چلاؤ جی' کام چلنا چاہئے' گزارا کرو جی۔۔ اس طرح کے جملے کثرت سے بولتا۔ ''سودا'' کا لفظ بھی گفتگو میں بہت زیادہ استعمال کرتا۔ سوداڈن ہوگیا' سودافٹ ہوگیا' سوداخراب ہوگیا' سودا برابر آگیا۔۔

عمر تیس برس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ صحت اور صورت شکل بھی اچھی تھی مگر پھر بھی اپنے حلیے اور لباس پر بالکل توجہ نہ دیتا۔ شیو اکثر بڑھی رہتی۔ کئی کئی دن نہائے ہوئے گزر جاتے۔ اس کی تمام تر دلچسپیاں کاروبار تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ گھریلو سامان اور کباڑ کی فروخت یا خریداری کے لئے آنے والوں کا برابر گرم جوشی سے استقبال کرنے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتا۔ رہائش بھی کباڑ خانے کے ایک کمرے میں اختیار کر رکھی تھی۔ گھر بسانے کا جھمیلا ہی نہیں پالا تھا۔ جونہی کوئی گاہک احاطے میں قدم رکھتا اسے دیکھ کر لگا بندھا خیر مقدمی کلمہ ادا کرتا:

''بسم اللہ۔ آؤ جی۔''

کوئی مجبور انسان ایک ہزار روپے کی چیز بیچنے آتا تو اسے سو روپے کی پیش کش کرتے ہوئے کہتا:

''کام چلاؤ جی۔''

وہ احتجاج کرتا تو جواب دیتا:

''اور کیا دوں؟ آخر مجھے بھی اپنا کام چلانا ہے!''

خریدار کو چیز بیچتے ہوئے اس کی گفتگو اس قسم کی ہوتی:

''یہ دیکھیں بالکل نئی نکور ہے۔ شوروم سے ہزار بارہ سو سے کم میں نہیں ملے گی۔ میں نے نو سو روپے میں خریدی ہے۔ آپ مجھے منافع نہ دیں۔ اپنا کام چلائیں۔۔''

قدرت بعض لوگوں کو کسی مخصوص کام کے لئے دنیا میں بھیجتی ہے۔ راجا انہی میں سے ایک تھا۔ وہ فطری کباڑیا تھا۔ اگر خمیر میں کوئی کمی رہ گئی تھی تو وہ گھر کے عسرت زدہ ماحول نے پوری کر دی تھی۔ ابھی ماں کے بطن ہی میں تھا کہ باپ نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ جوان بیوہ اور نومولود یتیم

کے ساتھ رشتہ داروں نے وہی سلوک روا رکھا جو اس معاشرے کا عام چلن ہے۔جب کسی نے سر پر ہاتھ نہیں رکھا تو نادار عورت نے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پالنے کے لئے چھاؤنی کی دو تین کوٹھیوں میں کام شروع کر دیا۔اکلوتے بچے کو پال پوس کر جوان کرنا اس کا واحد مقصد حیات تھا۔

ماں جو مشقت کرتی تھی اس سے دو وقت کی روٹی تو میسر آ جاتی تھی مگر دیگر ضروریات زندگی کے لئے اترنوں پر انحصار کرنا پڑتا۔کرائے کے چھوٹے سے گھر میں ضرورت کی ہر شے رحم دل اور فیاض بیگمات کی بخشی ہوئی تھی۔راجا جب پانچ چھ سال کا ہوا تو ایک بیگم صاحبہ کے سمجھانے بجھانے اور ذاتی کوشش سے اسے سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔اس کی اسکول یونیفارم، بستہ، کتابیں، عام کپڑے اور کھلونے بھی بیگمات کی عطا ہوتے۔اس طرح اس نے نو جماعتیں پاس کر لیں۔سکول آتے جاتے یا یونہی آوارہ پھرتے ہوئے اسے جہاں کہیں کوئی گری پڑی چیز ملتی اسے اٹھا لیا کرتا۔یوں اس کے ذاتی اثاثے میں پرفیوم کی خالی خوش نما شیشیاں، ہر برانڈ کے سگریٹ کی ڈبیاں، رنگین تصویروں والی ماچسیں، کاسمیٹکس کی خوبصورت پیکنگز، چینی کے دیدہ زیب ٹوٹے ہوئے گل دان، استعمال شدہ مارکر اور بال پین، لوہے کے چھوٹے چھوٹے بے کار پرزے اور ایک دو مقناطیس بھی شامل ہو گئے تھے۔بچپن میں اس نے ایک فوجی افسر کے بچے کی استعمال شدہ ٹرائیسکل چلائی تھی۔جب دسویں میں پہنچا تو کہیں سے ایک پرانی بائیسکل بھی مل گئی۔اس وقت تک اسے ردی اخبار، کاپیاں، کتابیں، گتے اور خالی بوتلیں بیچنے کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔جب کوٹھیوں سے لائی ہوئی انواع و اقسام کی بے کار چیزیں ذرا زیادہ جمع ہو جاتیں تو ماں بیٹا محلے کے کباڑیے کے ہاتھ بیچ آتے تھے۔کبھی اپنا پسندیدہ مشروب فانٹا پینے کو جی چاہتا تو وہ خود بھی سٹاک میں سے کوئی چیز اٹھا کر کباڑ خانے جا پہنچتا۔دسویں جماعت میں ترقی پانے تک خان کباڑیے سے اس کی اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔اس کے مشورے پر وہ فارغ اوقات میں نزدیکی گنجان آباد بستیوں کا سائیکل پر چکر لگانے لگا۔ابتداء میں جھجک اور شرم مانع ہوئی مگر جلد ہی گلی خالی پا کر صدا لگانے لگا:

''چھان بورا بیچ، سوکھی روٹی بیچ، ردی اخبار بیچ، ٹین ڈبہ، لوہا پرانا، نائیلون کی جوتیاں بیچ۔۔''

جب خان کی دی ہوئی نقدی ختم ہو جاتی اور سائیکل کے کیریئر پر لٹکائے ہوئے دونوں بورے بھر جاتے تو وہ واپسی کی راہ لیتا اور کمیشن وصول کر کے شاداں و فرحاں گھر لوٹ جاتا۔جلد ہی پیسوں کی کشش نے اسے سکول کا راستہ بھلا دیا۔اس نے کباڑ خانہ چلانے کے لئے کاروباری

رموز اتنی جلدی سیکھ لئے کہ ذاتی کاروبار کے خواب دیکھنے لگا۔ یہ سوچ کر اکثر حیرت میں ڈوب جاتا کہ کوڑیوں کے مول خریدی ہوئی اشیاء فوراً دگنے پیسوں میں کیسے بک جاتی ہیں! بڑے بڑے بیوپاریوں کے کارندے خود ہی مال اٹھانے کیسے پہنچ جاتے ہیں؟ نقد ونقدی ادائیگیاں ہوتی ہیں اور فٹافٹ مال ٹھکانے لگ جاتا ہے!

تیس برس کی عمر کو پہنچنے تک راجا اپنا ذاتی کباڑ خانہ کامیابی سے چلانے لگا تھا۔ اگلے دو سالوں میں اس نے ''آر کو آکشن مارٹ'' کی بنیاد ڈالی تو اس کا بینک بیلنس اتنی تیزی سے بڑھا کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ ماں نے گذشتہ پانچ چھ سالوں سے کوٹھیوں میں کام چھوڑ کر مصلا بچھا لیا تھا۔ مگر خوش حالی آنے کے باوصف طبعاً شکر گزار عورت اپنی محسن اور مہربان بیگمات کو نہیں بھولی تھی۔ وہ ان سے ملنے اکثر بنگلوں پر جایا کرتی۔ بیگموں کو بتاتی کہ اب وہ اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کے لئے بے حد بے قرار ہے۔ خود راجا کا انگ انگ عورت، عورت پکارتا تھا۔ مگر کاروباری مصروفیات اور روزافزوں ترقی نے اسے اپنے سحر میں کچھ اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ اس لازمے پر سوچنے کی اسے فرصت ہی نہ ملتی۔ ماں کبھی یہ قصہ چھیڑ بیٹھتی تو شادی کے لئے ضروری بری کے جوڑوں، طلائی زیورات اور ولیمے پر اٹھنے والے اخراجات کا تخمینہ لگاتے ہوئے حوصلہ ہار جاتا۔ بیوی کو دو وقت کھانا کھلانے پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر شادی کے جملہ مصارف کا سوچ کر جان نکلنے لگتی تھی۔

راجا دھیلا بھی خرچ کرنے لگتا تو پہلے دس مرتبہ سوچتا۔ اس کا قول تھا کہ چیز اولاً ضرورت کے تحت خریدنی چاہئے، قصداً یا محض شوقیہ ہرگز نہیں۔ دوئم جس شے کی ضرورت ہو اگر وہ اچھی حالت میں سیکنڈ ہینڈ مل جائے تو نئی پر پیسہ برباد کرنا نری حماقت ہے۔ کسی دوست کو کوئی نئی شے خریدتے دیکھتا تو ناصحانہ انداز میں کہتا:

''سیکنڈ ہینڈ سے کام چلاؤ جی۔۔ نئی کیا کرنی ہے۔ خوام مخواہ کا خرچہ ہی ہے۔۔''

اس کے اپنے استعمال میں جتنی چیزیں تھیں سبھی سیکنڈ ہینڈ تھیں۔ موبائل فون، کلائی گھڑی، بٹوہ، موٹر سائیکل، پلنگ، ٹی وی ٹرالی، ٹی وی، الماری، قالین، پردے اور برتن سب پرانے تھے۔ حتیٰ کہ تن کے کپڑے بھی ہاتھی چوک کے قریب واقع ''کراؤن امپورٹڈ کلودنگ سنٹر'' سے خریدا کرتا۔

اپنی مستحکم مالی حیثیت کا بھید اس نے اپنی ماں کو بھی نہیں دیا تھا۔ اس نے باور

کرلیا تھا کہ بیٹے کا کاروبار بظاہر پھیلا ہوا لگتا ہے، آمدن اتنی نہیں ہے۔ایک روز مارٹ کے قریب ہی وہ بدنصیب عورت سڑک کے حادثے میں شدید زخمی ہوئی اور اگلے ہی روز بیٹے کا گھر بسانے کی حسرت دل میں لئے اس جہان فانی سے رخصت ہوگئی۔تعزیت کے لئے قریبی رشتہ دار اور برادری کے لوگ آئے تو راجا نے ان کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اپنایا۔وہ سوچ رہا تھا کہ غربت کے دنوں میں جب ان لوگوں کی مدد کی ضرورت تھی تو کسی نے جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا تھا۔اب وہ آسودہ حال ہے تو سب خواہ مخواہ بڑھ چڑھ کر اپنائیت کا اظہار کر رہے ہیں۔بعید نہیں کہ قریبی تعلقات استوار کرنے کی آڑ میں مال ہتھیانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہوں۔صرف حلیمہ نامی ایک عورت اسے پرخلوص لگتی، جو اس کی رشتے کی خالہ تھی۔وہ مرنجاں مرنج عورت اس کے کباڑ خانے کے قریب کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔سڑک سے گزرتے ہوئے اکثر احوال پوچھنے آجاتی۔اسے دیکھ کر راجا کو اپنی مرحومہ ماں یاد آنے لگتی۔ماسی حلیمہ بھی امیروں کی کوٹھیوں میں کام کر کے گزر اوقات کرتی تھی۔راجا فارغ ہوتا تو اس کے سامنے پلاسٹک کی کرسیوں میں سے ایک گھسیٹ کر بیٹھ جاتی۔چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتی اور پھر دعائیں دے کر رخصت ہو جاتی۔

راجا نے بارہا محسوس کیا تھا کہ ماسی جب بھی اس کے سامنے آکر بیٹھتی ہے، اس کی کرسی کے نیچے جڑی ہوئی اینٹوں کو بڑے غور سے دیکھتی ہے۔بالآخر ایک روز دل کی بات اس کی زبان پر آ ہی گئی:

''مشکور پتر۔اب تم اتنے بڑے سیٹھ بن گئے ہو۔اپنے بیٹھنے کے لئے نئی کرسی ہی خرید لو۔۔''

راجا مسکرایا:

''ماسی پہلی بات تو یہ ہے کہ میں سیٹھ ویٹھ بالکل نہیں ہوں۔بس سمجھو کام چل رہا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ بہت سی نئی کرسیاں اندر پڑی ہیں۔فرنیچر کی مرمت اور پالش کرنے والے کاریگر بھی شوروم کے پچھلے حصے میں کام کر رہے ہیں۔لیکن اس کرسی میں کوئی خرابی نہیں۔اس کی سیٹ اور بیک میں بہترین فوم اور لیدر استعمال کیا گیا ہے۔پانچ چھ سال سے فسٹ کلاس کام چل رہا ہے۔جب یہ بیچاری مجھے کچھ نہیں کہتی تو میں اسے کیوں رد کروں؟''

ماسی حلیمہ مسکرائی اور کسی گہرے خیال میں گم ہوگئی۔قدرے توقف کے بعد کہنے لگی:

''اچھا میں چلتی ہوں۔تمہاری یہ جگہ بڑی ہی ٹھنڈی ہے۔مجھے تو کمنی لگ گئی ہے!''

اگلی صبح ابھی راجا بستر میں نیم دراز چائے پینے میں مشغول تھا کہ ماسی دوبارہ آ ٹپکی۔راجا اس کی بے وقت اور غیر متوقع آمد پر حیران ہوا۔اس کے چہرے پر فکر اور گومگو کی کیفیت دیکھ کر پوچھنے لگا:

''ماسی خیر ہے نا؟''

''میرے پاس کچھ گھریلو سامان ہے جسے بیچ کر نئی نٹنگ مشین خریدنا چاہتی ہوں۔اگر تم خریدنا چاہتے ہو تو چل کر دیکھ لو۔''

ماسی نے سادگی سے کہا۔

راجا ہنسنے لگا:

''بس ماسی! میں تو گھبرا ہی گیا تھا تمہیں پریشان دیکھ کر۔لو چائے پیو۔۔''پھر کہنے لگا''ماسی! میں کباڑیا ہوں۔میرا تو کام ہی سیکنڈ ہینڈ مال ٹھکانے لگانا ہے۔اس پیشے میں سوئی سے لے کر بحری جہاز تک ہر چیز خریدی اور بیچی جاتی ہے۔بس جیب میں پیسہ ہونا چاہئے۔ادھر سودا برابر آتا ہے'ادھر ڈن ہو جاتا ہے!''

ماسی کی آنکھوں میں امید کی کرن نے چمک ماری۔مگر اگلے ہی لمحے اس کی جگہ ناامیدی کی دھند نے لے لی۔چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتار کر بولی:

''مشکور پتر!تم بڑی ہمت والے ہو۔اللہ تجھے بحری جہاز خریدنے کی توفیق بھی ضرور دے گا۔میرا مسئلہ حل کر دو تو تجھے دعا دوں گی۔۔صبح صبح تکلیف دی ہے۔''

راجا اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

''کوئی بات نہیں ماسی۔میں ٹرائیڈنٹ کو کک مارتا ہوں۔ابھی چلتے ہیں۔اللہ کرے تیرا کام بن جائے اور میرا بھی۔بالکل نئی نٹنگ مشین اندر رکھی ہوئی ہے۔فکر نہ کرو صرف سودا ڈن ہونے کی دیری ہے۔۔''

فرنیچر بہت معمولی قسم کا تھا۔ویسے نیا مگر رگڑیں لگی ہوئیں۔ایک ڈبل بیڈ'ایک صوفہ'ایک سنگھار میز اور برتنوں کے لئے چھوٹا سا شوکیس۔سنٹرل ٹیبل زیر استعمال تھی۔سارا سامان بارہ مربع فٹ کے کمرے میں ٹھنسا ہوا تھا۔راجا نے گہری کاروباری آنکھوں سے اندازہ لگا لیا کہ

سارا فرنیچر چالیس پچاس ہزار روپے دے سکتا ہے۔۔ماسی کو دیکھ کر چونکہ ماں یاد آ جاتی ہے اس لئے پچیس فی صد یعنی دس بارہ ہزار کی رقم پیش کرنے سے خیر سگالی کا جذبہ خوب فروغ پائے گا۔وہ ماسی کے ساتھ دروازے کی طرف پیٹھ کئے فرنیچر دیکھنے میں منہمک تھا کہ سینٹر ٹیبل پر برتن رکھنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔پلٹ کر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے چودھویں کا چاند کمرے میں طلوع ہو گیا ہو۔بھرے بھرے جسم والی ایک خوبصورت اور پرشباب لڑکی ڈریسنگ سٹول پر بیٹھی دو پیالیوں میں چائے انڈیل رہی تھی۔اس کے بدن سے پھوٹنے والی نسوانی کشش کی توانا لہریں راجا کا دل گرمانے لگیں۔لڑکی نے ایک بار بھی پلکوں کی چلمن اٹھا کر اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔مگر راجا کی نس نس سے ایک گرسنہ آنکھ پوری رغبت سے اسے تاڑ رہی تھی۔

''یہ میری بیٹی کلثوم ہے۔'' ماسی نے دھیرے سے کہا۔

راجا کو متوجہ پا کر لڑکی لجا گئی اور چائے انڈیل کر دروازے کی طرف لپکی۔سرو قد لڑکی کا بدن پشت سے انتہائی پرکشش تھا۔مگر یہ دیکھ کر راجا کو شدید ذہنی جھٹکا لگا کہ لڑکی ایک ٹانگ سے لنگڑاتی ہے۔اس نے حیرت سے ماسی کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ بے کس عورت کی رنگت زرد پڑ چکی ہے اور وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں لے کر چبانے لگی ہے۔

کسی بھی معاشرے میں تاجر حضرات دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ کائیاں اور معاملہ رس ہوتے ہیں۔راجا کباڑیا جو عام تاجروں کا بھی باپ ثابت ہوا تھا فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔

ماسی حلیمہ ہلدی چہرے اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہہ رہی تھی:

''بدنصیب کو بچپن میں پولیو ہو گیا تھا۔ورنہ میری بچی کو اللہ نے ہزار صفتیں دی ہیں۔اتنی سگھڑ بیٹی کوئی کوئی ہو گی۔میں نے پائی پائی جوڑ کر اس کی شادی کی تھی۔حرام زادہ جی پی او میں ڈاکیا ہے۔چھ مہینے بعد ہی ماں کی باتوں میں آ کر اس نے شہدی کو طلاق دے دی۔'' ماسی کے حلق سے چیخ سی نکلی۔وہ رو رہی تھی۔

راجا کو ماسی پہ ترس بھی آیا اور پیار بھی۔اس کے کاندھے کے گرد بازو ڈال کر ساتھ لگاتے ہوئے بولا:

''ماسی تم میری ماں بجا ہو۔مت روؤ۔بس ڈن ہی سمجھو۔۔!''

ماسی کی بلا جانے کہ ڈن کیا ہوتا ہے۔وہ سمجھی کہ یونہی سعادت مندی کا مظاہرہ

کرر ہا ہے۔تاہم ہمدردانہ لب ولہجہ محسوس کر کے اس کی ڈھارس بندھی اور وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

راجا آہستہ آہستہ اس کے کندھے دباتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ سیکنڈ ہینڈ ہے تو کیا ہے؟ بالکل نئی جیسی ہے۔۔ایک ٹانگ میں لنگ سہی مگر میاں بیوی کے باہمی تعلق میں ٹانگ کا عمل دخل ہی کیا ہے؟ میرے پاس کہاں اتنا وقت ہوا کرے گا کہ فوجی افسروں کی طرح بیگم کو ہمراہ لئے شام کو واک کے لئے نکلوں۔ایسی بیوی بہت بڑی نعمت ثابت ہوگی جو کہیں آنے جانے سے گھبرائے اور گھر بیٹھنا پسند کرے۔مجھے کام چلانا ہے اور وہ انشاءاللہ خوب چلے گا۔۔اب یہ ہے کہ ماسی بات وارے کی کرے تو سودا ڈن کروں۔''

راجا کی سوچوں کا سلسلہ تب منقطع ہوا جب ماسی نے دوبارہ لب کشائی کی۔

''جب سے اللہ بخشے سکینہ فوت ہوئی ہے' مجھے بھی وہم ہونے لگا ہے کہ میں جلد مر جاؤں گی۔بیٹی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔بیٹے کو تو پرواہ ہی نہیں۔جب کا نائیک بنا ہے چھٹی کم کم ہی آتا ہے۔سوات میں ڈیوٹی ہے۔چار چھ مہینے بعد چند روز کے لئے آئے بھی تو میری بہو' پنج پھلاں رانی' اسے ساتھ لے کر ماں کے پاس کھوٹہ چلی جاتی ہے۔آج کل بھی دونوں وہیں گئے ہوئے ہیں۔میری اپنی کمائی اتنی ہے کہ ہم ماں بیٹی کا خرچہ پورا ہو جاتا ہے۔بیٹے سے میں کچھ نہیں لیتی۔لیکن میری بہو کو نند سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ظالم بد بخت بات کرتے ہوئے ذرا نہیں سوچتی۔کہتی ہے وہ ساری زندگی لنگڑی کو کہاں سنبھالتی پھرے گی۔حالانکہ میری بچی نے دستکاری سکول سے کام سیکھا ہوا ہے۔ٹنچ بھاٹہ میں ریڈی میڈ کپڑوں کی بڑی دکانیں ہیں۔میں نے دو چار دکانداروں سے بات کی ہوئی ہے۔سوچتی ہوں میں مر گئی تو وہ اپنے ہنر سے گھر بیٹھی روزی کما لیا کرے گی۔۔''

ماسی حلیمہ دل کی بات زبان پر لانے کی بجائے ادھر ادھر کی ہانک رہی تھی۔زخم خوردہ ماں کے لئے اپنے منہ سے بیٹی کے رشتے کی بات کرنا اتنا سہل نہیں تھا۔بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔وہ سوچ رہی تھی کہ جب کلثوم کنواری تھی تو درجنوں رشتے آتے تھے' مگر اکثر لوگ واپس مڑ کر نہیں دیکھتے تھے۔آخر منتوں مرادوں کے بعد رشتہ ہوا بھی تو ایسا کہ کاش کبھی نہ ہوتا۔اب تو طلاق کا داغ بھی لگ چکا ہے۔اس معاشرے میں اچھی بھلی لڑکیوں کو کوئی نہیں

پوچھتا۔ کیا خبر کیا جواب سننے کو ملے؟

ادھر راجا کو بے چینی لگی ہوئی تھی کہ ماسی سیدھی سیدھی بات کیوں نہیں کر رہی۔ چالاک ذہن خود اسے پہل کاری سے روک رہا تھا۔ تاجرانہ ذہنیت اس پہلو پر غور ہی نہیں کر رہی تھی کہ ماں کا دل انکار سننے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ جب صبر کا یارا نہ رہا تو وہ بول اٹھا:

''ماسی! ہم دونوں خواہ مخواہ فضول باتیں کر رہے ہیں۔ تمہارا اور میرا دونوں کا کام چل سکتا ہے۔ ہم دونوں کے لئے یہ سودا وارے کا ہے۔ اس لئے ڈن کرنے میں دیر نہیں لگانی چاہئے۔۔۔ جن کپڑوں میں تمہاری بیٹی بیٹھی ہے' مولوی کو بلا کر انہی کپڑوں میں میرے ساتھ کلمے پڑھواؤ۔۔ یہ سامان جہیز بھی ادھر ہی جائے گا جہاں مشین پڑی ہے۔ ٹنٹنگ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بھلا میں اسے دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھلا سکتا؟ تم اپنی بیٹی کو ظالم بہو سے بچاؤ۔۔۔''

ماسی حلیمہ نے خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے راجا کا سر دونوں ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا اور بولی:

''اللہ تجھے بڑے بخت لگائے گا۔ انشاء اللہ ایک دن تو بحری جہاز بھی ضرور خریدے گا!''

☆☆☆☆

بازار

طلعت زہرا (ٹورینٹو، کینیڈا)

''ہائے میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے'' میں آنکھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے یوں گویا ہوئی جیسے ماحول سے آنکھیں چرا لینے سے میرا درد ختم ہو جائے گا۔ اف یہ آ گاہی کا روگ!۔۔۔۔۔۔۔۔

(ذیشان کمرے میں داخل ہوا اور خاص تیزی کے سے انداز میں) مما وٹ آر یو ڈوئنگ، کین آئی بیو سم منی؟

کس لئے بیٹا؟

ٹو گوٹو سٹار بکس فار کافی اینڈ ٹو گیس سٹیشن آپ نے تو باہر سے ناشتہ کرنے کی عادت ہی بنالی ہے۔ گھر کا ناشتہ صحت افزا ہوتا ہے بیٹا۔

(بے نیازی سے) او یار موم میرا فون بل ویزا کی پے منٹ بھی ڈیو ہے۔

اس پر فون کا بل کتنا ہے، شانی؟

موم وہ تو150 $ کا ہے بٹ یو کین پے منیمم اماؤنٹ آن ویزا۔ دیٹس او کے فار می۔

فون کا بل پھر بھی بہت زیادہ ہے!

(اکتا کر) موم آئی ہیو ڈیٹا پلان ودمی۔

اچھا چلو ٹھیک ہے لیکن میں تو ہر چیز کے پیسے آپ کو دیتی ہوں پھر یہ ویزا کا بل اتنا کیسے

بن جاتا ہے۔ابھی دوماہ پہلے میں نے1000 $ کی فل پے منٹ کی تھی۔

(مزید اکتاہٹ سے، زوردے کر) وٹ!! آئی نیوز بائے اپنی تھنگ ایکسٹرایوکین سی داہل، آئی ہیوولائف موم۔

(لاچارگی سے) نیکسٹ ٹائم ہی کیئرفل۔گریب مائی کمپیوٹر۔آئی ول پے یوربلز آن لائن۔

میں نے ذیشان کو کافی کے لئے کریڈٹ کارڈ دیا اور آن لائن بنک اکاؤنٹ کھولا تا کہ ذیشان کے بل ادا کرسکوں۔

''اف یہ لائن آف کریڈٹ تو ختم ہونے والی ہے'' ہلکی سی آواز میں خودکلامی کرتے ہوئے میں نے باہر جاتے ذیشان کو زور سے پکارا،''ذرا میرا دوپٹہ تو پکڑاتے جانا سر میں باندھوں گی سخت درد ہے''

میرے شوہر کو اس پرائے ملک میں کمانے سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ ان تمام باتوں پہ غور کرسکے۔ایک میں تھی کہ یہاں کے سسٹم کو سمجھنے کی تگ ودو میں بیمار ہوئی جاتی تھی۔جب بھی سوچ کی پٹاری کا ڈھکن کھل جاتا مجھ پہ یہی دردسر حاوی آجاتا۔میری سوچ کو کیا ہوگیا ہے؟

اپنے ہی خیالات میں گم میں یہی سوچتی رہتی تھی کہ

''میں تمام ذاتی حقوق کھو رہی ہوں مجھے اپنے بچے کو کیا کھلانا ہے؟ کیسے اس کی حفاظت کرنی ہے؟ کن چیزوں سے منع کرنا ہے یہ سب میرے ہاتھ سے کیسے نکلا جارہا ہے؟ جو کچھ بھی اس ملک میں رائج ہے یہ سب اس حکومت کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے یہاں کا نظام تعلیم ایسا ہے کہ بچوں کی اپنی کوئی رائے نہیں رہی ہے، وہی سوچتے ہیں جو حکومت چاہتی ہے کہ وہ سوچیں۔اور پھر بھی ہم ایک آزاد اور ڈیموکریٹک سوسائیٹی کا حصہ کہلاتے ہیں۔''

ایسے ہی خیالات سے میرا سر کہیں اندر سے درد کرنے لگا۔

''لوگوں کو حکومت کا رویہ کیوں نظر نہیں آتا، کیوں نہیں سوچتے کہ یہاں کا نظام تعلیم سرا سر نظریہ اجتماعیت اور قومی نظریئے کی بنیاد پر،ہمارے بچوں کی فکر، عمل اور جذبات کو تبدیل کررہے ہیں۔ہمارے بچے ہمارے نہیں رہے وہ ان کے بنتے جارہے ہیں۔کیا میں اپنے بچوں پر سے ہی اپنا حق کھو بیٹھی ہوں''

اور یوں مجھے آئے دن سر درد رہنے لگا۔

ان کا حق ۔خود ارادیت، ان کی انفرادیت، ان کی انسانی اقدار اور آزادی کیا حکومت ان سب پر مسلط ہو گئی ہے۔ ہاں ایسا ہی تو ہے۔ یہ تو اب اجتماع کا حصہ بنتے جا رہے ہیں ایک ربوٹ ہاں ربوٹ ہی تو ہیں آج کے بچے کل کا مستقبل۔

''بیٹا آپ کمپیوٹر سے اٹھو گے تو امتحانات کی تیاری کرو گے نا''

''مما میرے سارے دوست آن لائن ہیں۔آئی کانٹ ہیلپ اٹ، میری گیم خراب ہو جائے گی''

میں ایک بار پھر سوچوں کے بھنور میں ڈوب گئی ''معاشرے کا ہر فرد تنہا پھر بھی جدید ٹیکنا لوجی کے ذریئے اجتماع کا حصہ ہے جس کی کبھی شکل بھی نہ دیکھی ہو وہی بہترین دوست ہے۔گلو بلائزیشن ۔ ھا، اسی کے لئے تو یہ مہم چلائی گئی ہے۔تمام دنیا پر ایک کی حکومت ایک ہی فوج، ایک ہی کرنسی، ایک ہی انتطامیہ۔کیا خفیہ طریقے سے مہم چلائی گئی ہے پوری دنیا کو ایک کرنے کی۔''

یہ سر میں ٹیسیں تو جان لے کر ہی چھوڑیں گی پر اس عذاب سے تو جان چھوٹے گی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''میں کہتی ہوں سارا دن گزار کیا اب آئے ہیں، ذرا فریش ہو لیں تو آپ کے لئیے کھانا لگاؤں۔''

''بھاڑ میں گیا کھانا، آج تو ٹرک الٹتے الٹتے بچا۔معلوم ہے کتنا نقصان ہو جاتا۔میرا تو دماغ ابھی تک سن ہے ٹرک میں سامان بھی تو کلور ڈیل مال کا تھا۔بچت ہو گئی''

''لیکن یہ ہوا کیسے؟''

''بس ذرا اونگ آ گئی تھی وہ مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا''

''تین راتوں سے مسلسل جو ٹرک چلا رہے تھے، نیند تو آنی ہی تھی، کیا کریں گزارہ کیسے ہو؟ سر ڈھانکیں تو پیر ننگے ہوتے ہیں''

''کیا بچے سو گئے''

''ایک پڑھ رہی ہے۔ایک ڈیوٹی پہ گئی ہے اور بیٹے صاحب ویڈیو گیم'' تو کیا اس کو صبح

سکول نہیں جانا'' کھیل رہے ہیں''

''کل چھٹی ہے اس کی کچھ بچوں کی میڈیکل رپورٹس صحیح نہیں آئیں صرف انہی کو بلایا ہے۔نفسیات کی ڈاکٹر آئیں گے معائنہ کریں گے اور علاج بھی''

''تو کیا والدین کی مرضی کے بغیر سب کچھ ہو رہا ہے''

''فارمیلیٹی پوری کرنے کو کاغذ پر سائن تو کرواتے ہیں لیکن یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا ہے جو بچہ ان کے بنائے ہوئے شعور و فکر کے معیار پر پورا نہیں اترتا، خواہ وہ اپنی منفرد سوچ رکھتا ہو اسے ماہر نفسیات کے حوالے کر دیتے ہیں جن کا کام انھیں حکومتی سوچ کے سانچے میں فٹ کرنا ہوتا ہے۔ وہی گلوبلائزیشن والا، پوری دنیا ایک قوم، ایک طاقت کے زیرسایہ اور ہم لوگ چلتے پھرتے ربوٹ!''

میں اس سسٹم سے نالاں تھی۔-----------

موم آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہیں کیا ہوا؟

نہیں مانو بس یونہی تھکاوٹ ہو گئی ہے۔آپ کا کام کیسا رہا؟

سیم اولڈ پروبلم موم آج پھر جسٹینا نے اتنا تنگ کیا۔آئی ڈونٹ نو وٹ دے تھنک آف دیم سیلفز۔شی از ٹوٹلی آ بچ، موم یونو میں نے سارے کپڑے فولڈ کر کے رکھ دیے صبح سے آٹھ گھنٹے آل دا ٹائم ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر شیلفز ٹھیک کیں ساتھ ساتھ چینج روم سے تمام کپڑے لا کر ہینگ کئے ون تھاؤ سینڈ کام موم، پاؤں سوج گئے اور کندھے پین کر رہے ہیں۔ پھر بھی اس نے میری مینیجر سے شکایت کر دی کہ میں رتھ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ یونو موم دیٹس، ناٹ فیئر، ہی ول کٹ مائی پے۔

''او ڈارلنگ، کیا تم نے کھانا کھایا ہے؟ دیکھو لنچ بھی ویسے کا ویسا ہی واپس لے آئی ہو۔'' میں نے مابین کا دل بہلانا چاہا۔

موم اتنی ڈانٹ اور کام کے بعد کس کا دل چاہتا ہے کھانا کھانے کو۔

مابین چندا، اس طرح تو تم نہ صحیح سے کام کر سکو گی اور نہ ہی پڑھائی پر دھیان دے سکو گی۔اچھا کل تو منڈے ہے نا،

یونیورسٹی کی کلاس ہو گی چلو اب چار دن کے لئے سٹور پہ نہیں جانا پڑے گا اب جاؤ اور

آرام کرلو۔

موم ابھی تو مجھے اسائمنٹ کرنی ہے کل ڈیڈ لائن ہے ویک اینڈ پہ کام پہ جانے کی وجہ سے مکمل نہ کر سکی تھی۔

پھر تو آج کی رات بھی تم جاگو گی

وٹ ایلس آئی کین ڈو۔ مجھے اپنا جی پی اے تو خراب نہیں کرنا نا۔

ویسے بھی او سیپ یعنی حکومت کا قرضہ بھی لوٹانا ہے۔لیکن موم آج آپ مجھے واقعی پریشان لگ رہی ہیں۔ڈونٹ یوٹل می۔

(اس نے آرام صوفے میں دھنستے ہوئے کہا)۔

ایک ٹھنڈی آہ میری پسلیوں کے آنکڑے سے یوں برآمد ہوئی جیسے میں نے ہی اسے اس پنجرے میں قید کر رکھا تھا۔خود پر قابو کرتے ہوئے میں نے ماہین کو تسلی دی:

یو بیو یور اون پرابلمز ٹوئیکل،آئی ول بی او کے، مائی ڈیئر ماہین۔۔۔۔۔۔۔

میرے سامنے ایک کاغذوں کا انبار لگا تھا جس میں بجلی پانی گیس فون ٹی وی لائن آف کریڈٹ ، ڈیبٹ مارگیج ، ہوم انشورنس، کار انشورنس، پراپرٹی ٹیکس اور نجانے کون کون سے کاغذات تھے جن کو میں فائل میں لگا کر رکھ رہی تھی۔سر کا درد نہ ٹلنا تھا نہ ٹلا۔ایک فقرا ذہن میں گونجنے لگا،

''حکومت کا تعلیم کے لئے قرضہ بھی تو لوٹانا ہے''

یہ ننھے بچے کس عذاب میں پھنس جاتے ہیں یونیورسٹی کی فیس ادا کر کے حکومت ان بچوں پہ احسان کرتی ہے واقعی یہ حکومت نہ ادا کرے تو ساری دنیا سے اپنے ملکوں اپنی زمین کو چھوڑ کر آئے یہ بچے کہاں سے پڑھائی کے پیسے ادا کر سکتے ہیں۔فیس تو ادا ہو جاتی ہے لیکن قرضہ ان کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے اس کی خبر ان کو ہوتی ہے جب حکومت کو یہ قرضے لوٹانے پڑتے ہیں۔ہو نہ ہو یہ قرضہ ہی میرے سر درد کی بنیادی وجہ ہے، گھر ہے تو وہ قرضہ پر بچوں کی پڑھائیاں ،کار،اخراجات سب ہی قرضوں پر چل رہا ہے۔

ہمارا کیا ہے، ہمارا تو اپنا ملک بھی اپنا نہیں جہاں ہم پیدا ہوئے جس کو ہم اپنی جڑیں سمجھتے ہیں وہ تو قرضوں کی نظر ہو گیا۔ہمارا ملک قرضوں میں جکڑا ہے یہ آئی ایم ایف، ورلڈ بنک

،انٹر نیشنل ریٹنگ لون سسٹم، یہودیوں کے سودی نظام کا عذاب۔ یہ ملک بھی میری طرح قرضوں سے آزاد نہیں ہوسکتا، سود در سود۔۔اسی نظام نے سرمایہ خلق کیا، سرمایہ نے سرمایا دارانہ نظام، ہم مزدور ہمارے بچے مزدور ہمارا ملک مزدور۔۔۔قرضہ، سود، سرمایہ اور مزدور۔۔۔تم بھی مزدور ہو۔

لوگو! سنو کوئی میری آواز کیوں نہیں سنتا؟

میرا سر پھٹ رہا ہے کوئی ہے علاج اس کا۔

تم ٹرک چلاؤ یہاں میں فیکٹری میں کام کروں تمہارے بچے ٹم ہارٹن اور میکڈونلڈ میں برگر بنائیں اور بیچیں۔ہم سب مزدور ہیں

یہ سرمایہ دار۔ یہ پوری دنیا کو ایک قوم بنائیں گے زمین پر ایک ہی حکومت راج کرے گی، سازش۔۔خفیہ سازش۔۔۔

کوئی ہے جو مجھے سر درد کی گولی دے دے۔

گولی نہیں نہیں یہ اس کا علاج نہیں، میرے ملک کو گولی کی نذر نہ کرو۔صرف اس لئے کہ وہ تمہاری بات مانتا رہے تمہارے سر کا درد نہ بنے تم یہاں بھی گولیاں چلاتے ہو۔ایک زمین ایک حکومت، گو بات نہ مانے سر درد بنے اسے گولی سے ٹھیک کر دیتے ہو۔

اچھا مجھے تو کوئی سر درد کی گولی دے نا۔ یہ بچیاں کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

باجی ایک منٹ رکیں نا او مائی گاڈ، ریئلی لو دِس۔اینڈ وائٹ دِس شرٹ۔

یا شیور یو کین ٹیک اِٹ صبین بٹ آئی ول گٹ مائن فام دی ''مینگو'' یو ونٹ بیلیو واٹ، اٹس کریز ناؤ آڈیز۔

باجی ڈونٹ یو لائک مائین۔

یا اٹس گڈ بَٹ فرام لاسٹ ائیر فیشن۔آئی تھنک یو شڈ ناٹ گٹ اِٹ۔

او کے لیٹس گو ٹو مینگو آئی ول گٹ مائن فرام دیئر ٹو۔

وی کین ہیو بگ سیونگ کوز آئی ہیو سَم کوپنز آلسو

واؤ دیٹس گریٹ۔

مینگو جاتے ہی دونوں نے خوب خوب کپڑے پہن پہن کر دیکھے اور آٹھ دس ٹی شرٹس اور کچھ پینٹس لے کر کاؤنٹر پر پہنچیں۔کوپنز اور کریڈٹ کارڈ اس کے حوالے کیا۔کل پانچسو ستر

ڈالرز کا بل آیا انھوں نے انتہائی مسرت سے اپنے اپنے شاپنگ بیگز اٹھائے اور گھر کی طرف چل دیں۔ وہ آپس میں اس بات پہ بہت خوش تھیں کہ انھوں نے پچاس ڈالرز کی بچت کر لی ہے۔

بچیاں کہاں ہیں، اوہ اچھا بازار گئیں ہیں ھا یہ کارپوریٹ ورلڈ، یہ برانڈ نیم یہ پروڈکشن یہ مارکیٹنگ اور سیل۔ میں نہ کہتی تھی یہ ان کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ یہ ہمیں انسان سے سدھائے ہوئے جانور بنانا چاہتے ہیں۔ بازار سے گزر و تو بچے تو بچے بڑے بھی خود پہ قابو نہ پا سکیں۔ اتنے بڑے نیوئن سائن کہ آنکھیں چندھائیں سو چندھائیں پر من ایسا مچلے کہ بازار سے نہ جائے۔

ارے ارے تم کہاں چل دیئے ابھی تو آئے تھے کام سے۔۔۔۔۔

''وہ ذرا میرے آئی پاڈ کا بلوٹوتھ کام نہیں کر رہا، نیا لینے جارہا ہوں ابھی گیا اور ابھی''

اور وہ میرے سر درد کی گولی؟؟؟؟

☆☆☆☆

بین کرتی آوازیں

نسترن احسن فتیحی (علی گڑھ،انڈیا)

سارا نے بے چینی سے ٹہلنا شروع کیا... خیال بھی بلبلے کی طرح ہوتے ہیں، کسی لمحے میں ایک خیال جیسے ہی پیدا ہوتا ہے ویسے ہی ختم ہو جاتا ہے پھر دوسرا.. تیسرا اور نتیجے میں ایک تذبذب کی کیفیت، ایک اضطراب—اس کے اندر یہ اضطراب شور اور سناٹوں کے تصادم نے پیدا کیا ہے جو نہ جانے کب سے اس کا پیچھا کرتا رہا ہے اور جب اس کے اندر یہ تصادم بڑھتا ہے تو اس کے پیٹ میں کپکپی شروع ہو جاتی ہے اور وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے..... چہرہ ست ہو جاتا ہے اور اسے ابکائی سی محسوس ہوتی ہے—اس کا یہ اضطراب دوسروں پر بہ آسانی عیاں ہو جاتا ہے اور اسی لئے وہ سب کی نظروں سے بچنے کے لئے پریس سے اٹھ کر اوپر آ جاتی ہے۔ اپنے پیچھے سوال جواب اور چہ مگوئیاں چھوڑ کر"۔ کیا ہوا.....؟ پھر مائیگرین.....؟ آرام کرو... فضول کام میں سارا دن...."

کتنی بڑبڑاہٹیں.... اس کا پیچھا کر رہی ہوتی ہیں—

یہ گھر اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے، چھ کمرے ہیں مگر زمین کا پھیلا دنہ ہونے کی وجہ سے اوپر بڑھے ہیں ہاں اس میں رہنے والے افراد ضرور زیادہ ہیں.. اس پر یہ کہ نچلی منزل کے دو کمرے گودام ہی بنے رہتے،۔ ہمیشہ اوپر سے نیچے تک ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے اخبار، گرد سے اٹی کچھ نصابی کتابیں، سیاسی اشتہار کے پرچے اور کئی طرح کی رسید بک.. اس کا دل چاہتا کہ اس سارے عذاب سے ان دونوں کمروں کو نجات دلا دے تا کہ اس کمرے کے ساتھ گھر کے مکیں بھی کچھ کھلی

فضا میں سانس لے سکیں۔

اس نے اوپر کی بالکنی سے نیچے جھانکا... دھوپ چھاؤں نے دیوار پر پرچھائیں سی بنا رکھی تھی... تم باہر مت نکلو خطرہ ہے- بہت ٹریفک ہے- سامنے آنا ضروری ہے کیا، ایک طرف رہو... اس سناٹے میں آواز گونجی مگر اس آواز کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا— اس کے چاروں طرف آوازیں تھیں... بے شمار آوازیں، گاڑی کا ہارن.. ،کوکر کی سیٹی .... کسی کے ہنسنے اور چلانے کی آواز کوئی بہت قریب سے بولا تھا میرا بچہ بہت بیمار ہے... رام نام ستیہ ہے... کوئی مر گیا ہے—وہ بالکنی سے ہٹ گئی— آوازیں دھیمی ہوئیں.. ان آوازوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے—یہ سب غیر حقیقی آوازیں ہیں.. مگر اس کے سناٹوں کی آواز حقیقی ہے اسے لے کر ڈوبنے لگتی ہے—اس نے ٹی وی کھول لیا.. ایک چینل سے دوسرے چینل پر فلمیں... رپورٹروں کے چیخنے کی آوازیں... مضحکہ خیز مباحثوں کا پینل، یا کسی سیاسی لیڈر کا مسکراتا ہوا چہرہ... وہ چینل بدلنا بھول جاتی ہے جان بوجھ کر یا غلطی سے آواز کا گلا گھونٹ دیتی ہے، منسٹر کے مسکراتے ہوئے لب ہل رہے ہیں—ان کے پاس مسکرانے کی کیا وجہ ہے یہ کیسے مسکرا سکتے ہیں— کیا دنیا میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے؟ چل ہی رہا ہوگا تب ہی کہیں سے گانے کی آواز آ رہی ہے- وہ اپنے اندر اور باہر کی آواز کا گلا نہیں گھونٹ سکتی وہ کہیں نہ کہیں سے در آتی ہیں- اور اسکی سماعت سے ٹکرانے لگتی ہیں- وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آتی ہے۔" سارا کھانا کھا لو نانی کہتی ہیں-"

"نانا نہیں آئے کیا؟" وہ پوچھتی ہے۔ خیالات کے بلبلوں کو لفظوں میں ڈھالنے کے لئے وہ نانا سے جرح کرنا چاہتی ہے۔

"نہیں-" جواب ملتا ہے—

ارے آج پھر مائیگرین کا اٹیک ہے کیا؟ تو آرام کرو-" ماموں زاد بہن نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔"—

وہ گودام میں چلی جاتی ہے- اسی گودام کی وجہ سے اسے نانا کے کام اور گھر سے نفرت تھی —ہمیشہ سے... وہ موٹی سی عینک آنکھوں پر چڑھائے اپنے پریس کے کاموں میں لگے رہتے تھے جو گیرج میں چلتا ہے اور اسی گیرج میں چھوٹا پارٹیشن کر کے اس کا آفس بنا ہوا ہے — کمپوزر، پرنٹر اور پبلیشر کا سارا کام نانا ہمیشہ اکیلے ہی دیکھا کرتے تھے نہ جانے کب سے.. وہ

بہت چھوٹی تھی جب دعا مانگا کرتی کہ یا خدا سیلاب آ جائے اور یہ سارا کباڑ سیلاب بہا کر لے جائے مگر نہ سیلاب آیا نہ پریس بند ہوئی۔ ہاں کبھی کبھی اخبار ضرور بند ہو جاتا جب پولیس نانا کو پکڑ کر لے جاتی کچھ دن ان کے مہمان رہ کر وہ اپنی ملیح سی مسکراہٹ کے ساتھ واپس آ جاتے اور اخبار پھر نکلنے لگتا۔۔ مگر نانا کی غیر حاضری والے دور میں جب ماموں پریس چلاتے تو وہ نصابی کتابیں اور رسید کی ہی چھپائی کروایا کرتے - وہ رفتہ رفتہ جان گئی تھی کہ نانا کے اخبار بکتے کم تھے اور گودام کی زینت زیادہ بن جاتے تھے پر اب اس پلیا روڈ پر " آج کی آواز " کا پریس کچھ زیادہ زور وشور سے چلنے لگا ہے کیونکہ اب وقار ماموں پوری طرح اس کام میں شریک ہو گئے ہیں اور اب کمپیوٹر پر کمپوزنگ ہوتی ہے۔۔ وہ بھی ماس کمنیکیشن کی پڑھائی کر کے اخبار سے منسلک ہو گئی ہے ایک مستقل کالم لکھنے کا کام اس کے سپرد ہے، نانا اب کام میں حصہ نہیں لے پاتے کبھی کبھی پریس کے آفس میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں -ماموں کو اب دماغ کی نہیں کچھ کارندوں کی ضرورت ہے۔۔ پریس کی دوسری مشینوں کی طرح بیجان پرزے جو سوچنا نہ جانتے ہوں، نانا اپنی ضعیفی کے باوجود سوچنا بھی جانتے ہیں اور ان کی اس سوچ کی ایک پہچان اور عزت بھی ہے "۔ آج کی آواز" کے عزیز احمد سے ہر سوچنے والا دماغ واقف تھا۔ مگر ماموں کو اب پیسے کی ضرورت تھی عزت تو نانا نے " آج کی آواز " کے لئے کما ہی لیا تھا۔ ماموں وقار اس سے بھی کمپوزنگ کے کاموں میں مدد لینے لگے تھے ،مگر وہ اسے ایک کمپیوٹر کی طرح ہی کام کرنے کی اجازت دیتے انسان کی طرح نہیں ۔۔ صبح چار بجے یہ اخبار وین پر لوڈ ہو کر اپنی منزل کی تلاش میں روانہ کر دئے جاتے ہیں۔۔جب سے ماموں نے کام سنبھالا ہے پولس کم آنے لگی ہے۔۔ماموں نئے زمانے کے پروردہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارا قانون ، ہماری پولیس اور ہماری نوکر شاہی اعلیٰ ستائش کے لائق ادارے ہیں اوران پر نکتہ چینی کرنا ایک غیر قانونی حرکت ہے ۔۔۔ان کے اخبار کے صفحات پر رنگیں خوبصورت تصاویر نے بھی کافی جگہ گھیر لی ہے، اردو زبان کی کم ہوتی ہوئی قدر کو بڑھانا وہ جانتے ہیں اسی لئے اب " آج کی آواز " کے صفحات پر خبریں کم اور اشتہار زیادہ رہتا ہے، کبھی کبھی ماموں اور نانا میں بحث ہو جاتی ہے اور نانا دلبرداشتہ ہو کر چپ ہو جاتے ہیں۔ اور ہر ایسے موقعے پر وہ گودام میں چلی جاتی ہے- اس شور سے گھبرا کر پناہ لینے کی اب وہ بہترین جگہ بن چکی ہے، جہاں

کباڑیا

خاقان ساجد (راولپنڈی، پاکستان)

چھاؤنی کی حدود سے باہر مضافات کی طرف جانے والی سڑک کے اردگرد جہاں کبھی سرسبز کھیت اور اینٹ گارے سے بنے اکا دکا مکانات ہوا کرتے تھے، وہاں اب بے ہنگم رہائشی کالونیاں وجود میں آ چکی تھیں۔ سڑک کے دونوں جانب دور تک ہر طرح کی دکانیں، گودام، سی این جی اسٹیشن، تعمیراتی سامان کے بڑے بڑے سٹور اور ماربل فیکٹریاں بن گئی تھیں۔ راجا مشکور کا "آرکو آکشن مارٹ" بھی یہیں واقع تھا۔ پندرہ سولہ مرلے کے پلاٹ کے ایک تہائی حصے پر چند بڑے بڑے کمروں اور برآمدے پر مشتمل سادہ سی عمارت ہر طرح کے فرنیچر، برقی آلات، انواع واقسام کے آرائشی سامان اور الم غلم اشیاء سے بھری ہوئی تھی۔ برآمدے میں گتے اور کاغذ کی ردی کے ڈھیر لگے رہتے۔ جبکہ صحن لوہے اور پلاسٹک کی بے کار چیزوں، کانچ کی بوتلوں اور ٹین ڈبوں سے اٹا پڑا تھا۔ کباڑ کے انبار ہمالہ آثار کے ساتھ جستی چادروں سے بنے شیڈ کے نیچے تلائی کے دو بڑے کانٹے اور باٹ رکھے تھے۔ اسی جگہ 70 سی سی کی ایک پھٹیچر موٹر سائیکل چھوٹے اسٹینڈ پر ترچھی کھڑی ہوتی۔ قریب ہی تین ٹانگوں والی کرسی پر بیٹھ کر سرتاپا لنڈے میں ملبوس راجا مشکور گاہکوں کی راہ تکا کرتا۔ سرسری نگاہ سے دیکھنے پر وہ خود بھی اردگرد ڈھیر کاٹھ کباڑ کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ کرسی کی چوتھی ٹانگ لگوانے کی اس نے ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ کئی برسوں سے اینٹیں جوڑ کر اسے سہارا دے رکھا تھا۔ کوئی بے تکلف بیوپاری یا گاہک اس حوالے سے عار دلاتا تو ہنستے ہوئے جواب دیتا:

''او جی! کام ہی چلانا ہے ناں! پانچ سالوں سے بہترین کام چل رہا ہے۔ ورنہ صحیح سلامت نئی کرسیاں اندر ڈھیر پڑی ہیں۔۔۔''

''کام ہی چلانا ہے ناں۔'' موصوف کا تکیہ کلام تھا اور اسکی مخصوص ذہنی ساخت' سوچ اور اپروچ کا مظہر۔ کام چلاؤ جی' کام چلنا چاہئے' گزارا کرو جی۔۔ اس طرح کے جملے کثرت سے بولتا۔ ''سودا'' کا لفظ بھی گفتگو میں بہت زیادہ استعمال کرتا۔ سودا ڈن ہو گیا' سودا فٹ ہو گیا' سودا خراب ہو گیا' سودا برابر آ گیا۔۔

عمر تیس برس سے زیادہ نہیں ہو گی۔ صحت اور صورت شکل بھی اچھی تھی مگر پھر بھی اپنے حلیے اور لباس پر بالکل توجہ نہ دیتا۔ شیو اکثر بڑھی رہتی۔ کئی کئی دن نہائے ہوئے گزر جاتے۔ اس کی تمام تر دلچسپیاں کاروبار تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ گھریلو سامان اور کباڑ کی فروخت یا خریداری کے لئے آنے والوں کا برابر گرم جوشی سے استقبال کرنے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتا۔ رہائش بھی کباڑ خانے کے ایک کمرے میں اختیار کر رکھی تھی۔ گھر بسانے کا جھمیلا ہی نہیں پالا تھا۔ جونہی کوئی گاہک احاطے میں قدم رکھتا اسے دیکھ کر لگا بندھا خیر مقدمی کلمہ ادا کرتا:

''بسم اللہ۔ آؤ جی۔''

کوئی مجبور انسان ایک ہزار روپے کی چیز بیچنے آتا تو اسے سو روپے کی پیش کش کرتے ہوئے کہتا:

''کام چلاؤ جی۔''

وہ احتجاج کرتا تو جواب دیتا:

''اور کیا دوں؟ آخر مجھے بھی اپنا کام چلانا ہے!''

خریدار کو چیز بیچتے ہوئے اس کی گفتگو اس قسم کی ہوتی:

''یہ دیکھیں بالکل نئی نکور ہے۔ شوروم سے ہزار بارہ سو سے کم میں نہیں ملے گی۔ میں نے نو سو روپے میں خریدی ہے۔ آپ مجھے منافع نہ دیں۔ اپنا کام چلائیں۔۔''

قدرت بعض لوگوں کو کسی مخصوص کام کے لئے دنیا میں بھیجتی ہے۔ راجا انہی میں سے ایک تھا۔ وہ فطری کباڑیا تھا۔ اگر خمیر میں کوئی کمی رہ گئی تھی تو وہ گھر کے عسرت زدہ ماحول نے پوری کر دی تھی۔ ابھی ماں کے بطن ہی میں تھا کہ باپ نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ جوان بیوہ اور نومولود یتیم

کے ساتھ رشتہ داروں نے وہی سلوک روا رکھا جو اس معاشرے کا عام چلن ہے۔ جب کسی نے سر پر ہاتھ نہیں رکھا تو نادار عورت نے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پالنے کے لئے چھاؤنی کی دو تین کوٹھیوں میں کام شروع کر دیا۔ اکلوتے بچے کو پال پوس کر جوان کرنا اس کا واحد مقصد حیات تھا۔

ماں جو مشقت کرتی تھی اس سے دو وقت کی روٹی تو میسر آ جاتی تھی مگر دیگر ضروریات زندگی کے لئے اترنوں پر انحصار کرنا پڑتا۔ کرائے کے چھوٹے سے گھر میں ضرورت کی ہر شے رحم دل اور فیاض بیگمات کی بخشی ہوئی تھی۔ راجا جب پانچ چھ سال کا ہوا تو ایک بیگم صاحبہ کے سمجھانے بجھانے اور ذاتی کوشش سے اسے سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ اس کی اسکول یونیفارم بستہ، کتابیں، عام کپڑے اور کھلونے بھی بیگمات کی عطا ہوتے۔ اس طرح اس نے نو جماعتیں پاس کر لیں۔ سکول آتے جاتے یا یونہی آوارہ پھرتے ہوئے اسے جہاں کہیں کوئی گری پڑی چیز ملتی اسے اٹھا لیا کرتا۔ یوں اس کے ذاتی اثاثے میں پرفیوم کی خالی خوش نما شیشیاں، ہر برانڈ کے سگریٹ کی ڈبیاں، رنگین تصویروں والی ماچسیں، کاسمیٹکس کی خوبصورت پیکنگز، چینی کے دیدہ زیب ٹوٹے ہوئے گل دان، استعمال شدہ مارکر اور بال پین، لوہے کے چھوٹے چھوٹے بے کار پرزے اور ایک دو مقناطیس بھی شامل ہو گئے تھے۔ بچپن میں اس نے ایک فوجی افسر کے بچے کی استعمال شدہ ٹرائیسکل چلائی تھی۔ جب دسویں میں پہنچا تو کہیں سے ایک پرانی بائیسکل بھی مل گئی۔ اس وقت تک اسے ردی اخبار، کاپیاں، کتابیں، گتے اور خالی بوتلیں بیچنے کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔ جب کوٹھیوں سے لائی ہوئی انواع و اقسام کی بے کار چیزیں ذرا زیادہ جمع ہو جاتیں تو ماں بیٹا محلے کے کباڑیے کے ہاتھ بیچ آتے تھے۔ کبھی اپنا پسندیدہ مشروب فانٹا پینے کو جی چاہتا تو وہ خود بھی سٹاک میں سے کوئی چیز اٹھا کر کباڑ خانے جا پہنچتا۔ دسویں جماعت میں ترقی پانے تک خان کباڑیے سے اس کی اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اس کے مشورے پر وہ فارغ اوقات میں نزدیکی گنجان آباد بستیوں کا سائیکل پر چکر لگانے لگا۔ ابتداء میں جھجک اور شرم مانع ہوئی مگر جلد ہی گلی خالی پا کر صدا لگانے لگا:

''چھان بورا بیچ، سوکھی روٹی بیچ، ردی اخبار بیچ، ٹین ڈبہ، لوہا پرانا، نائیلون کی جوتیاں بیچ۔۔''

جب خان کی دی ہوئی نقدی ختم ہو جاتی اور سائیکل کے کیریئر پر لٹکائے ہوئے دونوں بورے بھر جاتے تو وہ واپسی کی راہ لیتا اور کمیشن وصول کر کے شاداں و فرحاں گھر لوٹ جاتا۔ جلد ہی پیسوں کی کشش نے اسے سکول کا راستہ بھلا دیا۔ اس نے کباڑ خانہ چلانے کے لئے کاروباری

رموز اتنی جلدی سیکھ لئے کہ ذاتی کاروبار کے خواب دیکھنے لگا۔ یہ سوچ کر اکثر حیرت میں ڈوب جاتا کہ کوڑیوں کے مول خریدی ہوئی اشیاء فوراً دگنے پیسوں میں کیسے بک جاتی ہیں! بڑے بڑے بیوپاریوں کے کارندے خود ہی مال اٹھانے کیسے پہنچ جاتے ہیں؟ نقد و نقدی ادائیگیاں ہوتی ہیں اور فٹافٹ مال ٹھکانے لگ جاتا ہے!

تیس برس کی عمر کو پہنچنے تک راجا اپنا ذاتی کباڑ خانہ کامیابی سے چلانے لگا تھا۔ اگلے دو سالوں میں اس نے ''آرکو آکشن مارٹ'' کی بنیاد ڈالی تو اس کا بینک بیلنس اتنی تیزی سے بڑھا کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ ماں نے گذشتہ پانچ چھ سالوں سے کوٹھیوں میں کام چھوڑ کر مصلا بچھا لیا تھا۔ مگر خوش حالی آنے کے باوصف طبعاً شکر گزار عورت اپنی محسن اور مہربان بیگمات کو نہیں بھولی تھی۔ وہ ان سے ملنے اکثر بنگلوں پر جایا کرتی۔ بیگموں کو بتاتی کہ اب وہ اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کے لئے بے حد بے قرار ہے۔ خود راجا کا انگ انگ 'عورت' 'عورت' پکارتا تھا۔ مگر کاروباری مصروفیات اور روز افزوں ترقی نے اسے اپنے سحر میں کچھ اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ اس لازمے پر سوچنے کی اسے فرصت ہی نہ ملتی۔ ماں کبھی یہ قصہ چھیڑ بیٹھتی تو شادی کے لئے ضروری بری کے جوڑوں، طلائی زیورات اور ولیمے پر اٹھنے والے اخراجات کا تخمینہ لگاتے ہوئے حوصلہ ہار جاتا۔ بیوی کو دو وقت کھانا کھلانے پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر شادی کے جملہ مصرف کا سوچ کر جان نکلنے لگتی تھی۔

راجا دھیلا بھی خرچ کرنے لگتا تو پہلے دس مرتبہ سوچتا۔ اس کا قول تھا کہ چیز اولاً ضرورت کے تحت خریدنی چاہئے، قصداً یا محض شوقیہ ہرگز نہیں۔ دوئم جس شے کی ضرورت ہو اگر وہ اچھی حالت میں سیکنڈ ہینڈ مل جائے تو نئی پر پیسہ برباد کرنا نری حماقت ہے۔ کسی دوست کو کوئی نئی شے خریدتے دیکھتا تو ناصحانہ انداز میں کہتا:

''سیکنڈ ہینڈ سے کام چلاؤ جی۔۔ نئی کیا کرنی ہے۔ خوامخواہ کا خرچہ ہی ہے۔۔''

اس کے اپنے استعمال میں جتنی چیزیں تھیں سبھی سیکنڈ ہینڈ تھیں۔ موبائل فون، کلائی گھڑی، بٹوہ، موٹر سائیکل، پلنگ، ٹی وی ٹرالی، ٹی وی، الماری، قالین، پردے اور برتن سب پرانے تھے۔ حتیٰ کہ تن کے کپڑے بھی ہاتھی چوک کے قریب واقع ''کراؤن امپورٹڈ کلوڈنگ سنٹر'' سے خریدا کرتا۔

اپنی مستحکم مالی حیثیت کا بھید اس نے اپنی ماں کو بھی نہیں دیا تھا۔ اس نے باور

کرلیا تھا کہ بیٹے کا کاروبار بظاہر پھیلا ہوا لگتا ہے' آمدن اتنی نہیں ہے۔ایک روز مارٹ کے قریب ہی وہ بدنصیب عورت سڑک کے حادثے میں شدید زخمی ہوئی اور اگلے ہی روز بیٹے کا گھر بسانے کی حسرت دل میں لئے اس جہان فانی سے رخصت ہوگئی۔تعزیت کے لئے قریبی رشتہ دار اور برادری کے لوگ آئے توراجانے ان کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اپنایا۔وہ سوچ رہا تھا کہ غربت کے دنوں میں جب ان لوگوں کی مدد کی ضرورت تھی تو کسی نے جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا تھا۔اب وہ آسودہ حال ہے تو سب خواہ مخواہ بڑھ چڑھ کر اپنائیت کا اظہار کررہے ہیں۔بعید نہیں کہ قریبی تعلقات استوار کرنے کی آڑ میں مال ہتھیانے کی منصوبہ بندی کررہے ہوں۔صرف حلیمہ نامی ایک عورت اسے پرخلوص لگتی' جو اس کی رشتے کی خالہ تھی۔وہ مرنجاں مرنج عورت اس کے کباڑ خانے کے قریب کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔سڑک سے گزرتے ہوئے اکثر احوال پوچھنے آجاتی۔اسے دیکھ کر راجا کو اپنی مرحومہ ماں یاد آنے لگتی۔ماسی حلیمہ بھی امیروں کی کوٹھیوں میں کام کرکے گزر اوقات کرتی تھی۔راجا فارغ ہوتا تو اس کے سامنے پلاسٹک کی کرسیوں میں سے ایک گھسیٹ کر بیٹھ جاتی۔چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتی اور پھر دعائیں دے کر رخصت ہوجاتی۔

راجانے بارہا محسوس کیا تھا کہ ماسی جب بھی اس کے سامنے آکر بیٹھتی ہے' اس کی کرسی کے نیچے جڑی ہوئی اینٹوں کو بڑے غور سے دیکھتی ہے۔بالآخر ایک روز دل کی بات اس کی زبان پر آہی گئی:

''مشکور پتر۔اب تم اتنے بڑے سیٹھ بن گئے ہو۔اپنے بیٹھنے کے لئے نئی کرسی ہی خریدلو۔۔''

راجا مسکرایا:

''ماسی پہلی بات تو یہ ہے کہ میں سیٹھ ویٹھ بالکل نہیں ہوں۔بس سمجھو کام چل رہا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ بہت سی نئی کرسیاں اندر پڑی ہیں۔فرنیچر کی مرمت اور پالش کرنے والے کاریگر بھی شوروم کے پچھلے حصے میں کام کررہے ہیں۔لیکن اس کرسی میں کوئی خرابی نہیں۔اس کی سیٹ اور بیک میں بہترین فوم اور لیدر استعمال کیا گیا ہے۔پانچ چھ سال سے فسٹ کلاس کام چل رہا ہے۔جب یہ بیچاری مجھے کچھ نہیں کہتی تو میں اسے کیوں رد کروں؟''

ماسی حلیمہ مسکرائی اور کسی گہرے خیال میں گم ہوگئی۔قدرے توقف کے بعد کہنے لگی:

''اچھا میں چلتی ہوں۔تمہاری یہ جگہ بڑی ہی ٹھنڈی ہے۔مجھے تو کمنی لگ گئی ہے!''

اگلی صبح ابھی راجا بستر میں نیم دراز چائے پینے میں مشغول تھا کہ ماسی دوبارہ آٹپکی۔راجا اس کی بے وقت اور غیر متوقع آمد پر حیران ہوا۔اس کے چہرے پر فکر اور گومگو کی کیفیت دیکھ کر پوچھنے لگا:

''ماسی خیر ہے نا؟''

''میرے پاس کچھ گھریلو سامان ہے جسے بیچ کر نئی نٹنگ مشین خریدنا چاہتی ہوں۔اگر تم خریدنا چاہتے ہو تو چل کر دیکھ لو۔''

ماسی نے سادگی سے کہا۔

راجا ہنسنے لگا:

''بس ماسی! میں تو گھبرا ہی گیا تھا تمہیں پریشان دیکھ کر۔لو چائے پیو۔۔'' پھر کہنے لگا'' ماسی! میں کباڑیا ہوں۔میرا تو کام ہی سیکنڈ ہینڈ مال ٹھکانے لگانا ہے۔اس پیشے میں سوئی سے لے کر بحری جہاز تک ہر چیز خریدی اور بیچی جاتی ہے۔بس جیب میں پیسہ ہونا چاہئے۔ادھر سودا برابر آتا ہے ادھر ڈن ہو جاتا ہے!''

ماسی کی آنکھوں میں امید کی کرن نے چمک ماری۔مگر اگلے ہی لمحے اس کی جگہ ناامیدی کی دھند نے لے لی۔چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتار کر بولی:

''مشکور پتر! تم بڑی ہمت والے ہو۔اللہ تجھے بحری جہاز خریدنے کی توفیق بھی ضرور دے گا۔میرا مسئلہ حل کر دو تو تجھے دعا دوں گی۔۔صبح صبح تکلیف دی ہے۔''

راجا اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

''کوئی بات نہیں ماسی۔میں ٹرائیڈنٹ کو کک مارتا ہوں۔ابھی چلتے ہیں۔اللہ کرے تیرا کام بن جائے اور میرا بھی۔بالکل نئی نٹنگ مشین اندر رکھی ہوئی ہے۔فکر نہ کر وصرف سودا ڈن ہونے کی دیری ہے۔۔''

فرنیچر بہت معمولی قسم کا تھا۔ویسے نیا مگر رگڑیں لگی ہوئیں۔ایک ڈبل بیڈ ایک صوفہ ایک سنگھار میز اور برتنوں کے لئے چھوٹا سا شوکیس۔سنٹرل ٹیبل زیر استعمال تھی۔سارا سامان بارہ مربع فٹ کے کمرے میں ٹھنسا ہوا تھا۔راجا نے گہری کاروباری آنکھوں سے اندازہ لگا لیا کہ

سارا فرنیچر چالیس پچاس ہزار روپے دے سکتا ہے۔۔۔ہی کو دیکھ کر چونکہ ماں یاد آ جاتی ہے اس لئے پچیس فی صد یعنی دس بارہ ہزار کی رقم پیش کرنے سے خیر سگالی کا جذبہ خوب فروغ پائے گا۔وہ ماسی کے ساتھ دروازے کی طرف پیٹھ کئے فرنیچر دیکھنے میں منہمک تھا کہ سینٹر ٹیبل پر برتن رکھنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔پلٹ کر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے چودھویں کا چاند کمرے میں طلوع ہوگیا ہو۔بھرے بھرے جسم والی ایک خوبصورت اور پرشباب لڑکی ڈریسنگ سٹول پر بیٹھی دو پیالیوں میں چائے انڈیل رہی تھی۔اس کے بدن سے پھوٹنے والی نسوانی کشش کی توانا لہریں راجا کا دل گرمانے لگیں۔لڑکی نے ایک بار بھی پلکوں کی چلمن اٹھا کر اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔مگر راجا کی نس نس سے ایک گرسنہ آنکھ پوری رغبت سے اسے تاڑ رہی تھی۔

''یہ میری بیٹی کلثوم ہے۔'' ماسی نے دھیرے سے کہا۔

راجا کو متوجہ پا کر لڑکی لجا گئی اور چائے انڈیل کر دروازے کی طرف لپکی۔سرو قد لڑکی کا بدن پشت سے انتہائی پرکشش تھا۔مگر یہ دیکھ کر راجا کو شدید ذہنی جھٹکا لگا کہ لڑکی ایک ٹانگ سے لنگڑاتی ہے۔اس نے حیرت سے ماسی کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ بے کس عورت کی رنگت زرد پڑ چکی ہے اور وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں لے کر چبانے لگی ہے۔

کسی بھی معاشرے میں تاجر حضرات دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ کائیاں اور معاملہ رس ہوتے ہیں۔راجا کباڑیا جو عام تاجروں کا بھی باپ ثابت ہوا تھا فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔

ماسی حلیمہ ہلدی چہرے اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہہ رہی تھی:

''بدنصیب کو بچپن میں پولیو ہوگیا تھا۔ورنہ میری بچی کو اللہ نے ہزار صفتیں دی ہیں۔اتنی سگھڑ بیٹی کوئی کوئی ہوگی۔میں نے پائی پائی جوڑ کر اس کی شادی کی تھی۔حرام زادہ جی پی او میں ڈاکیا ہے۔چھ مہینے بعد ہی ماں کی باتوں میں آکر اس نے شہدی کو طلاق دے دی۔'' ماسی کے حلق سے چیخ سی نکلی۔وہ رو رہی تھی۔

راجا کو ماسی پہ ترس بھی آیا اور پیار بھی۔اس کے کاندھے کے گرد بازو ڈال کر ساتھ لگاتے ہوئے بولا:

''ماسی تم میری ماں بجا ہو۔مت روؤ۔بس ڈن ہی سمجھو۔۔!''

ماسی کی بلا جانے کہ ڈن کیا ہوتا ہے۔وہ سمجھی کہ یونہی سعادت مندی کا مظاہرہ

کرر ہا ہے۔تاہم ہمدردانہ لب ولہجہ محسوس کر کے اس کی ڈھارس بندھی اور وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

راجا آہستہ آہستہ اس کے کندھے دبا تے ہوئے سوچ رہا تھا کہ سیکنڈ ہینڈ ہے تو کیا ہے؟ بالکل نئی جیسی ہے۔۔ایک ٹانگ میں لنگ سہی مگر میاں بیوی کے باہمی تعلق میں ٹانگ کا عمل دخل ہی کیا ہے؟ میرے پاس کہاں اتنا وقت ہوا کرے گا کہ فوجی افسروں کی طرح بیگم کو ہمراہ لئے شام کو واک کے لئے نکلوں۔ایسی بیوی بہت بڑی نعمت ثابت ہوگی جو کہیں آنے جانے سے گھبرائے اور گھر بیٹھنا پسند کرے۔مجھے کام چلانا ہے اور وہ انشاءاللہ خوب چلے گا۔۔اب یہ ہے کہ ماسی بات وارے کی کرے تو سودا ڈن کروں۔"

راجا ئی سوچوں کا سلسلہ تب منقطع ہوا جب ماسی نے دوبارہ لب کشائی کی۔

"جب سے اللہ بخشے سکینہ فوت ہوئی ہے، مجھے بھی وہم ہونے لگا ہے کہ میں جلد مرجاؤں گی۔بیٹی کی فکر کھائے جارہی ہے۔بیٹے کو تو پرواہی نہیں۔جب کا نائیک بنا ہے چھٹی کم کم ہی آتا ہے۔سوات میں ڈیوٹی ہے۔چار چھ مہینے بعد چند روز کے لئے آئے بھی تو میری بہو پنج پھلاں رانی' اسے ساتھ لے کر ماں کے پاس کھوٹہ چلی جاتی ہے۔آج کل بھی دونوں وہیں گئے ہوئے ہیں۔میری اپنی کمائی اتنی ہے کہ ہم ماں بیٹی کا خرچہ پورا ہو جاتا ہے۔بیٹے سے میں کچھ نہیں لیتی۔لیکن میری بہو کو نند سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ظالم بدبخت بات کرتے ہوئے ذرا نہیں سوچتی۔کہتی ہے وہ ساری زندگی لنگڑی کو کہاں سنبھالتی پھرے گی۔حالانکہ میری بچی نے دستکاری سکول سے کام سیکھا ہوا ہے۔ٹینچ بھاٹہ میں ریڈی میڈ کپڑوں کی بڑی دکانیں ہیں۔میں نے دو چار دکانداروں سے بات کی ہوئی ہے۔سوچتی ہوں میں مرگئی تو وہ اپنے ہنر سے گھر بیٹھی روزی کما لیا کرے گی۔۔"

ماسی حلیمہ دل کی بات زبان پر لانے کی بجائے ادھر ادھر کی ہانک رہی تھی۔زخم خوردہ ماں کے لئے اپنے منہ سے بیٹی کے رشتے کی بات کرنا اتنا سہل نہیں تھا۔بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔وہ سوچ رہی تھی کہ جب کلثوم کنواری تھی تو درجنوں رشتے آتے تھے، مگر اکثر لوگ واپس مڑ کر نہیں دیکھتے تھے۔آخر منتوں مرادوں کے بعد رشتہ ہوا بھی تو ایسا کہ کاش کبھی نہ ہوتا۔اب تو طلاق کا داغ بھی لگ چکا ہے۔اس معاشرے میں اچھی بھلی لڑکیوں کو کوئی نہیں

پوچھتا۔ کیا خبر کیا جواب سننے کو ملے؟

ادھر راجا کو بے چینی لگی ہوئی تھی کہ ماسی سیدھی سیدھی بات کیوں نہیں کر رہی۔ چالاک ذہن خود اسے پہل کاری سے روک رہا تھا۔ تاجرانہ ذہنیت اس پہلو پر غور ہی نہیں کر رہی تھی کہ ماں کا دل انکار سننے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ جب صبر کا یارا نہ رہا تو وہ بول اٹھا:

''ماسی! ہم دونوں خواہ مخواہ فضول باتیں کر رہے ہیں۔ تمہارا اور میرا دونوں کا کام چل سکتا ہے۔ ہم دونوں کے لئے یہ سودا وارے کا ہے۔ اس لئے ڈن کرنے میں دیر نہیں لگانی چاہیئے۔۔۔ جن کپڑوں میں تمہاری بیٹی بیٹھی ہے' مولوی کو بلا کر انہی کپڑوں میں میرے ساتھ کلمے پڑھواؤ۔۔ یہ سامان جہیز بھی ادھر ہی جائے گا جہاں مشین پڑی ہے۔ نٹنگ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بھلا میں اسے دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھلا سکتا؟ تم اپنی بیٹی کو ظالم بہو سے بچاؤ۔۔۔''

ماسی حلیمہ نے خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے راجا کا سر دونوں ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا اور بولی:

''اللہ تجھے بڑے بخت لگائے گا۔ انشاء اللہ ایک دن تو بحری جہاز بھی ضرور خریدے گا!''

☆☆☆☆

بازار

طلعت زہرا (ٹورینٹو،کینیڈا)

''ہائے میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے'' میں آنکھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے یوں گویا ہوئی جیسے ماحول سے آنکھیں چرا لینے سے میرا درد ختم ہو جائے گ۔اف یہ آگاہی کا روگ!.........

(ذیشان کمرے میں داخل ہوا اور خاص تیزی کے سے انداز میں) مما ووٹ آر یو ڈوئنگ،کین آئی بیوسم منی؟

کس لئے بیٹا؟

ٹوگوٹوسٹاربکس فارکافی اینڈٹوگیس سٹیشن آپ نے تو باہر سے ناشتہ کرنے کی عادت ہی بنالی ہے۔گھر کا ناشتہ صحت افزا ہوتا ہے بیٹا۔

(بے نیازی سے)اویار موم میرا فون بل ویزا کی پے منٹ بھی ڈیو ہے۔

اس پرفون کا بل کتنا ہے،شانی؟

موم ودتو150$ کا ہے بٹ یوکین پے منیمم اماؤنٹ آن ویزا۔ڈیٹس اوکے فارمی۔

فون کا بل پھر بھی بہت زیادہ ہے!

(اکتا کر)موم آئی ہیوڈیٹا پلان ودمی۔

اچھا چلوٹھیک ہے لیکن میں تو ہر چیز کے پیسے آپ کو دیتی ہوں پھر یہ ویزا کا بل اتنا کیسے

بن جاتا ہے۔ ابھی دو ماہ پہلے میں نے 1000$ کی فل پے منٹ کی تھی۔

(مزید اکتاہٹ سے، زور دے کر) وٹ !! آئی نیوز بائے اینی تھنگ ایکسٹرا یو کین سی دابل، آئی ہیو والائف موم۔

(لاچارگی سے) نیکسٹ ٹائم ہی بیئرفل۔ گریب مائی کمپیوٹر۔ آئی ول پے یور بلز آن لائن۔

میں نے ذیشان کو کافی کے لئے کریڈٹ کارڈ دیا اور آن لائن بنک اکاؤنٹ کھولا تا کہ ذیشان کے بل ادا کر سکوں۔

''اف یہ لائن آف کریڈٹ تو ختم ہونے والی ہے'' ہلکی سی آواز میں خود کلامی کرتے ہوئے میں نے باہر جاتے ذیشان کو زور سے پکارا، ''ذرا میرا دوپٹہ تو پکڑاتے جانا سر میں باندھوں گی سخت درد ہے''

میرے شوہر کو اس پرائے ملک میں کمانے سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ ان تمام باتوں پہ غور کر سکے۔ ایک میں تھی کہ یہاں کے سسٹم کو سمجھنے کی تگ و دو میں بیمار ہوئی جاتی تھی۔ جب بھی سوچ کی پٹاری کا ڈھکن کھل جاتا مجھ پہ یہی درد سر حاوی آ جاتا۔ میری سوچ کو کیا ہو گیا ہے؟

اپنے ہی خیالات میں گم میں یہی سوچتی رہتی تھی کہ۔

''میں تمام ذاتی حقوق کھو رہی ہوں مجھے اپنے بچے کو کیا کھلانا ہے؟ کیسے اس کی حفاظت کرنی ہے؟ کن چیزوں سے منع کرنا ہے یہ سب میرے ہاتھ سے کیسے نکلا جا رہا ہے؟ جو کچھ بھی اس ملک میں رائج ہے یہ سب اس حکومت کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے یہاں کا نظام تعلیم ایسا ہے کہ بچوں کی اپنی کوئی رائے نہیں رہی ہے، وہی سوچتے ہیں جو حکومت چاہتی ہے کہ وہ سوچیں۔ اور پھر بھی ہم ایک آزاد اور ڈیموکریٹک سوسائیٹی کا حصہ کہلاتے ہیں۔''

ایسے ہی خیالات سے میرا سر کہیں اندر سے درد کرنے لگا۔

''لوگوں کو حکومت کا رویہ کیوں نظر نہیں آتا، کیوں نہیں سوچتے کہ یہاں کا نظام تعلیم سرا سر نظریہ اجتماعیت اور قومی نظریئے کی بنیاد پر ہمارے بچوں کی فکر، عمل اور جذبات کو تبدیل کر رہے ہیں۔ ہمارے بچے ہمارے نہیں رہے وہ ان کے بنتے جا رہے ہیں۔ کیا میں اپنے بچوں پر سے ہی اپنا حق کھو بیٹھی ہوں''

اور یوں مجھے آئے دن سر درد رہنے لگا۔

ان کا حق۔خود ارادیت، ان کی انفرادیت، ان کی انسانی اقدار اور آزادی کیا حکومت ان سب پر مسلط ہوگئی ہے۔ہاں ایسا ہی تو ہے۔یہ تو اب اجتماع کا حصہ بنتے جا رہے ہیں ایک ربوٹ ہاں ربوٹ ہی تو ہیں آج کے بچے کل کا مستقبل۔

''بیٹا آپ کمپیوٹر سے اٹھو گے تو امتحانات کی تیاری کرو گے نا''

''مما میرے سارے دوست آن لائن ہیں۔آئی کانٹ ہیلپ ات، میری گیم خراب ہو جائے گی''

میں ایک بار پھر سوچوں کے بھنور میں ڈوب گئی،''معاشرے کا ہر فرد تنہا پھر بھی جدید ٹیکنا لوجی کے ذریئے اجتماع کا حصہ ہے جس کی کبھی شکل بھی نہ دیکھی ہو وہی بہترین دوست ہے۔گلو بلائزیشن۔ھا،اسی کے لئے تو یہ مہم چلائی گئی ہے۔تمام دنیا پر ایک کی حکومت ایک ہی فوج، ایک ہی کرنسی، ایک ہی انتظامیہ۔کیا خفیہ طریقے سے مہم چلائی گئی ہے پوری دنیا کو ایک کرنے کی۔''

یہ سر میں ٹیسیں تو جان لے کر ہی چھوڑیں گی پر اس عذاب سے تو جان چھوٹے گی۔

''میں کہتی ہوں سارا دن گزار کیا ب آئے ہیں، ذرا فریش ہو لیں تو آپ کے لیئے کھانا لگاؤں۔''

''بھاڑ میں گیا کھانا، آج تو ٹرک الٹتے الٹتے بچا۔معلوم ہے کتنا نقصان ہو جاتا۔میرا تو دماغ ابھی تک سن ہے ٹرک میں سامان بھی تو کلورڈیل مال کا تھا۔بچت ہوگئی'

''لیکن یہ ہوا کیسے؟''

''بس ذرا اونگ آ گئی تھی وہ مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا''

''تین راتوں سے مسلسل جو ٹرک چلا رہے تھے، نیند تو آنی ہی تھی، کیا کریں گزارہ کیسے ہو؟ سر ڈھانکیں تو پیر ننگے ہوتے ہیں''

''کیا بچے سو گئے''

''ایک پڑھ رہی ہے۔ایک ڈیوٹی پہ گئی ہے اور بیٹے صاحب وڈیو گیم''تو کیا اس کو صبح

سکول نہیں جانا'' کھیل رہے ہیں''

''کل چھٹی ہے اس کی کچھ بچوں کی میڈیکل رپورٹس صحیح نہیں آئیں صرف انہی کو بلایا ہے۔نفسیات کی ڈکٹر آئیں گے معائنہ کریں گے اور سلاج بھی''

''تو کیا والدین کی مرضی کے بغیر سب کچھ ہو رہا ہے''

''فارمیلیٹی پوری کرنے کو کاغذ پر سائن تو کرواتے ہیں لیکن یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا ہے جو بچہ ان کے بنائے ہوئے شعور و فکر کے معیار پر پورا نہیں اترتا، خواہ وہ اپنی منفرد سوچ رکھتا ہو اسے ماہر نفسیات کے حوالے کر دیتے ہیں جن کا کام انھیں حکومتی سوچ کے سانچے میں فٹ کرنا ہوتا ہے۔ وہی گلوبلائزیشن والا، پوری دنیا ایک قوم، ایک طاقت کے زیر سایہ اور ہم لوگ چلتے پھرتے ریوٹ!''

میں اس سسٹم سے نالاں تھی -----------

موم آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہیں کیا ہوا؟

نہیں، نو بس یونہی تھکاوٹ ہوگئی ہے۔آپ کا کام کیسا رہا؟

سیم اولڈ پروبلم موم آج پھر جسٹینا نے اتنا تنگ کیا۔آئی ڈونٹ نو وٹ دے تھنک آف دیم سیلفز۔شی از ٹوٹلی آ بچ ،موم یو نو میں نے سارے کپڑے فولڈ کر کے رکھ دیے صبح سے آٹھ گھنٹے آل دا ٹائم ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر شیلفز ٹھیک کیں ساتھ ساتھ چینج روم سے تمام کپڑے لا کر ہینگ کئے ون تھاؤسینڈ کام موم ، پاؤں سوج گئے اور کندھے پین کر رہے ہیں۔ پھر بھی اس نے میری مینیجر سے شکایت کر دی کہ میں رتھ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔یو نو موم دیٹس، ناٹ فیئر، ہی ول کٹ مائی پے۔

''او ڈارلنگ، کیا تم نے کھانا کھایا ہے؟ دیکھو لنچ بھی ویسے کا ویسا ہی واپس لے آئی ہو۔'' میں نے مابین کا دل بہلانا چاہا۔

موم اتنی ڈانٹ اور کام کے بعد کس کا دل چاہتا ہے کھانا کھانے کو۔

مابین چندا، اس طرح تو تم نہ صحیح سے کام کر سکو گی اور نہ ہی پڑھائی پر دھیان دے سکو گی۔اچھا کل تو منڈے ہے نا،

یونیورسٹی کی کلاس ہو گی چلو اب چار دن کے لئے سٹور پہ نہیں جانا پڑے گا اب جاؤ اور

آرام کرلو۔

موم ابھی تو مجھے اسائنمنٹ کرنی ہے کل ڈیڈ لائن ہے ویک اینڈ پہ کام پہ جانے کی وجہ سے مکمل نہ کرسکی تھی۔

پھر تو آج کی رات بھی تم جاگوگی

وٹ ایلس آئی کین ڈو۔ مجھے اپنا جی پی اے تو خراب نہیں کرنا نا۔

ویسے بھی اوسیپ یعنی حکومت کا قرضہ بھی لوٹانا ہے۔ لیکن موم آج آپ مجھے واقعی پریشان لگ رہی ہیں۔ ڈونٹ یوٹل می۔

(اس نے آرام صوفے میں دھنستے ہوئے کہا)۔

ایک ٹھنڈی آہ میری پسلیوں کے آنکڑے سے یوں برآمد ہوئی جیسے میں نے ہی اسے اس پنجرے میں قید کررکھا تھا۔ خود پر قابو کرتے ہوئے میں نے مابین کو تسلی دی:

یو بیو یور اون پرابلمز ٹوٹیکل، آئی ول بی او کے، مائی ڈیئر مابین۔۔۔۔۔۔۔۔

میرے سامنے ایک کاغذوں کا انبار لگا تھا جس میں بجلی پانی گیس فون ٹی وی لائن آف کریڈٹ، ڈیبٹ مارگیج، ہوم انشورنس، کار انشورنس، پراپرٹی ٹیکس اور نجانے کون کون سے کاغذات تھے جن کو میں فائل میں لگا کر رکھ رہی تھی۔ سر کا درد نہ ٹلنا تھا نہ ٹلا۔ ایک فقرا ذہن میں گونجنے لگا،

''حکومت کا تعلیم کے لئے قرضہ بھی تو لوٹانا ہے''

یہ ننھے بچے کس عذاب میں پھنس جاتے ہیں یونیورسٹی کی فیس ادا کر کے حکومت ان بچوں پہ احسان کرتی ہے واقعی یہ حکومت نہ ادا کرے تو ساری دنیا سے اپنے ملکوں اپنی زمین کو چھوڑ کر آئے یہ بچے کہاں سے پڑھائی کے پیسے ادا کر سکتے ہیں۔ فیس تو ادا ہو جاتی ہے لیکن قرضہ ان کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے اس کی خبر ان کو ہوتی ہے جب حکومت کو یہ قرضے لوٹانے پڑتے ہیں۔ ہو نہ ہو یہ قرضہ ہی میرے سر درد کی بنیادی وجہ ہے، گھر ہے تو وہ قرضہ پر، بچوں کی پڑھائیاں، کار، اخراجات سب ہی قرضوں پر چل رہا ہے۔

ہمارا کیا ہے، ہمارا تو اپنا ملک بھی اپنا نہیں جہاں ہم پیدا ہوئے جس کو ہم اپنی جڑیں سمجھتے ہیں وہ تو قرضوں کی نظر ہو گیا۔ ہمارا ملک قرضوں میں جکڑا ہے یہ آئی ایم ایف، ورلڈ بنک

،انٹرنیشنل ریٹنگ لون سسٹم، یہودیوں کے سودی نظام کا عذاب۔ یہ ملک بھی میری طرح قرضوں سے آزاد نہیں ہوسکتا، سود در سود۔۔اسی نظام نے سرمایہ خلق کیا، سرمایہ نے سرمایا دارانہ نظام، ہم مزدور ہمارے بچے مزدور ہمارا ملک مزدور۔۔۔قرضہ، سود، سرمایہ اور مزدور۔۔۔تم بھی مزدور ہو۔

لوگو! سنو کوئی میری آواز کیوں نہیں سنتا؟

میرا سر پھٹ رہا ہے کوئی ہے علاج اس کا۔

تم ٹرک چلاؤ یہاں میں فیکٹری میں کام کروں تمہارے بچے ٹم بارٹن اور میکڈونلڈ میں برگر بنائیں اور بیچیں۔ ہم سب مزدور ہیں

یہ سرمایہ دار۔ یہ پوری دنیا کو ایک قوم بنائیں گے زمین پر ایک ہی حکومت راج کرے گی، سازش۔۔خفیہ سازش۔۔۔

کوئی ہے جو مجھے سر درد کی گولی دے دے۔

گولی نہیں نہیں یہ اس کا علاج نہیں، میرے ملک کو گولی کی نذر نہ کرو۔صرف اس لئے کہ وہ تمہاری بات مانتا رہے تمہارے سر کا درد نہ بنے تم یہاں بھی گولیاں چلاتے ہو۔ایک زمین ایک حکومت، گو بات نہ مانے سر درد بنے اسے گولی سے ٹھیک کر دیتے ہو۔

اچھا مجھے تو کوئی سر درد کی گولی دے نا۔ یہ بچیاں کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

باجی ایک منٹ رکیں نا او مائی گاڈ، رئیلی لَو دِس۔اینڈ وائٹ دِس شرٹ۔

یا شیور یو کین ٹیک اِٹ صبین بٹ آئی ول گٹ مائن فام دی ''مینگو'' یو وونٹ بیلیو واٹ، اٹس کریز ناؤ آ ڈیز۔

باجی ڈونٹ یو لائک مائین۔

یا اٹس گڈ بَٹ فرام لاسٹ ائیر فیشن۔آئی تھنک یوُ شڈ ناٹ گٹ اِٹ۔

او کے لیڈیس گو ٹو مینگو آئی ول گٹ مائن فرام دیئر ٹو۔

وی کین ہیو بگ سیونگ کوز آئی ہیو سَم کوپنز آلسو

واؤ دیٹس گریٹ۔

مینگو جاتے ہی دونوں نے خوب خوب کپڑے پہن پہن کر دیکھے اور آٹھ دس ٹی شرٹس اور کچھ پینٹس لے کر کاؤنٹر پر پہنچیں۔کوپنز اور کریڈٹ کارڈ اس کے حوالے کیا۔کل پانچسو ستر

ڈالرز کا بل آیا انھوں نے انتہائی مسرت سے اپنے اپنے شاپنگ بیگز اٹھائے ادر گھر کی طرف چل دیں۔ وہ آپس میں اس بات پہ بہت خوش تھیں کہ انھوں نے پچاس ڈالرز کی بچت کر لی ہے۔

بچیاں کہاں ہیں، اوہ اچھا بازار گئیں ہیں ھا یہ کارپوریٹ ورلڈ، یہ برانڈ نیم یہ پروڈکشن یہ ، رکیٹنگ اور سیل۔ میں نہ کہتی تھی یہ ان کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ یہ ہمیں انسان سے سدھائے ہوئے جانور بنانا چاہتے ہیں۔ بازار سے گزرو تو بچے تو بچے بڑے بھی خود پہ قابو نہ پا سکیں۔ اتنے بڑے نیوئن سائن کہ آنکھیں چندھائیں سو چندھائیں پر من ایسا مچلے کہ بازار سے نہ جائے۔

ارے ارے تم کہاں چل دیئے ابھی تو آئے تھے کام سے۔۔۔۔۔

’’وہ ذرا میرے آئی پاڈ کا بلوٹوتھ کام نہیں کر رہا، نیا لینے جا رہا ہوں بھی گیا اور ابھی‘‘

اور وہ میرے سر درد کی گولی؟؟؟؟

☆☆☆☆

بین کرتی آوازیں

نسترن احسن فتیحی (علی گڑھ، انڈیا)

سارا نے بے چینی سے ٹہلنا شروع کیا۔۔۔ خیال بھی بلبلے کی طرح ہوتے ہیں، کسی لمحے میں ایک خیال جیسے ہی پیدا ہوتا ہے ویسے ہی ختم ہو جاتا ہے پھر دوسرا۔۔ تیسرا اور نتیجے میں ایک تذبذب کی کیفیت، ایک اضطراب۔۔۔ اس کے اندر یہ اضطراب شور اور سناٹوں کے تصادم نے پیدا کیا ہے جو نہ جانے کب سے اس کا پیچھا کرتا رہا ہے اور جب اس کے اندر یہ تصادم بڑھتا ہے تو اس کے پیٹ میں کپکپی شروع ہو جاتی ہے اور وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے۔۔۔۔ چہرہ سست ہو جاتا ہے اور اسے ابکائی سی محسوس ہوتی ہے۔۔۔ اس کا یہ اضطراب دوسروں پر بہ آسانی عیاں ہو جاتا ہے اور اسی لئے وہ سب کی نظروں سے بچنے کے لئے پریس سے اٹھ کر اوپر آ جاتی ہے۔ اپنے پیچھے سوال جواب اور چہ مگوئیاں چھوڑ کر "۔ کیا ہوا۔۔۔؟ پھر، ٹیگرین۔۔۔۔؟ آرام کرو۔۔ فضول کام میں سارا دن۔۔۔"

کتنی بڑبڑاہٹیں۔۔۔ اس کا پیچھا کر رہی ہوتی ہیں۔۔

یہ گھر اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے، چھ کمرے ہیں مگر زمین کا پھیلاؤ نہ ہونے کی وجہ سے اوپر بڑھے ہیں ہاں اس میں رہنے والے افراد ضرور زیادہ ہیں۔ اس پر یہ کہ نچلی منزل کے دو کمرے گودام ہی بنے رہتے، ہمیشہ اوپر سے نیچے تک ٹھساٹھس بھرے ہوئے اخبار، گرد سے اٹی کچھ نصابی کتابیں، سیاسی اشتہار کے پرچے اور کئی طرح کی رسید بک۔ اس کا دل چاہتا کہ اس سارے عذاب سے ان دونوں کمروں کو نجات دلا دے تاکہ اس کمرے کے ساتھ گھر کے مکیں بھی کچھ کھلی

فضا میں سانس لے سکیں۔

اس نے اوپر کی بالکنی سے نیچے جھانکا۔ دھوپ چھاؤں نے دیوار پر پرچھائیں سی بنا رکھی تھی۔ تم باہر مت نکلو خطرہ ہے- بہت ٹریفک ہے- سامنے آنا ضروری ہے کیا، ایک طرف رہو۔ اس سناٹے میں آواز گونجی مگر اس آواز کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے چاروں طرف آوازیں تھیں۔ بے شمار آوازیں، گاڑی کا ہارن، کوکر کی سیٹی۔ کسی کے ہنسنے اور چلانے کی آواز کوئی بہت قریب سے بولا تھا میرا بچہ بہت بیمار ہے۔ رام نام ستیہ ہے۔ کوئی مر گیا ہے۔ وہ بالکنی سے ہٹ گئی۔ آوازیں دھیمی ہوئیں۔ ان آوازوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب غیر حقیقی آوازیں ہیں۔ مگر اس کے سناٹوں کی آواز حقیقی ہے اسے لے کر ڈوبنے لگتی ہے۔ اس نے ٹی وی کھول لیا۔ ایک چینل سے دوسرے چینل پر فلمیں۔ رپورٹروں کے چیخنے کی آوازیں۔ مضحکہ خیز مباحثوں کا پینل، یا کسی سیاسی لیڈر کا مسکراتا ہوا چہرہ۔ وہ چینل بدلنا بھول جاتی ہے جان بوجھ کر یا غلطی سے آواز کا گلا گھونٹ دیتی ہے، منسٹر کے مسکراتے ہوئے لب ہل رہے ہیں۔ ان کے پاس مسکرانے کی کیا وجہ ہے یہ کیسے مسکرا سکتے ہیں۔ کیا دنیا میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے؟ چل ہی رہا ہوگا تب ہی کہیں سے گانے کی آواز آ رہی ہے- وہ اپنے اندر اور باہر کی آواز کا گلا نہیں گھونٹ سکتی وہ کہیں نہ کہیں سے در آتی ہیں- اور اسکی سماعت سے ٹکرانے لگتی ہیں- وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آتی ہے۔ "سارا کھانا کھا لو نانی کہتی ہیں-"

"نانا نہیں آئے کیا؟" وہ پوچھتی ہے۔ خیالات کے بلبلوں کو لفظوں میں ڈھالنے کے لئے وہ نانا سے جرح کرنا چاہتی ہے۔

"نہیں-" جواب ملتا ہے۔

ارے آج پھر مائیگرین کا اٹیک ہے کیا؟ تو آرام کرو-" ماموں زاد بہن نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔"

وہ گودام میں چلی جاتی ہے- اسی گودام کی وجہ سے اسے نانا کے کام اور گھر سے نفرت تھی ہمیشہ سے۔ وہ موٹی سی عینک آنکھوں پر چڑھائے اپنے پریس کے کاموں میں لگے رہتے تھے جو گیرج میں چلتا ہے اور اسی گیرج میں چھوٹا پارٹیشن کر کے اس کا آفس بنا ہوا ہے۔ کمپوزر، پرنٹر اور پبلیشر کا سارا کام نانا ہمیشہ اکیلے ہی دیکھا کرتے تھے نہ جانے کب سے۔ وہ

بہت چھوٹی تھی جب دعا مانگا کرتی کہ یا خدا سیلاب آجائے اور یہ سارا کباڑ سیلاب بہا کر لے جائے مگر نہ سیلاب آیا نہ پریس بند ہوئی۔ ہاں کبھی کبھی اخبار ضرور بند ہو جاتا جب پولیس نانا کو پکڑ کر لے جاتی کچھ دن ان کے مہمان رہ کر وہ اپنی ملیح سی مسکراہٹ کے ساتھ واپس آجاتے اور اخبار پھر نکلنے لگتا — مگر نانا کی غیر حاضری والے دور میں جب ماموں پریس چلاتے تو وہ نصابی کتابیں اور رسید کی ہی چھپائی کروایا کرتے — وہ رفتہ رفتہ جان گئی تھی کہ نانا کے اخبار بکتے کم تھے اور گودام کی زینت زیادہ بن جاتے تھے پر اب اس پلپلا روڈ پر "آج کی آواز" کا پریس کچھ زیادہ زور و شور سے چلنے لگا ہے کیونکہ اب وقار ماموں پوری طرح اس کام میں شریک ہو گئے ہیں اور اب کمپیوٹر پر کمپوزنگ ہوتی ہے — وہ بھی ماس کمنیکیشن کی پڑھائی کر کے اخبار سے منسلک ہو گئی ہے ایک مستقل کالم لکھنے کا کام اس کے سپرد ہے، نانا اب کام میں حصہ نہیں لے پاتے کبھی کبھی پریس کے آفس میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں - ماموں کو اب دماغ کی نہیں کچھ کارندوں کی ضرورت ہے — پریس کی دوسری مشینوں کی طرح بیجان پرزے جو سوچنا نہ جانتے ہوں، نانا اپنی ضعیفی کے باوجود سوچنا بھی جانتے ہیں اور ان کی اس سوچ کی ایک پہچان اور عزت بھی ہے"۔ آج کی آواز" کے عزیز احمد سے ہر سوچنے والا دماغ واقف تھا۔ مگر ماموں کو اب پیسے کی ضرورت تھی عزت تو نانا نے " آج کی آواز" کے لئے کما ہی لیا تھا۔ موں وقار اس سے بھی کمپوزنگ کے کاموں میں مدد لینے لگے تھے، مگر وہ اسے ایک کمپیوٹر کی طرح ہی کام کرنے کی اجازت دیتے انسان کی طرح نہیں — صبح چار بجے یہ اخبار وین پر لوڈ ہو کر اپنی منزل کی تلاش میں روانہ کر دئے جاتے ہیں — جب سے ماموں نے کام سنبھالا ہے پولس کم آنے لگی ہے — ماموں نئے زمانے کے پروردہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارا قانون، ہماری پولیس اور ہماری نوکر شاہی اعلی ستائش کے لائق ادارے ہیں اور ان پر نکتہ چینی کرنا ایک غیر قانونی حرکت ہے — ان کے اخبار کے صفحات پر رنگین خوبصورت تصاویر نے بھی کافی جگہ گھیر لی ہے، اردو زبان کی کم ہوتی ہوئی قدر کو بڑھانا وہ جانتے ہیں اسی لئے اب " آج کی آواز" کے صفحات پر خبریں کم اور اشتہار زیادہ رہتا ہے، کبھی کبھی ماموں اور نانا میں بحث ہو جاتی ہے اور نانا دلبرداشتہ ہو کر چپ ہو جاتے ہیں۔ اور ہر ایسے موقعے پر وہ گودام میں چلی جاتی ہے - اس شور سے گھبرا کر پناہ لینے کی اب وہ بہترین جگہ بن چکی ہے، جہاں

عجیب سی پراسرار خاموشی ہے۔ وہ خاموشی اس سے بات کرتی ہے، اخبار کی سرخیاں طرح طرح کی شکلوں میں اس پر منکشف ہونے لگتی ہیں- ان سرخیوں سے ہم کلام ہو کر اسے سکون ملتا ہے اور اس کا اضطراب کم ہونے لگتا ہے۔ وہ ان آوازوں کو آزاد کر دینا چاہتی ہے جنھیں اس گودام میں قید کر دیا گیا ہے۔ گودام کے سناٹوں میں ان آوازوں کا بین سر پٹکتا ہے اور اسے پا کر ہمکلام ہو جاتا ہے ان آوازوں سے دوستی کرنا اسے نانا نے ہی سکھایا ہے۔ جب وہ بہت چھوٹی تھی اس کی ماں نے اسے نانا کے گھر چھوڑ دیا تھا کیوں کہ اس کے والد کے فوت ہو جانے پر ماں نے دوسری شادی کر لی تھی اور اس نئے گھر میں اس کے لئے گنجائش نہ تھی۔ وہ ماں کے آنے پر بہت چیختی روتی اس کے پیروں سے لپٹ لپٹ جاتی مگر ماں کی جانے کیسی مجبوری تھی؟ سارہ نہیں سمجھ پاتی اور اگر زیادہ پچھاڑیں کھاتی تو گودام میں گھسیٹ کر بند کر دی جاتی کیونکہ اس وقت وہ اس گودام کے اندھیرے کمرے سے بہت ڈرتی تھی اس کی سسکیاں حلق میں گھٹ جاتیں۔ اوپر تلے رکھے اخبار عجیب عجیب حیوانی شکلیں بنانے لگتے۔ جیسے اسے زندہ نگل جائیں گے۔ ماں کے چلے جانے کے بعد کبھی وقار ماموں کبھی نانی یا نانا اسے وہاں سے نکال لے جاتے۔ نانا نے ایک بار اس کے خوف کو سمجھ لیا پھر وہ اپنی انگلی پکڑا کر اسے وہاں اکثر لے جایا کرتے اور اخبار کے پرانے پرچے کھول کر خبروں، کہانیوں اور واقعات سے اس کی دوستی کراتے۔ پھر اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ اس گھر کی بہترین جگہ یہ گودام ہے ماں کے آنے کا اسے اب انتظار نہ رہتا اور آنے پر پرواہ نہ رہتی۔ اب اسے کبھی زبردستی کھینچ کر گودام میں مقید نہ کرنا پڑتا ماں کے آنے پر وہ خود گودام میں آ جاتی اور ماں کے جانے کے بعد ہی نکلتی۔ کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ ماں اپنے شوہر کے سامنے اس کی موجودگی کو پسند نہیں کرتی۔ اس لئے ماں کی بے اعتنائی سے یہاں پناہ لیتے لیتے ان آوازوں سے اس کی گہری دوستی ہو گئی۔ وہ ایک ایک کی التجا سنتی، اسے لگتا تھا کہ پلیا روڈ کی اس دم گھونٹو فضا، نالیوں کی بدبو اور اندر باہر کے شور سے اس کا دل جیسے گھبرا جایا کرتا ہے، ویسے ہی اس گودام میں بہت سی سچی آوازوں کا گھبراتا ہوگا۔ ماموں کے نکالے ہوئے "آج کی آواز" میں زور شور سے اس قصبے اور شہر کی ترقی کی خبریں چھپتی ہیں مگر وہ جانتی ہے کہ یہ ترقی کسی منصوبے اور تخیل کے بغیر والی ترقی ہے۔ کوئی منصوبہ، سڑک، بجلی، پانی کچھ نہیں۔ اسے یقین نہیں آتا کہ وہ دہلی جیسے شہر کا ہی

ایک حصہ ہے۔اس کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ شہر اور قصبوں کے مکان اور زمین کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ لوگوں کے پاس پیسے آگئے ہیں۔ کالا بازاری کے پیسے دھوکے اور کرپشن کے پیسے۔ ایسے پیسے والوں کی اطمینان کی خبروں کو ماموں "آج کی آواز" پر سجا دیتے ہیں کیونکہ انہیں بزنس کا طریقہ معلوم ہے۔ جہاں یقین نہ ہو وہاں امیدیں دھڑا دھڑ بک جاتی ہیں۔ کھلے گریبان والی تصویروں سے سجا اخبار ہر پان اور نائی کی دکان کی زینت ضرور بنتا ہے۔ ایسے اخبار لفافے بنانے اور ریک پر بچھانے کے کام میں آنے کے لئے ردی میں بک کر بھی کچھ قیمت دے جاتے ہیں۔ زندگی میں مایوسی پھیلانے والے کالم پڑھنے کی فرصت آج کسی کے پاس نہیں ہے۔ وقار ماموں اس کے لکھے کالم پر روز برستے ہیں، مگر نانا کی طرح اسے بھی جھوٹی امیدوں کے پیچھے چند سچی آوازوں کی موت منظور نہیں۔ نہیں وہ ان آوازوں کو مرنے نہیں دیگی۔ اخبار اور ٹی وی میں ان آوازوں کی جگہ نہیں تو کیا ہوا۔ وہ اپنے اخبار کے کالم میں انہیں جگہ دیگی۔ جب ہر خبر کے لئے روز اخبار کے عملے کے ساتھ یہاں وہاں کی خاک چھانتی ہے۔ اسے ہر خوشی، ہر خبر یا ہر ظلم اور جبر کے پیچھے بین کرتی کچھ آوازیں جکڑنے لگتی ہیں۔ مگر خبر بنانے والے ان آوازوں سے بچ بچا کر اپنی ذہانت اور مہارت سے ان خبروں کو پالش کر کے چمکا لیتے اور وہ ان آلائشوں کو اپنے لئے جمع کر لاتی۔ اسے سمجھ نہیں آتا کہ حکومت کی کون سی طاقت ان اداروں کو ایک کٹھ پتلی کی طرح استعمال کر لیتی ہے، اسی لئے وہ کوئی ریپ کیس ہو یا قتل، عوام پر کوئی جبر ہو یا کرپشن لوگوں کا غم وغصہ سڑکوں پر ضرور ابل پڑتا، وہ ہر بھیڑ ہر انتشار کا خود حصہ بن جاتی ہے۔ پوری طاقت سے اس غم اور غصے کو وہاں تک پہنچانے کے لئے جہاں اس کا ازالہ ہو سکے- مگر یہ غم وغصہ صرف ایک اجتماع ہوتا ہے، جس پر دفعہ ایک سو چوالیس لاگو کر دیا جاتا ہے- وہ قانون جو اٹھارہ سو ستاون میں انگریزوں کے خلاف بغاوت روکنے کے لئے بنا وہی قانون آج بھی لوگوں کے اجتماع کو روکنے کے لئے لاگو کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے سیاست دان ان ہی لکیروں کو پیٹ رہے ہیں، قانون آج بھی بنتے ہیں مگر اس میں انسانیت کی فلاح سے زیادہ ذاتی مفاد کی آمیزش ہوتی ہے- قانون بننے کے لئے کسی نربھیا کو بے موت مرنا پڑتا ہے کسی بستی کو جلنا ہوتا ہے۔ سڑکوں پر "لو جہاد" اور ریپ جیسی قانون شکنی کے بعد آرڈیننس تیار ہوتا ہے پھر اسے پاس

کرنے نہ کرنے پرلڑائیاں ہوتی ہیں ملک کے کندھے پر اخراجات کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے اور اس درمیان عوام اپنی امید اور نا امیدی کو، اپنے احتجاج اور مایوسی کو انڈیا گیٹ پر موم کے آنسوؤں میں بہادیتے ہیں۔ اور جب وہ ان آنسوؤں کو اپنے کالم میں سمیٹ لاتی ہے تو وقار ماموں اسکے کچھ ایسے ہی کالم کو اس کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں ۔ یہ کہتے ہوئے کہ جذباتیت سے بھری ہوئی تحریر ہے- جذبات اور تجارت کا گزارہ ایک ساتھ ممکن نہیں، وہ کچھ روشنی، کچھ خوشی، کچھ رنگ تلاش کرنا چاہتی ہے مگر اپنی زمین سے دور خوشی اور رنگ کی تلاش میں بھی راکھ، دھواں اور خون کے علاوہ اسے کہیں کچھ نہیں ملتا-

سرحد پار سے بھی بیشمار درد سمیٹ لاتی ہے، اس کا کالم سرخ دھبوں سے داغدار ہو جاتا ہے، پشاور کے بچوں کی موت کا درد سرحد پار کر کے اسکے اندر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور اس درد کو وہ اوڑھ لیتی ہے، ہزاروں سوال تھے ۔ جو اسے جینے نہیں دیتے تھے اس کے اندر خاموشی اور آوازوں کا تصادم جاری رہتا۔ اور وہ کالم میں اپنا درد انڈیل کر سارا بوجھ معاشرے پر منتقل کرنا چاہتی ہے۔ مگر کالم چھپا تو وقار ماموں نے اسے بالکل بدل دیا۔ استفسار پر انہوں نے اس سے کہا تم ابھی سیکھو۔ خبر اور درد کو الگ کرنا سیکھو، یہ تمہارا ٹریننگ پیریڈ ہے- اس کے اندر پھر ایک چیخ گھٹ گئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی چین سے رہنے والے ان آہوں آنسوؤں اور دھبوں کی صرف خبروں سے بھی اپنی دنیا کو پاک کیوں رکھنا چاہتے ہیں کیا اس ظلم پر وہ اپنے ہی اخبار میں ذرا سی جگہ نہیں پا سکتی ۔ مگر کہہ نہ سکی، ماموں نے سختی سے کہا تم ان نقصانات سے واقف نہیں اس لئے ایسی جذباتیت سے کام لیتی ہو اپنا فوکس چینج کرو ۔ وہ پھر نئی خبر کے پیچھے بھاگی۔ نئی آوازوں کے پیچھے، کبھی جن پتھ ۔ جو سیاسی تحریکوں کے لئے ممنوعہ علاقہ ہے وہاں غبارے بیچنے والے اور سیر و تفریح کے شوقین کا جمگھٹا لگا رہتا۔ جیسے دنیا سیر و تفریح اور خرید و فروخت کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔ مگر ماموں کو نہ جانے یہاں کون سی خبر نظر آتی ہے ان کا کیمرہ مین خوبصورت چہروں کا تعاقب کرتا ہے اور خبریں گڑھ لیتا ہے۔

"سارا تم کہاں ہو۔ نانی پریشان ہو رہی ہیں"۔ فون پر اس کے ماموں زاد بھائی زید کی آواز آئی۔

"میں آ جاؤنگی اندھیرا ہونے سے پہلے" اس نے فون کاٹ دیا آوازوں کے تعاقب

میں وہ لوگ جنتر منتر پر آئے وہاں اس وقت ہندوستان کی اس سو کروڑ آبادی کے نمائندے ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ وہاں میڈیا اور سیاست سے نظر انداز کئے ہوئے لوگ پولس اور قانون کی کینہ توز نظروں کو برداشت کرتے ہوئے اپنے کچھ بنیادی ضرورتوں کی مانگ لیکر جمع ہو رہے تھے۔ رہنے اور کھانے کا حق۔ کام اور جینے کا حق مگر یہ ڈھور ڈنگر تھے پالتو جانور کے برابر بھی انکا حق نہیں تھا۔ یہ جسموں کو وہ امبار تھے جو نہ جانے کن دراڑوں سے نکل آتے ہیں جن کے لئے کوئی بستی، روزگار یا گوشہ عافیت نہیں تھی۔ جو جمہوریت پر یقین رکھنے کے لئے ہڑتالوں، ہنگاموں، نعروں پر یقین رکھتے تھے۔ جنکے تنبو کا رنگ بے اعتنائی کی دھوپ میں بدرنگ ہو گیا تھا۔ راحت کا نیا کالم تیار تھا۔ یہ کسی ریپ کا قصہ نہیں تھا کہ وہ بہت غیر اہم خبر تھی کیونکہ اب ہر دن ایسی خبریں آتی تھیں۔ یہ کوئی مسلمان اور ہندو خبر بھی نہیں تھی کہ اس پر تعصب کا الزام لگے یہ خبر تو اس سو کروڑ عوام کی تھی جو توجہ اور انصاف، نگ رہی تھی جو بھوک، سیلاب اور سوکھے کی زد میں تھی۔ گھر آ کر اس نے اطمینان سے اپنا کالم ماموں کے حوالے کیا اور سکون کی نیند سو گئی۔ دوسرے دن اخبار اس کے ہاتھ میں تھا ماموں نے کالم میں کچھ تبدیلی کی تھی اس کی تفصیلات کے ساتھ منسٹروں کے کچھ حسین وعدوں کا اضافہ تھا، ریلی کو بہتر ڈھنگ سے سنبھالنے کے لئے نظم وضبط کی تعریف تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں آئے اس طبقے کے نمایندوں کی آواز ضرورت اور مقصد کی ایک ہلکی سی آہٹ بھی اس کے کالم میں موجود نہ تھی۔ اپنے کالم کو دیکھ کر وہ حیران تھی۔ جملوں کی نشست و برخواست کی تبدیلی سے اسکے کالم کا مفہوم ہی بدل چکا تھا اور اسے لگ رہا تھا جیسے یہ پوری دنیا ایک گودام ہے جس میں اسے پھر سے بند کر دیا گیا ہے جہاں کچھ خوفناک ہیولے اس کی چیخوں کو اس کے گلے میں گھونٹ دیتے ہیں اور اس کی سسکیاں بھی بین کرتی ان آوازوں میں شامل ہو کر اسے خوفزدہ کر رہی ہیں۔ اور اس کے پیٹ میں کپکپی شروع ہو جاتی ہے اور اسے ابکائیاں محسوس ہوتی ہیں۔ اس کی ماموں زاد بہن اس سے پوچھ رہی ہے"۔ کیا ہوا۔؟ پھر مائیگرین کا اٹیک؟۔"

☆☆☆☆

شوٹ آؤٹ

اختر آزاد (جھارکھنڈ، انڈیا)

''افزائشِ نسل کے لئے بھی حکومت سے لائسنس لینا ہوگا''

جب بڑھتی ہوئی آبادی دنیا کے لئے مسئلہ بن گئی، تب دنیا کے تمام ممالک نے یہ فیصلہ کیا کہ جب چھوٹے چھوٹے معاملات میں قانون کا دخل ہے تو پھر آبادی جیسے اہم مسئلے پر کوئی ٹھوس قانون کیوں نہیں۔؟ جب کہ بڑھتی آبادی کے دباؤ اور کساد بازاری (RECESSION) نے دنیا کے معاشیاتی نظام کو متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر اس پر ابھی سے کنٹرول نہیں کیا گیا تو ایک دن کھیتوں کی جگہ سیمنٹ کے جنگل ہوں گے اور لوگ بھوک سے تڑپ رہے ہوں گے۔

.....اور پھر متفقہ طور پر یہ تجویز پاس ہوگئی کہ بچّے کے لئے بھی لائسنس لینا ہوگا۔ اور یہ اُن شادی شدہ جوڑوں کو ملے گا جو اِن شرائط کو پورا کریں گے۔

☆ جن کے پاس اپنا گھر ہو۔

☆ بینک میں دس لاکھ روپئے ہوں۔ (جسے حکومت بچّے کی تعلیم پر خرچ کرے گی)

☆ جانچ میں اگر نتیجہ لائسنس کے برعکس آیا تو ابارشن کروانا ہوگا۔ ابارشن نہیں کروانے کی صورت میں دوبارہ لائسنس فیس جمع کرنا پڑے گی۔

☆ مالیت کے حسب سے لائسنس دئے جائیں گے۔ یعنی ایک کروڑ مالیت والے کو دس لائسنس ملیں گے۔ دس سے زیادہ کسی کو ایشو نہیں ہوگا۔ اگر دس میں سے انہیں دو ہی بچّے چاہئے

تو آٹھ لائسینس کینسل کروانے ہوں گے۔ جس کے لئے بیس فی صد فائن دینا ہوگا۔ جس کا فائدہ اُنہیں سالانہ ریٹرن فائل کرتے وقت ٹیکس میں ری بیٹ کے طور پر ملے گا۔

لائسینس اور اس سے جڑی دوسری اہم باتیں میڈیا کے ذریعہ گھر گھر پہنچتی رہیں۔

☆ شادی کے ایک ماہ کے اندر لائسینس کا رجسٹریشن کروانا ہوگا۔

☆ لڑکا اور لڑکی کا تناسب بغیر کسی ذات پات، زبان، رنگ اور نسل کے ہر علاقے میں برابر برابر رکھا جائے گا۔

☆ کسے لڑکا اور کسے لڑکی کا لائسینس دیا جائے گا اس کا فیصلہ حکومت مرد وزن کی تعداد کو دیکھ کر کرے گی۔

☆ پرگنینسی کنفرمیشن کی اِطلاع ایک ماہ میں حکومت کو دینی ہوگی۔

☆ بچّوں کے نام انٹرنیشنل نمبر اور الفابیٹس کی مناسبت سے رکھے جائیں گے۔

☆ لڑکی ؍لڑکا کا رجسٹریشن الگ الگ ہوگا۔

☆001B لڑکا کا اور 001G لڑکی کا۔ یعنی یہ رجسٹریشن نمبر ہی ان کی شناخت کا باعث ہوگا۔

☆ اُنہیں دونوں کو آپس میں شادی کرنے کی اجازت ہوگی۔

☆ ماں باپ کسی بھی قیمت پر مذہب کی آڑ یا پھر کوئی اور بہانہ بنا کر اس کی مخالفت نہیں کر سکتے۔

☆ اگر کسی وجہ سے دو جوڑے آپس میں میوچول کرنا چاہیں تو حکومت کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ صرف میوچول لائسینس فیس کی پچاس فی صد رقم الگ سے جمع کرنا پڑے گی۔

☆ کسی بیماری یا حادثے کے شکار ہونے والے جوڑے کے لئے معقول جوڑے کی تلاش حکومت کے ذمّے ہوگی۔

☆ چور دروازے سے داخل ہونے والے غیر لائسینسی بچّوں کو نہ ہی شادی کی اِجازت ہوگی اور نہ ہی اُنہیں کسی طرح کی سرکاری نوکری یا رعایت ہی ملے گی۔

☆ اُن کا مالکانہ حق حکومت کے پاس ہوگا۔

☆ بغیر لائسینس بچّہ پیدا کرنے کے جُرم میں ماں باپ کو دُگنہ فائن یا دس سال کیسزا یا پھر دونوں کا سُکھ ساتھ ساتھ بھوگنا ہوگا۔

مذہبی پیشواؤں نے اس قانون کی جم کر مخالفت کی۔ حکومت کے خلاف لوگوں کو سڑکوں پر اُتارا۔ آسمانی قہر سے ڈرایا، دھمکایا کہ خدائی قانون سے بڑا کوئی قانون نہیں۔ حکومت ہوش میں آئے اور لائسینس بِل واپس لے۔ لیکن حکومت نے اس کے جواب میں پیشواؤں کو ملنے والی مراعات وسہولیات کو ایک ایک کر کے واپس لینا شروع کر دیا۔ اور یہ حکم جاری کیا کہ جو بھی بھیڑ کا حصّہ بنے گا اُسے لائسینس سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ پھر کیا تھا۔؟ دھیرے دھیرے بھیڑ کم ہونے لگی۔ پیشواؤں کے اندر کا جوش جو ایک وقت ان کی آواز میں اُبال مار رہا تھا۔ یک یک جھاگ بن کر گلے میں بیٹھ گیا۔ اس لئے ان کی آواز مدّھم پڑتی چلی گئی۔

اپوزیشن نے بھی بہت ہنگامہ کیا کہ بڑھتی ہوئی آبادی اور کساد بازاری تو صرف ایک بہانہ ہے۔ دراصل اس بہانے حکومت لائسینسی آلہء تناسل سے سرکاری خزانے کو پرِگنینٹ پر پرِگنینٹ کرنے کا کام کر رہی ہے۔ وہ بھی اس لئے کہ جب چاہیں اس کہ پھولے ہوئے پیٹ پر سر رکھ کر عیش کی نیند سو سکیں۔ لیکن اس ہنگامے نے واقعی حکومت کی نیندیں اُڑا دیں۔ بوکھلاہٹ میں حکومت نے اُن کے نیتاؤں کے پُرانے کیس کھول دیئے۔ کئی کو جیل میں ڈال دیا۔ کچھ کو ڈرا دھمکا کر، کچھ کو پیسے کا لالچ دے کر اور کچھ کو منسٹری کا راستہ دکھا کر اپنی پارٹی میں شامل کر لیا پھر ہونا کیا تھا: اپوزیشن کے دوسرے نیتا بھی جیل اور کورٹ کے چکّر سے خود کو بچانے میں لگ گئے۔

سرکار کے فیصلے کے خلاف غریبوں نے احتجاج کا بِگُل بجا دیا کہ وہ دس لاکھ کہاں سے لائیں گے۔؟ لائسینس نہیں بننے کا مطلب نسل کا خاتمہ۔ نسل کی حفاظت کے لئے غریبوں نے جاں توڑ محنت کی۔ اوور ٹائم پر اوور ٹائم کیا۔ ایماندار بھی صحیح غلط کا فیصلہ کئے بغیر آنکھ بند کر کے دولت کی حصولیابی میں جُٹ گئے۔ ان دنوں غریب لڑکوں کو کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ لڑکی دینے سے پہلے ماں باپ سو بار سوچتے تھے۔ اس لئے غریب گھرانے سے رشتے آتے ہی وہ اُنہیں لائسینس کے ترازو میں تولنے کے لئے لفظوں کا بٹکھرا لئے سامنے آجاتے تھے۔

"لائسینس خریدنے کی جب اوقات نہیں ہے تو پھر کیا میں اپنی بیٹی کو تمہارے گھر جھولا جھولنے کے لئے بھیجوں۔؟"

غریب لڑکیاں بھی ماں باپ کی عزّت کی خاطر پہلے سب کچھ سہ جاتی تھیں۔ لیکن اس قانون نے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر 'ماں' جیسے حسین بول سننے کے لئے ان کے کان ترس گئے تو....؟ تو پھر وہ اپنی کوکھ کو کیا جواب دے گی۔ اس سے تو اچّھا ہے زندگی بھر کنواری رہنا.... ایسے میں بے چارے غریب لڑکے جب کسی لڑکی کو دامِ اُلفت میں پھانسنا چاہتے تو وہاں بھی اس کا سامنا ذِلّت ورُسوائی سے ہوتا۔

''دیکھو مسٹر! میں آپ کی حیثیت جانتی ہوں۔ مجھے ہر حال میں 'ماں' بننا ہے۔ لائسینس چوری کر کے بنوائیں گے یا ماں کے زیور بیچ کر.... خبردار! جو دوبارہ راستہ روکنے کی جُرأت کی۔''

غریبوں کی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے دنیا کے تمام ممالک نے اپنے اپنے قانون میں 'سب سیڈی' کی گنجائش رکھی ہے اس قانون کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے غریبوں نے لائسینس میں بھی سب سیڈی کی مانگ کر دی۔ سب سیڈی دینے کا مطلب پھر ہر جگہ وہی غریبی، وہی بے روزگاری، وہی جھونپڑ پٹّی .... اِس لئے حکومت نے ان کی بات نہیں مانی۔ غریبوں کو لگا کہ اِس بہانے حکومت غریبوں کو ختم کرنے کی ناپاک سازش رچ رہی ہے۔ اس لئے انہوں نے روڈ جام، ہڑتال اور توڑ پھوڑ کے ذریعے حکومت کو چاروں طرف سے گھیرنے اور اس پر دباؤ بنانے کی کوشش ہے۔

''سب سیڈی ہمارا حق ہے۔ اگر حکومت نے دینے سے انکار کیا تو ہم سب لاکھوں کی تعداد میں اسمبلی کے سامنے خودکشی کر لیں گے۔''

غریب یونین کے صدر کی اس دھمکی کے بعد جوش میں ہوش کھونے والے دو چار جوڑوں نے اِجتماعی خودکشی بھی کی۔ حکومت ٹس سے مَس نہیں ہوئی۔ لیکن ذات کی بنیاد پر بنی تنظیموں کے آگے حکومت کو اُس وقت جھکنا پڑا جب انہوں نے پورے ملک میں صفائی کا مکمل ٹھپ کر دیا۔ ہر طرف گندگی، سڑاندھ، تعفّن۔ اس سے حکومت کا دم گھٹنے لگا۔ آخر کار حکومت نے ۷۵ رفیصد 'سب سیڈی' کا اعلان کر دیا اب انہیں لائسینس کے لئے صرف ۲۵ رفی صد رقم ہی جمع کرنا تھی۔ مہنگائی کے دور میں ۲۵ رفی صد رقم بچّے کی اعلیٰ تعلیم کا بار نہیں اُٹھا سکتی۔ اصولاً حکومت کو چاہئے تھا کہ سب سیڈی کی اس رقم کو بچّے کی اعلیٰ تعلیم پر خرچ کرتی۔ لیکن پالیسی میکرز جو اونچی ذات والے

تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ چھوٹی ذات والے کبھی اُن کی برابر کی کرسی پر بیٹھیں۔ اس لئے پالیسی بناتے وقت ۲۵ رفی صد رقم کو تعلیم کے لئے مختص کیا گیا۔ اور سب سیڈی والی ۵ ۷ رفی صد رقم کو تعلیمی خرچ سے الگ، حکومت کی تحویل میں 'فلاحِ عامّہ' کے لئے رہنے دیا گیا، کہ سب پڑھ لکھ لیں گے تو 'گندگی' کون اُٹھائے گا۔؟

جہاں غریب لائسنس کی حصولیابی کے لئے دن رات محنت، محنت اینٹ جوڑ کر دولت کی عمارت تعمیر کرنے میں لگے ہوئے تھے، وہیں کچھ دولت مند حضرات لائسنس منسوخ کروانے کے لئے وکیلوں سے رائے مشورے کر رہے تھے۔ لیکن کچھ عیش و عشرت کے دلدادہ امیر زادے جو روزانہ نائٹ کلب میں کاندھا بدلنے کے شوقین تھے، وہ حکومت کے اِس فیصلے سے خوش تھے اور اس بہانے اپنی اپنی بیویوں پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ لائسنس منسوخ کروانے میں جتنے پیسے لگیں گے، اتنے سے کم میں تو وہ کسی من چاہی سندری سے شادی رچا کر اس کی زندگی بھر کا خرچ اُٹھا لیں گے۔ گھر کے کاموں میں وہ مدد بھی کرے گی اور دو چار بچّوں کے آنے سے فائن کے پیسے بھی بچیں گے۔

دنیا کی کوئی بھی بیوی ایسی مدد کے لئے کبھی تیّار نہیں ہوگی۔ کیونکہ عورت زمانے کے سارے دُکھ جھیل سکتی ہے، لیکن ہزاروں سُکھ کے ساتھ سوتن کی حصّہ داری کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لئے ہر سال اپنی کوکھ کو داؤں پر لگا دیتی ہے

''دیکھئے اگر پیسہ ہی بچانا ہے تو میں ہر سال خود کو پرگنینٹ کروانے کے لئے تیّار ہوں۔''

''لیکن ڈارلنگ تمہارے فیگر کا کیا ہوگا۔؟''

دوسری طرف چند ایک عورتیں اس قانون کے آتے ہی اپنے فیگر کو لے کر پریشان ہو گئیں۔ کیوں کہ ان کے شوہر فائن دینے کے بجائے زیادہ سے زیادہ لائسنس کا استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی بیویاں اس حق میں نہیں تھیں۔

''میں کوئی مشین نہیں کہ تم جب چاہو بٹن دبا کر بچّہ برآمد کر لو۔''

لائسنس فارم کی خانہ پُری میں لوگوں کو کئی کئی دفتروں کے چکّر لگانے پڑ رہے تھے۔

یہاں تک کہ ڈاکٹروں کو گھوس دینا پڑ رہا تھا۔اس خوف سے کہ کہیں جان بوجھ کر وہ ایسی ویسی بیماری نہ نکال دیں، جس کے مُضر اثرات فارم پر پڑیں اور وہ کینسل ہو جائیں۔

بجلی کا انتظام کیسا ہے۔؟ واٹر سپلائی کیسی ہے۔؟ گھر ڈرائنگ کے مطابق ہے یا نہیں۔؟اس کے علاوہ کئی اور محکموں سے لوگوں کو اُلٹے سیدھے کاغذات بنوانے پڑ رہے تھے۔ اِنسٹنکٹ آپریشن کرنے والے چینلوں کو بھی اس کی خبر تھی۔لیکن اس کے رپورٹر بھی دفتروں کے آگے خفیہ کیمرے کے بجائے فائل لئے کھڑے تھے۔اس لئے دفتری بابو بے خوف ہو کر اپنا ہُنر بیچ رہے تھے۔

''جناب! شیشے کے اُس پار آپ دھوپ میں اِس طرح کب تک کھڑے رہے گیں۔؟ آپ تو سمجھدار لگتے ہیں۔اندر آئیں اور آرام سے بیٹھیں آمنے سامنے بیٹھنے سے بڑے بڑے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔''

اور ایسا ہوا بھی بابوؤں کے ایک اشارے نے بڑے بڑے مسئلے حل کرا دئے۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ ٹرانس پیرنٹ لفاف میں لائسنس کے ساتھ بچّہ تک پیک کر کے ضرورت مندوں کے گھر بھجوا دیتا۔''

ایک سال کی قلیل مدّت میں لائسنس کے کاروبار نے سرکاری خزانے کو سونے چاندی سے بھر دیا تھا۔جس کی بدولت حکومت نے عالمی بینک کہ وہ سارے قرض جسے اُتارنے میں کم سے کم پندرہ سے بیس سال لگ جاتے،اُسے یک مشت اُتار دیا تھا بہت سارے وہ غریب جو لائسنس بنوانے کے لئے بینک سے خوشی خوشی لون لئے تھے،لیکن جب قرض اُتارنے کی باری آئی تو اِن میں سے کئی ایک کی زندگی کی گاڑی قسط کی پٹری سے ایسی اُتری کہ دوبارہ کبھی چڑھ نہ سکی۔

وقت گذرتا رہا۔لائسنسی بچّے بڑے ہوتے رہے۔بڑے ہوتے ہوتے جب وہ واقعی بڑے ہو گئے تو اس میں سے کچھ نے حکومت کے خلاف مقدمہ درج کر دیا''میں کوئی بے جان شئے نہیں کہ کوئی میری مرضی کے بغیر میرا لائسنس جسے چاہے دے دے۔'' کئی سال تک یہ کیس چلا۔ لیکن عدالت نے لائسنس کے قانونی پروسیس کو صحیح ٹھہراتے ہوئے لائسنسیوں کے خلاف فیصلہ سُنا دیا۔لیکن اس کے بعد بھی لائسنسیوں نے ہمّت نہیں ہاری۔اور ایک دوسرا مقدمہ ٹھونک دیا۔''جب تک وہ چھوٹے تھے اُن کے پاس تھے جن کے پاس اُن کے ہونے کا لائسنس تھا۔لیکن اب جب کہ وہ بڑے ہو چکے ہیں تو انہیں اُن کی مرضی کے ماں باپ چننے کا لائسنس دیا جائے۔اور ساتھ ہی

ساتھ لائسینسی بچّوں کے بچّوں کی لائسینس فیس ختم کی جائے ۔ کیونکہ وہ تو پیدائشی لائسینسی ہیں ''لیکن لائسینسیوں کی ان باتوں کو مان لینے سے ہرطرف افراتفری مچ جاتی ۔ ہرکوئی ماں باپ کے لئے امیرااورشہرت یافتہ کا ہی انتخاب کرتا ۔ آپس میں خون خرابہ ہو جاتا ۔ اورلائسینس فیس ختم کر دینے سے مندی کے اس دور میں سرکاری خزانے کو بھرنے کا یہ نایاب طریقہ حکومت کے ہاتھوں سے نکل جاتا ۔ سرکاری پیسوں سے جو عیش اب ہو رہا تھا اسے کون کھونا چاہتا ۔ اس لئے حکومت نے عدالت کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کر کے انہیں اپنی طرف کر لیا۔

لائسینسیوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کی باتوں کا حکومت پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے تو اُنہوں نے ایک آخری چال چلی اور موت کے لائسینس کے لئے اپلائی کر دیا کہ کم سے کم موت پر اُن کا ادھیکار ہو ۔ کہاں مرنا ہے ۔؟ کس طرح مرنا ہے ۔؟ کب مرنا ہے ۔؟ اور مرنے کے بعد اُن کے جسم کے ساتھ کیا ہونا ہے ۔؟ یہ سب اُن کے اختیار میں ہوں ۔

سرکار نے ان کی یہ گزارش مان لی ۔ اِس شرط کے ساتھ کہ موت کے لائسینس بنوانے والے کو بچّے کا لائسینس نہیں ملے گا ۔ جنہیں مل گیا ہے اُنہیں کینسل کروانا ہوگا ۔ اور جن کے بچّے اِس دُنیا میں آ گئے ہیں اُنہیں اپنے بچّوں کو سرکار کے حوالے کرنا ہوگا ۔

اس شرط کی مخالفت میں چند لاشیں گریں ۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو گیا ۔ کیوں کہ لوگ مر کے بھی جینا چاہتے ہیں ۔ جینے کے لئے نئی نسل کا لائسینس ہونا ضروری ہے ۔ تبھی وہ لاکھوں کروڑوں سالوں تک نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے نئی نسل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے ۔

وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا ۔ لائسینسی بچّوں کے بچّے بھی اِس دنیا میں اپنے ہونے کا اعلان کر رہے تھے ۔ اب سرکار پوری طرح سے لائسینسی بچّوں کے ہاتھ میں تھی ۔ وہ چاہتے تو ایک نیا بل پاس کر کے لائسینس کے قانون کو ختم کر سکتے تھے ۔ حالانکہ اپوزیشن نے آواز اُٹھائی تھی ۔ لیکن وہ چاہ کر بھی اسے ختم نہیں کر سکتے تھے ۔ کیونکہ وہ سب عیش کی دلدل میں بہت اندر تک دھنسے ہوئے تھے ۔ جہاں سے باہر نکلنا اتنا آسان نہیں تھا ۔ اگر وہ طاقت بھی لگاتے تو باہر آنے کے بجائے اندر ہی اندر دھنستے چلے جاتے اب تو قانون میں پہلے سے بھی زیادہ سختی برتی جانے لگی تھی ۔ سرکاری خزانہ قارون کے خزانہ میں تبدیل ہو چکا تھا ۔ اس لئے سرکاری دفاتر میں عیش بھی دُگنا ہو گیا تھا لوگ سرکار کے اس رویّے سے پریشان تھے ۔ اِس پریشانی میں ایک اور پریشانی اس وقت

لوگوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی جب پیسے کے لالچ میں اندھی ہوئی حکومت نے پارٹی میں مخالفت کے باوجود لائسینس کے متعلق ایک نیا قانون مجلسِ قانون ساز میں پاس کر دیا۔

''اب افزائشِ نسل قانون کے تحت لائسینس کی ویلیڈیٹی (VALIDITY) ساٹھ سال کر دی گئی ہے۔ اگر ساٹھ سال کے اندر ان کے بچّے رینیول (RENEWAL) نہیں کرواتے ہیں تو اُنہیں بے کار سم (SIM) سمجھ کر ڈسٹ بین میں ڈال دیا جائے۔

حکومت کی طرف سے اِس قانونی فرمان کے جاری ہوتے ہی ساٹھ سال کی عمر کو چھوتے ہوئے بوڑھوں کے اندر بے چینی پیدا ہو گئی۔ ہر گھر میں دو بوڑھی آنکھیں ایک دوسرے کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگیں۔ ایک بوڑھی آنکھ نے دوسری بوڑھی آنکھ کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اُمید بندھانے کی کوشش کی۔

''تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُسے سب معلوم ہے کہ ہم نے اس کے لائسینس کے لئے اپنی جوانی کے پانچ سال آگ کی بھٹّی میں جھونکے ہیں۔ ڈاکٹر نے تمہاری بیماری کو دیکھتے ہوئے 'ماں' بننے سے منع کر دیا تھا۔ لیکن تم نے اپنی ضد کے آگے ڈاکٹر کی ایک نہیں مانی۔ یہ الگ بات ہے کہ تم موت سے جیت گئیں۔ اگر اُس دن تمہیں کچھ ہو گیا ہوتا تو.....؟'' جھرّی بھرے ایک ہاتھ نے دوسرے جھرّی بھرے ہاتھ پر آہستے سے ہاتھ رکھا اور آگے کہا ''تمہارے بیٹے کے پاس آج کیا نہیں ہے۔ ری نیول تو اس کے بائیں ہاتھ کا میل ہے۔ اس سلسلے میں بہو کے ساتھ بات کرتے ہوئے میں نے بابو کو دیکھا ہے۔ وہ بھی پریشان لگ رہا تھا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ وہ سب دیکھ لے گا۔ اسے بھی تو ہماری فکر ہوگی۔ تم دیکھنا وہ پہلے سے لائسینس ری نیول کروا کر کے گھر میں رکھ دیا ہوگا۔ سرپرائز دینے کی ہمیشہ سے اُس کی عادت جو ہے۔

وقت بھی ہر لمحہ سرپرائز دیتا رہتا ہے۔ دنیا کے سارے ماں باپ اس اُمید پر جیتے ہیں کہ زمانہ جتنا بھی خراب ہو جائے۔ کساد بازاری (RECESSION) کسی حد تک پہنچ جائے لیکن اُس کی اولاد کبھی اپنے ماں باپ کو موت کے کنویں میں نہیں ڈھکیل سکتی۔ اس لئے ری نیول سے متعلق ہر طرف سوچ کا عمل جاری تھا اور اس عمل میں ہر کوئی نفع نقصان کی سوچ رہا تھا۔

لائسینسی تہذیب کے پروردہ بچّوں کے ایک ایسے ہی کمرے میں شادی کی پہلی رات ریسیپشن کے بستر پر ایک نئی نویلی دُلہن اپنے اُداس پاؤں سمیٹے بیٹھی تھی۔

''ڈارلنگ تم نے وہ ری نیول والی خبر پڑھی۔؟''

''ٹی وی پر دیکھا ہے۔لیکن آج کی رات تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔''

''پریشان کیوں نہ رہوں۔کل جب بچّے ہوں گے تو اُس کی پڑھائی اور گھر کے دوسرے کاموں میں کتنا خرچ ہوگا۔آپ نے کبھی سوچا ہے۔؟اور آج پہلے ہی دن یہ ری نیول والا جھنجھٹ....'' وہ رونے لگی تھی۔ شوہر نے آنسو پوچھنے لئے جب اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بولی''ڈارلنگ !عقل سے کام لو۔میری سہیلیاں کہہ رہی تھیں کہ جتنے میں ری نیول ہوگا اتنے میں تو نیا لائسینس بن جائے گا۔''

ساٹھ سال پورا ہونے سے پہلے حکومت نے افزائشِ نسل رجسٹر کاؤنٹر کے سامنے ری نیول کا ونٹر کھلوادیا۔حکومت کو اُمّید تھی کہ اتنی بھیڑ ہوگی کہ سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔اس کے لئے الگ سے ری نیول ٹاسک فورس بنائی گئی تھی۔اور اسے ایک خاص وقت کے لئے ایک خاص طرح کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔تا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اس کام کو بخوبی انجام دے سکیں۔

جس دن ساٹھ سال ہوا، اس دن بھی ایک ہی کاؤنٹر پر لوگوں کا ہجوم تھا دوسرا کاؤنٹر خالی تھا۔

دوسرے دن ری نیول ٹاسک فورس کی طرف سے شوٹ آؤٹ کا عمل جاری ہوگیا۔

بچّے ایک یادگار تصویر کے لئے بالکونی میں موجود تھے۔

☆☆☆☆

برف کی عورت

شاہین کاظمی (سوئٹزرلینڈ)

’’انھیں لگتا ہے ان کے بودے جواز سے ظلم، ظلم نہیں رہے گا؟‘‘، میرے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا، گونگے بہرے در و دیوار کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا، میں نے اپنے کانپتے وجود کو سنبھال کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن چکرا کر گر گئی، پچھلے دو دن میں اِس اندھیرے کمرے میں بند تھی، میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں نے صدیوں کی گرد اوڑھے مکروہ روایتوں کی اونچی فصیلوں سے ٹکرانے کی کوشش کی تھی، رات کی تاریکی گہری ہو رہی تھی، فرش پر بچھی گھاس کی گندی باس حواس چاٹنے لگی ’’یہ حکمِ خداوندی نہیں ہوسکتا، جبرِ آسمان کا شیوہ نہیں ہے، یہ زمین کی پیداوار ہے، دھرتی کی کوکھ میں پنپتے ظلم کو آسمانی کہہ کر اپنے آپ کو اِس گناہ سے آزاد کرانے کی غیر منطقی کوشش ہے‘‘

’’بکواس بند کرو اپنی، یہ حکمِ خداوندی ہی ہے‘‘ عبرون کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے قتل کر ڈالے۔

’’کسی عورت کو کاٹ کر ادھورا کر دینا خداوند کا حکم کیسے ہوسکتا ہے‘‘ اپنی چھ سالہ بیٹی کا چہرہ ذہن میں آتے ہی میرے اندر کہرام مچ جاتا، عبرون وانیا کو صدیوں سے عورت کا خون چوستی نسائی ختنوں جیسی بیہودہ رسم کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا اس کا بھاری بھرکم ہاتھ اٹھا اور میرے چہرے پر نشان چھوڑ گیا بے اختیار میرے دونوں ہاتھ میرے گالوں پر ٹک گئے، کالی دیواروں سے آہستہ آہستہ سارے درد سرک کر میرے پہلو میں آن بیٹھے چہرے پر ادھوری بھوک اور تناؤ لئے

عبرون نے نفرت سے مجھے دیکھا ''کیسی برف کی سِل جیسی عورت ہو تم'' اسکا ہاتھ میرے گال پر جم گیا، اذیتوں کی صلیب پر لٹکا تن ذلتوں کے بوجھ سے نڈھال ہونے لگا، روح سسک اٹھی ''یہ سِل تمہارے جیسے ہی کسی کم ظرف نے صدیوں پہلے عورت کے نصیب میں لکھی تھی'' میرا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

''عورت کو اپنی پارسائی کی ڈھال سمجھنے والا بزدل۔''

''تم کم از کم میرا ساتھ تو دے سکتی ہو'' وہ بہت سلگا ہوا تھا۔

''اور کتنا ساتھ چاہیئے؟ میں اذیتوں کے تمام تر چر کے سہنے کے باوجود تمہارے ساتھ ہوں تمہارے بستر پر۔۔''

''اور تم؟ تمہاری ادھوری بھوک کا نوحہ میرے تن پر لگے گھاؤ بڑھا دیتا ہے''

''صرف عورت ہی کیوں اپنی پارسائی ثابت کرنے کے لئے گیلے ایندھن کی طرح عمر بھر سلگتی رہے'' میں رونا نہیں چاہتی تھی، لیکن کمبخت گرم سیال سارے بند توڑ کر بہہ نکلا۔۔

''یہ دو طرفہ اذیتیں آخر تک ساتھ چلتی ہیں بدنامیوں کی طرح، اس تاریک برِ اعظم میں ظلم کے اندھے دیوتا کی کشکول میں اور کتنا لہو ڈالا جائے گا، روشنی کب ہوگی؟'' میرے اندر شور بڑھنے لگا۔

''تم اس دنیا کی پہلی عورت نہیں ہو، ادھوری بھوک اسے تڑپا رہی تھی وہ بھی عام مردوں کی طرح تھا، ہر حال میں اپنی عظمت کا خواہاں، اپنی لذتوں کے حصول میں ہانپتا ہوا، رال ٹپکاتا، دریدہ بدنوں پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑتا ہوا، برتری کے جھوٹے زعم میں مبتلا'' مجھے اُبکائیاں آنے لگیں۔

''جسم سے پرے بھی ایک چیز ہوتی ہے، جسم پامال کیا جا سکتا ہے، لیکن روح آزاد رہتی ہے، تم اسے کبھی بھی نہیں چھو سکو گے، کبھی بھی نہیں، مکمل فتح تمہیں کبھی نصیب نہیں ہوگی، میں بہت ہسٹیرک ہو رہی تھی، ہماری سری حسیّں نوچنے والے، کانچ کے ٹکڑے، گندے بلیڈ، ٹین کے تیز دھار ڈھکنے، پتھر، اور کند چاقو انھیں کے ہاتھوں میں تو تھے''

عبرون اپنی ادھوری بھوک کے پہلو میں بے سدھ سو رہا تھا، میری پلکیں پھر سے بھیگنے لگیں۔

بجھے چراغ کے دھویں میں چند ہیولے ابھرے، پل بھر میں اندھیرا کمرہ اور اس میں بچھی بدبودار گھاس غائب ہوگئے، دھند میں کہیں دور منڈھی ہوئی پلکوں پر چمکتے آنسو صاف دکھائی دینے لگے، زرد ہتھلیوں والے آبنوسی ہاتھوں میں تھامے آنچل پر دستک ہوئی۔

''کیا ہوا؟'' آنکھوں میں استفسار تھا۔

گرم اُبلتے آنسوؤں میں تیزی آ گئی دستک پھر ہوئی، اب کی بار اُس شوخ شال پر تھی جس میں دیدی کو لپیٹا گیا تھا''

''دیدی'' سیاہ آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری۔

''رواجوں کی مٹی اوڑھ کر سو گئی تیری دیدی'' آنسو بھل بھل بہنے لگے۔

میں بہت چھوٹی تھی لیکن پھر بھی دیدی کی ننگی ٹانگوں پر بندھی کپڑے کی رسی، اس کا بخار میں تپتا جسم اور لحظہ لحظہ ڈوبتی چیخیں جیسے میرے اندر کنڈلی مار کر بیٹھ گئی تھیں، ماں کا دکھ مجھے کاٹ رہا تھا، آج میری اپنی آنکھوں میں وہی خوف اور بے بسی تھی۔

''مت کرو'' وہ بابا کے آگے گڑگڑا رہی تھی۔

''مجھے اسے نہیں کھونا'' ماں نے مجھے دامن میں سمیٹ لیا۔

''میں سر جھکا کر نہیں جی سکتا، تم جانتی ہو اسے کوئی بیاہے گا نہیں'' بابا کے لہجے میں غصہ تھا۔

''تو پھر مر جاؤ'' ماں چلا اُٹھی۔

''بیٹیوں کا کاٹ کر جینا ہے تو مر جاؤ'' ماں کے تیور بہت خراب تھے۔

''چلاؤ مت'' بابا کی آواز ماں سے بھی اونچی تھی انھوں نے زبردستی مجھ ماں کے پہلو سے نوچ لیا۔

''ہدان آ رہی ہے اپنے ساتھ ایک ماہر کو لے کر، مجھے یقین ہے اب کی بار کچھ نہیں ہو گا'' بابا مجھے لے کر باہر نکل گیا۔

ماں بُری طرح رو رہی تھی، شاید اس کے بس میں صرف آنسو ہی تھے، مجھے بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی، لیکن بابا کے دیئے ہوئے نئے کپڑے پا کر میں بہت خوش تھی۔

جب ہدان نے کانچ کا نیا گلاس توڑ کر دو ٹکڑے اس بے انتہا تن و توش والی عورت کی طرف بڑھائے تو ماں لکڑی لے کر اس پر پل پڑی۔

''عجیب عورت ہو ایک گلاس کے لئے اتنا شور، تمہارے بھلے کے لئے ہی توڑا ہے'' موٹے تن و توش میں سب کچھ تھا احساسات نہ تھے وہ بھی تو عورت ہی تھی، کٹی پھٹی اور ادھوری، وہ اپنے اندر کی گھٹن بڑی مشاقی سے ننھے ننھے جسموں میں اتارا کرتی۔

''مردود خبر دار جو میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگایا تو'' ماں جانے کہاں سے بڑی سی چھری نکال لائی، لیکن پھر ماں اور میں، ہم دونوں چلّاتے رہ گئے، کانچ کے تیز دھار ٹکڑے میرے جسم کے انتہائی نازک حصے کو بیدردی سے کاٹتے ہوئے گذر گئے، سوئی کی ہر چبھن پر میرا درد اور غصہ بڑھتا گیا اور پوری زندگی پر پھیل گیا۔

''یہاں کا مرد انتہائی شاطر ہے، صدیوں سے عورت کو اپنے زیرِ نگین رکھنے کے لئے کبھی مذہب اور کبھی رسم و رواج کا سہارا لیتا آیا ہے'' میرے کانوں میں لیڈی کیتھرین کی آواز گونجی۔

گھاس کی بُو میرے حواس پر طاری تھی، اندھیرے میں سارے درد حلقہ بنائے میرے اردگرد بیٹھے تھے، مجھے کچوکے لگاتے ہوئے، نوچتے ہوئے۔

وہ محض چودہ سال کی تھی، میری ماں کی اکلوتی بہن کی اکلوتی بیٹی، ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی، بات بے بات اس کے سفید دانت کھل اٹھتے، اس کی سیاہ آنکھوں میں ہلکورے لیتے سندر سپنوں کے اچھوتے رنگ، وہ اپنی شادی سے بہت خوش تھی، ہر لڑکی کی طرح، شوخ گلابی کپڑوں میں اس کا آبنوسی چہرہ دمک رہا تھا، لیکن منڈھی ہوئی پلکوں سے پرے جھانکتا خوف میں صاف دیکھ سکتی تھی۔

''دیدی ڈر لگ رہا ہے'' اس کی انگلیوں کی پوریں بہت سرد تھیں۔

''کچھ نہیں ہوگا'' میں جانتی تھی یہ جھوٹی تسلی ہے، شادی کی رات اور اس کے بعد کے عذاب کو تصور ہی کپکپا دینے والا تھا، ہماری خوشیاں بھی درد اور خوف کی سیج پر پلتی ہیں۔

پھر زیادہ کچھ نہیں ہوا۔ اس کا لہو میں ڈوبا ہوا دریدہ بدن اس بات کا گواہ تھا کہ مرد کے سینے میں دل کی جگہ بھوک رکھی ہے، کبھی نہ سیر ہونے والی بھوک، مسلی ہوئی معصوم کلی کو مٹی اوڑتے

دیکھ کر میرا دل درد سے بھر گیا۔

''ہماری زندگیوں سے راحت کے سارے پل مٹا کر درد کے عذاب رقم کرنے والو، ہمیں زمہریری فطرت کے ضِنے دینے والو اگر عورت صدیوں تک درد کے بھاری گھٹڑ اپنے کندھوں پر اٹھائے اپنا سفر جاری نہ رکھتی تو آج تمہاری بقا خطرے میں پڑ جاتی،، میری آواز گونگی بہری دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ رہی تھی۔

''یہ تم نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھ لیں؟'' عبرون مجھ پر برس پڑا، آج کے بعد تم اس گوری سے ملنے نہیں جاؤ گی، دماغ خراب ہو گیا ہے۔۔

میں نے اپنی ماں کو اس گوری سے ملتے دیکھا تھا، دن کے اجالے کی سی رنگت، آنکھوں میں پورا سمندر بسائے، ہمارے درد پر کڑھتی ہوئی، سوئٹزرلینڈ جیسی جنتِ ارضی چھوڑ کر ہمارے ساتھ موسموں کے قہر سہتی ہوئی، میں نے اسی سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا، اُس کے پاس جتنی کتابیں تھیں میں نے سب کی سب چاٹ ڈالیں، اور تو کچھ نہ ہوا بس میرے اندر اتری کڑواہٹ مزید گہری ہوتی گئی۔

''تمہاری دیدی کو قبر میں اتارتے ہوئے میں نے قسم کھائی تھی، میں لڑوں گی، اس ظلم کے خلاف لڑوں گی'' ماں کے آبنوسی چہرے پر درد رقم تھا۔

''لیکن میں ہار گئی میں تمہیں نہیں بچا سکی،، اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا، نچلے دھڑ میں لگی آگ کی تپش کم ہونے لگی، لیکن ماں کے آنسو کہیں اندر چھید کر رہے تھے۔

''تمہاری قسم میں پوری کرونگی'' دس سالہ بدن میں روح جانے کہاں سے طاقت کشید کر رہی تھی، میں صورتحال کو اچھی طرح تو نہیں سمجھ پا رہی تھی، لیکن مجھے اپنا اور ماں کا درد کاٹ رہا تھا، ماں نے مجھے دیکھا میرا جسم بخار میں پھنک رہا تھا،، لیکن روح میں اتری کڑواہٹ مجھے آسرا دیئے ہوئے تھی۔

''ضرور کرنا، لیڈی کیتھرین کے پاس جانا''

مجھے اُجڑتے گاؤں اور بستے قبرستانوں سے خوف آتا تھا، اس لئے میں بارہا لیڈی کیتھرین سے ملی۔

''اندر آگ بھری ہو تو سمجھو تم زندہ ہو، سینہ جلنا بند ہو جائے تو زندگی مر جاتی ہے، بہاؤ

آگ کو گیان اور پھر فیضان کی منزل تک لے آتا ہے، اس آگ کو الفاظ میں ڈھالو باقی میں دیکھ لوں گی''

لیڈی کیتھرین کو نبضوں پر ہاتھ رکھنا آتا تھا، میں نے اپنی آگ کو الفاظ کے پیراہن کو چاٹنا شروع کر دیا، لیڈی کیتھرین نے وہ الفاظ پورے صومالیہ میں پھیلا دیئے، میری روح اور بدن پر چر کے بڑھنے لگے اور ساتھ ہی ساتھ میرا حوصلہ بھی، دیئے میں صدیوں سے لہو بھرا جا رہا تھا لیکن آگ باغی تھی سو میں نے خود کو آگ لگا لی۔

''تین ملین لڑکیاں ہر سال اس آگ میں جھونک دی جاتی ہیں،، لیڈی کیتھرین کو صومالین نہیں آتی تھی، لیکن اسے پتہ ہوتا تھا اسے کیا کہنا ہے اور یہی بات مجھے اس کی طرف کھینچتی تھی، وہ کوئی نہیں تھی، اپنے گھر سے ہزاروں میل دور اس جھلسے ہوئے تاریک برِّ اعظم میں ہماری زندگیوں سے اندھیرے چُننے کی کوشش میں مصروف۔

''کتنی ہیں جو خاموشی سے موت کا اندھیرا اوڑھ لیتی ہیں،، لیڈی کیتھرین کی آواز لرز رہی تھی۔

''جو بچ جاتی ہیں ایک عمر کا جہنم اُن کا مقدر ہوتا ہے''

مقدر ریت پر لکھی ہوئی تحریروں کی مانند ہوتا ہے، ایک بار تحریر کر دیا جائے تو تیز ہوا پل بھر میں ذروں کو بکھیر ڈالتی ہے، اس ان دیکھی تحریر کو بدلنا ناممکن ہوتا ہے، مگر میں نے اسے بدلنے کی ٹھان لی تھی، خواہ وہ ایک ہی نصیب کیوں نہ ہو۔

لیڈی کیتھرین مہینے میں ایک بار آتی تھی، اب کی بار آئی تو صرف زِینا کے شوہر سے ملنے، زِینا کی کوکھ اس کے پہلے بچے کی قبر بنا دی گئی، محض سولہ سال کی عمر میں، اس کے شوہر نے ظلم کی سوزن سے جسم میں اُترے دھاگے کاٹنے کی اجازت نہ دی، وہ تین دن تڑپتی رہی، لیکن بند دروازے کے پیچھے سے ابھرنے والی چیخیں سننے کے لئے کسی کے پاس وقت نہ تھا، یا پھر ایسی چیخیں سنتے سنتے کان پک گئے تھے، وہ اپنے بچے کو لئے قبر میں اُتر گئی رواج اور مرد ایک بار پھر جیت گیا، زندگی ایک بار پھر ہار گئی، میرا دل چاہا زِینا کے شوہر کو زندہ جلا ڈالوں، ماں نے بہت منتیں کی تھیں اس کی۔

''وہ مرجائے گی دھاگے پھر جڑ سکتے ہیں زندگی نہیں،، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

''وہ بہت کم عمر ہے میں نہیں چاہتا وہ کسی بے رہ روی کا شکار ہو جائے،، جب دھاگے خود بخود ٹوٹے تو اس کی زندگی کی ڈور بھی ٹوٹتی چلی گئی،

دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی تھی،

''آیان؟''صومیمہ کی سرگوشی جیسی آواز ابھری ''تم ٹھیک ہو؟،، میں کچھ کھانے کو لائی ہوں،، وہ میری چھوٹی بہن تھی۔

''دانیا کہاں ہے؟،، میری آواز میں نقاہت تھی، میں بمشکل کھڑکی تک پہنچی، صومیمہ کھانا اور پانی اندر رکھ چکی تھی۔

''فکر نہ کرو وہ ٹھیک ہے، عبرون نجیر کے ساتھ موگا دیشو گیا ہوا ہے، کل آئے گا''

''اچانک موگا دیشو؟ کیوں؟''

''میں صرف یہی کر سکتی تھی دیدی''میمی آہستہ سے بولی۔

میری ساری حسّیں بیدار ہو گئیں، لیڈی کیتھرین آج چناری میں ہو گی، یہ گاؤں ہمارے گاؤں سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔

''پتھریلی زمین میں اُگے زہریلے پودوں کے ساتھ زور زبردستی نہیں کی جا سکتی، جڑیں اندر رہ جاتی ہیں، پھر سے پنپنے لگتی ہیں''لیڈی کیتھرین کا وہی پھوار جیسا نرم لہجہ سماعتوں کو سہلا رہا تھا۔

''صدیوں سے خون میں بہتے رواجوں کو یک دم اکھاڑ پھینکنا آسان نہیں ہوتا، اس کے لئے حوصلہ اور صبر ضروری ہے''

''پریشان مت ہونا دانیا اچھے ہاتھوں میں ہے''لیڈی کیتھرین کا نرم سفید ہاتھ روشنی کے استعارے کی طرح میرے ہاتھ پر دھرا تھا، ماں کے بعد میں، میمی، فظیرہ، میر سعد، نادفان اور پھر دانیا لیڈی کیتھرین کے ساتھ کھڑے ہوتے چلے گئے، چراغ جلنا شروع ہو چکے تھے، میرے اندر سلگتے انگارے الفاظ میں ڈھلتے رہے، روشنی بڑھنے لگی، عبرون مجھے دھمکاتے دھمکاتے تھک گیا، پھر ایک وقت آیا جب میں اُس سے بہت آگے نکل آئی، برف کی عورت نے آتش فشاں بجھا ڈالا تھا۔

موگا دیشو میں شام ڈھل رہی تھی، میں نے پلٹ کر دیکھا میمی اور ژانیا آفس سے نکل رہی تھیں، اُن کے آبنوسی چہروں پر طمانیت تھی، یہاں تک آنے کے لئے مجھے آگ کا دریا عبور کرنا پڑا تھا، پہاڑوں سے ٹکرانا کب آسان ہوتا ہے۔

''لیکن کسی نہ کسی کو تو تیشہ اٹھانا ہی ہوتا ہے''

☆☆☆☆

ایک رات کی خاطر

شاہد جمیل احمد (گوجرانوالہ، پاکستان)

میرے کندھوں سے کب اترے گا صابی، تو بولتا کیوں نہیں؟ تجھے پتہ ہے اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرے پران جواب دے گئے ہیں۔ تجھے لاد کر دو قدم چلتا ہوں تو میری سانس پھول جاتی ہے، مجھے ناف پڑنے لگتی ہے، ناف ٹھیک ہوتی ہے تو چک پڑ جاتی ہے۔ اے زلیخا کے معبود تجھے مجھ پر ترس کیوں نہیں آتا؟ تو نے مجھے زندہ درگور کیوں کر دیا ہے؟ درختوں پر بھی پھل پھول آئیں تو ان کی ٹہنیاں سرسبز ہو جاتی ہیں، میں کتنا بدنصیب ہوں کہ مجھے بھاگ بھی لگے تو گھن کی طرح۔ تیری ماں خوش قسمت تھی کہ اتنی جلدی اسے زندگی سے چھٹکارا مل گیا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی ہے، مرنے سے کہیں بدتر، کہیں مشکل۔

جی میں آتا ہے گھٹنوں تک تیری ٹانگیں کاٹ کر تجھے چارپائی پر ڈال دوں۔ کم بخت، نصیب مارے نہ تو گھر سے باہر نکلے اور نہ مجھے لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں سننا پڑیں۔ آج تو چودھریوں کے پردہنے پر کیوں بھونکا تھا۔ موئے تو نے بھونکنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، دانتوں سے اس کی ٹانگ بھی بھنبھوڑ ڈالی۔ پھر وہ تجھے مارتے نہیں تو اور کیا کرتے! پتہ ہے تجھے جتنی بھی سونٹیاں لگیں سب کی سب میرے دل پر برسیں۔ میں کتنا بے بس ہوں کہ انہیں تمہیں اور مارنے کا کہتا رہا۔ مجھے معاف کر دے صابی! میں ان کے قہر سے ڈر گیا تھا اور جس بات سے میں ڈر رہا تھا وہی ہو کر رہی۔ ظالموں نے میری ہڈی پسلی بھی ایک کر دی۔ میں تو بس یہی کہتا ہوں جنہوں نے تمہیں مارا اللہ ان کو تمہارے جیسی اولاد دے تو میرے سینے میں ٹھنڈ پڑے۔ آج تو مجھے تم پہ بہت

غصہ آیا۔ جی میں آیا کلہاڑی سے تمہاری بانہیں اور پنڈلیاں کاٹ دوں جن سے تو چوپائیوں کی طرح چلتا ہوا ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتا ہے۔ اگر تجھے قید کر کے رکھوں تو رو رو کر آسمان سر پہ اٹھا لیتا ہے، کتنا ظالم ہے تو! میں تیرا کیا علاج کروں۔ غصے میں کیا سے کیا سوچ جاتا ہوں مگر پھر تمہاری ماں کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ تیرے ہونے سے پہلے ہم دونوں نے کتنے خواب دیکھے تھے۔ سوچا تھا تو آئے گا تو گھر میں بہار آ جائے گی مگر تو ایسا آیا کہ اپنی ماں ہی کو کھا گیا۔

تمہاری لکڑی ایسی ٹانگوں کی مالش کرتے کرتے میری بانہیں سوکھ گئی ہیں، جی میں آتا ہے ٹوکے سے تجھے اتنا باریک کتر دوں کہ تیرے ذرے خاک میں مل کر خاک ہو جائیں مگر پھر اپنی بے بسی آڑے آتی ہے۔ سوچتا ہوں غصے کا ابال اترے گا تو تجھے زمین سے کیسے اکٹھا کروں گا، تجھ سے کیسے باتیں کروں گا۔ تو میرے جسم کا حصہ ہے مجھے احساس ہے کہ میں کوئی درخت نہیں جو ایک شاخ کاٹ دی تو دوسری نکل آئے گی، دوسری نکل بھی آئے تو تمہاری جگہ نہیں لے سکتی، تو میری پلوٹھی شاخ ہے ناں۔ مگر تیرے ساتھ تو یہ ساری باتیں کرنا ہی فضول ہیں، نہ تو دیکھتا ہے نہ سنتا ہے اور نہ سمجھتا ہے، تو تو پتھر ہے پتھر! نہ دکھ تجھ پہ اثر کرتا ہے اور نہ سکھ تجھے فرحت دیتا ہے۔ وہ خود کلامی کی سی کیفیت میں بولتا رہا مگر صابی اپنے دھیان اس کے کان کو چاٹے جا رہا تھا اور اس کی رالیں اس کے باپ کی قمیض میں جذب ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک دو بار اس نے تنگ آ کر ہاتھ کی مدد سے صابی کے منہ کو کان سے دور کیا مگر صابی کے چیخنے چلانے پر دوبارہ اس کے منہ کو پکڑ کر اپنے کان پر لگا دیا۔ وہ رون ہکا ہو گیا تھا مگر پتھر کا صنم اپنے دھیان مکھیوں کی طرح اس کے کان کا گڑ چاٹے جا رہا تھا۔

ڈیرے پر پہنچ کر اس نے صابی کو ایک طرف رکھا اور بیلوں کی کھرلی میں گتاوا کرنے کے لیے آستینیں چڑھانے لگا۔ صابی کی آواز پر وہ ایک بار پھر چونکا۔ صابی نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا رکھا تھا اور کہہ رہا تھا، بابا آں! چھنا دے۔ اسے پھر سے غصہ آ گیا۔

بولا آنہ کہاں ہے کم بخت میرے پاس اور تمہارے لئے اتنے آنے کہاں سے لاؤں میں، تمہیں تو سارا دن یہی کام ہے۔ صابی چیختا رہا اور وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اپنے کام کرتا رہا۔ بھینس کو چارا ڈالنے کے بعد وہ حقہ لے کر ایک طرف بیٹھ گیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ بھینس چارا کھا لے تو وہ اس کا دودھ دھوئے اور سورج غروب ہونے سے پہلے واپس گاؤں پہنچ جائے۔

واپسی پر پھر اس نے صابی کو کندھوں پر لادا اور بائیں ہاتھ میں دودھ کی بالٹی لے کر گاؤں کی طرف چل پڑا۔ صابی کو جیسے بھولا ہوا سبق یاد آ گیا۔ اس نے پھر چپڑ چپڑ کان کو چوسنا شروع کر دیا۔ ایک دو بار تھوک کی وجہ سے موہن کو اپنا کان بند ہوتا محسوس ہوا تو اس نے چھوٹی انگلی کی مدد سے اسے صاف کیا اور دودھ کی بالٹی کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بدلتا گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ جب وہ چوراہے میں پہنچا تو اسے دور سے اماں جنتے نظر آئی جو دوسرے گاؤں کی طرف سے آنے والی سڑک پر چلی آ رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ اسی کے کام سے دوسرے گاؤں گئی ہو گی۔ اس نے کئی بار جنتے سے کہا تھا کہ اسے دوسری شادی نہیں کرنی مگر وہ ایک نہ مانی اور یہی اصرار کرتی رہی کہ اسے دوسری شادی ضرور کرنی چاہیے۔ وہ کہتی تھی ضروری تو نہیں کہ دوسری بیوی سے بھی اس کی اولاد صابی جیسی ہو اور پھر تمہارے گھر میں روٹی پکانے والا بھی تو کوئی نہیں۔ اگرچہ اس کی قسمت کے حساب سے اس کی زندگی میں کسی خوشی کی آمد خارج از امکان تھی مگر چار و ناچار اس نے شادی کے لیے ہاں کر دی۔ وہ جنتے کی طرف منہ کر کے ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے قریب آ گئی اور پسینہ پونچھتے ہوئے بولی، لڑکی والوں نے ہاں کر دی۔ پہلے تو وہ صابی کی وجہ سے کچھ گھبرائے مگر جب میں نے بتایا کہ تمہاری دو بیگھے ذاتی زمین ہے تو وہ راضی ہو گئے۔

صابی کو ڈھوتے ڈھوتے اس کی زندگی کے بارہ سالوں کی طرح بارہ دن بھی بیت گئے اور اس کی شادی ہو گئی۔ گھر میں کوئی خوشی کا موقع ہوتا تو شاید ضرور ہاتھ آتا البتہ دکھ کی بات تھی سو وہ ہو کر رہی۔ پہلے تو صابی کو صرف گاؤں کے لوگ پیٹتے تھے، اب اس کے گھر میں اس کی جان کی ایک اور دشمن آ گئی تھی۔ شادی کے تیسرے ہی دن صابی کی دوسری ماں نے اپنے میکے کے سوٹ پر تھوک لگانے کی پاداش میں مرچوں والا سوٹا اس کے منہ پر دے مارا جس سے صابی کا اوپر والا ہونٹ لہولہان ہو گیا۔

موہن نے بیوی کو بہت سمجھایا کہ یہ تو پاگل ہے، نادان ہے مگر اس کے تیور مزید بگڑ گئے اور وہ غصے سے چیخنے لگی۔ نہ دن کو چین نہ رات کا آرام، اس مصیبت نے تو میری زندگی عذاب میں ڈال دی۔ اسے کہیں دفعان کیوں نہیں کرتے، اس سے تو اچھا ہے اسے نہر میں پھینک دو۔ شریفاں کے منہ سے نہر کا لفظ سن کر اسے اپنے کندھوں سے بوجھ اترتا محسوس ہوا مگر اس کی آنکھوں کی چمک دھند میں ڈوبتی چلی گئی۔ شریفاں کی کرتوتوں اور اپنی بیزاری نے اسے مزید اندھا کر دیا۔

اس نے سوچا شریفاں کیا کہہ رہی تھی؟ صابی کو نہر میں پھینک دوں! مگر کیسے؟ یہ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ پھر اس نے سوچا اگر جسم کا حصہ ناسور بن جائے تو اسے کاٹ کر پھینک دینا چاہیے بالکل ویسے ہی جیسے درختوں کی خشک ٹہنیاں کاٹ دی جاتی ہیں۔

وہ سارا دن خاموش رہا۔ پچھلے پہر اس نے صابی کو اپنے کندھوں پہ لادا اور ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ آج رات اس کی پانی کی باری تھی۔ آج اس نے صابی سے کوئی بات نہیں کی، نہ اسے دکھ سنایا اور نہ اپنی ڈھارس بندھائی۔ آج شام اس نے بھینس کا دودھ بھی نہیں دھویا۔ عشاء کی اذان کے ساتھ اس نے صابی کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور سُوئے کے کنارے چلتا رہا، چپ، گم صم۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پیدل چلنے سے سردی کی رات میں بھی اس کے کپڑے پسینے سے بھیگ گئے۔ بڑی نہر کی پٹڑی پر پہنچ کر اس نے اپنی الجھی ہوئی سانسوں کو درست کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا اس بوجھ کو یہیں سے پھینک کر واپس بھاگ جائے مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ کم بخت کنارے کے پاس گر کر شور نہ مچا دے اس لئے وہ اسے اٹھائے ہوئے پل پر پہنچ گیا۔ پل کو آدھا پار کرنے کے بعد اس نے لوہے کے جنگلے سے نیچے جھانکا اور اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے کندھوں کے بوجھ کو نہر میں دھکا دے دیا۔

چھپ کی ایک زور دار آواز نے کچھ لمحوں کے لئے اس کے اعصاب شل کر دیے مگر جیسے ہی اسے ذرا ہوش آیا اس نے دوڑ لگا دی۔ بڑی نہر سے کافی دور آ کر اس کے کان میں خارش ہوئی تو اس نے نادانستہ صابی کے منہ کو پکڑ کر اپنے کان سے لگانے کی کوشش کی مگر صابی تو نہیں تھا! اس کا دل دھک سے بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا اس کے کندھوں کا بوجھ کم ہو گیا! مگر یہ کیا؟ کندھوں کا سارا بوجھ دماغ میں منتقل ہو گیا تھا اور دماغ کندھوں سے کہیں نازک تھا۔

گھر پہنچتے پہنچتے اسے تیز بخار ہو گیا اور وہ اپنی چارپائی پر اوندھے منہ گر پڑا۔ بہت سے پچھتاوؤں نے اسے گھیر لیا جن میں ایک پچھتاوا یہ بھی تھا کہ آج کی رات بھی شریفاں کی رات نہ ہو سکی۔

☆☆☆☆

گٹر سوسائٹی

ڈاکٹر کوثر جمال (سڈنی، آسٹریلیا)

اگلے روز، شاہ بانو یونیورسٹی نہیں گئی۔ شام کو اس کی روم میٹ کو اس کے رائٹنگ ٹیبل پر ایک بند لفافہ ملا جس پر اس کی دوست نگینہ بشیر کا نام لکھا تھا۔ نگینہ بشیر کے نام اس مختصر خط میں شاہ بانو نے فقط اتنا ہی لکھا تھا: پڑھائی سے طبیعت اچاٹ ہو گئی ہے۔ سوچا شادی تو ایک نہ ایک روز ہونی ہی ہے، تو اب کیوں نہیں۔ اسی لیے گھر واپس جا رہی ہوں۔ جلد تمھیں اور باقی سہیلیوں کو شادی کا دعوت نامہ بھیجوں گی۔ آنا ضرور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سر سلیم اپنے آفس کی میز پر کہنیاں ٹکائے کسی سوچ میں گم بیٹھے تھے۔ یوں بظاہر ان کی آنکھیں آفس کے ادھ کھلے دروازے میں سے کوریڈور سے گزرتی زندگی کو دیکھے بنا دیکھ رہی تھیں۔ ایم اے فرسٹ ائر اور سیکنڈ ائر کے لڑکے لڑکیاں اپنے شباب کی خراماں چال، بے فکر ہنسی اور پراعتماد باتوں سے کوریڈور کی فضا میں زندگی کے رنگ بکھیرتے آ جا رہے تھے۔ سلیم صاحب کے کان البتہ نہ کچھ سن رہے تھے اور نہ آنکھیں کچھ دیکھ رہی تھیں۔ ان کا دھیان ایک گھنٹہ بعد ہونے والی اس کلاس کی طرف تھا جس کے نوٹس وہ گھر بھول آئے تھے اور اب کلاس میں پڑھانے کے کچھ ایسے طریقوں پر غور کر رہے تھے جنھیں استادوں کی استادی کہا جا سکتا ہے۔ استاد اگر بہت آرام کے موڈ میں ہو تو طلبا کو غیر متوقع ٹیسٹ دے دیا کرتے ہیں۔ سر سلیم کو البتہ ایسی کسی صورتحال میں طلبا سے مکالمہ زیادہ اچھا لگتا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں گفتگو کے لیے کسی موضوع کا انتخاب کرنے کے مرحلے سے گزر رہی رہے تھے جب کسی نسوانی ہنسی نے انھیں آفس سے نکال کر کوریڈور میں لا

پھینکا۔ لا پھینکا اس لیے کہ انھوں نے مندر کی گھنٹیوں جیسی اس مترنم ہنسی کو سنا اور پھر ہنسنے والی کو دیکھنے کے لیے آفس سے نکل کر کوریڈور میں چلے آئے۔ تین چار لڑکیوں کا ایک غول سا تھا جو کسی بات پر محظوظ ہوتا، قہقہے لگاتا، ہنسی کے ساتھ ساتھ ملی جلی خوشبوئیں فضا میں تحلیل کرتا اب کچھ دور نکل گیا تھا۔ سر سلیم کچھ اندازہ نہ کر سکے کہ ہنسی کی قیامت ڈھانے والی کون تھی۔

سر سلیم شعبہ نفسیات کے استاد تھے اور سماجی نفسیات ان کا مضمون تھا۔ نیا سمسٹر شروع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ان کی اپنی کلاس کے طلبا سے ابھی سرسری سی جان پہچان ہی ہو پائی تھی۔ وہ کلاس میں پہنچے تو کوئی تیس کے قریب لڑکے لڑکیوں کو اپنا منتظر پایا۔ وسط فروری کے خوشگوار اور روشن دنوں کا اجالا کمرے میں موجود نوجوانوں کے چہروں کو مزید تابناک بنا رہا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے تو پچھلے ہفتے کے لیکچر کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔ کچھ طلبا جو باقاعدگی سے نوٹس بناتے اور کلاس میں حاضر دماغ رہتے ہیں، انھیں تو پچھلے لیکچر کی کافی باتیں یاد تھیں۔ لیکن اکثریت ان نوجوانوں کی تھی جن کے جسم تو کلاس روم میں ہوتے ہیں لیکن دھیان دور کہیں دوسری دنیاؤں میں۔ جب پچھلے لیکچر سے متعلق زیادہ باتیں برآمد نہ ہوسکیں تو سر سلیم نے بلیک بورڈ پر دو الفاظ لکھے : گٹر سوسائٹی ۔۔۔۔ یہ آج کی گفتگو کا موضوع تھا۔ انھوں نے طلبا کو پانچ پانچ کے گروپس میں تقسیم کیا اور ہر گروپ کو اپنا ایک نمائندہ منتخب کرنے کو کہا۔ ٹاسک یہ تھا کہ پندرہ منٹ تک ہر گروپ آپس میں گفتگو کر کے اس موضوع کی مختلف جہتیں دریافت کرے۔ اس کے بعد ہر گروپ کا نمائندہ پانچ پانچ منٹ کی گفتگو میں اپنے گروپ کے خیالات پیش کرے گا۔ اگلے پیریڈ میں اسی موضوع پر زیادہ تفصیل سے کھل کر بحث ہوگی۔ طلبا کے گروپس بات جیت میں مصروف ہوئے تو سر سلیم نے اپنا بریف کیس میز پر رکھا۔ اس میں سے ایک نوٹ بک نکالی اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس پر کچھ لکھنے لگے۔ یہ نوٹ بک ان کے بریف کیس میں ہمیشہ رہتی تھی۔

سر سلیم کسی مغربی ملک میں تین سال گزار کر، ایم اے ریسرچ کی ڈگری، مقالہ اور ایک عدد دوسری بیوی لے کر دو سال پہلے ہی واپس وطن لوٹے تھے۔ دوسری بیوی ان کی یونیورسٹی فیلو تھی اور اب یہاں کسی سرکاری محکمے میں اچھے عہدے پر فائز تھی۔ کہنے والے کہتے تھے کہ پہلی شادی کروا کے گھر والوں نے سر سلیم کے ساتھ زیادتی کی تھی، لیکن خود انھوں نیدوسری شادی کر کے اپنی دونوں بیویوں پر، دو بچوں پر اور خود پر ظلم کیا تھا۔ اس ظلم کی نوعیت پر البتہ کہنے والوں کے مختلف خیالات

تھے۔۔۔۔ پہلی بیوی کو وہ طلاق نہیں دے سکتے تھے کیونکہ وٹہ سٹہ کا رشتہ تھا۔ اور دوسری شادی انھوں نے شائد اس سراب کا پیچھا کرتے ہوئے کی تھی جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ یا شائد؟۔۔۔ پہلی بیوی نے دو بچوں کی دولت سمیٹ کر دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی اور اب گاؤں میں اپنے بچوں کے ساتھ سسرال کی آبائی حویلی میں رہتی تھی۔ دوسری بیوی نے محبت پر اکتفا کرتے ہوئے پہلی بیوی کو طلاق دلوانے کی ضد نہیں کی تھی۔ سر سلیم سے ذرا قریبی تعلق رکھنے والے دوستوں کا خیال تھا کہ سلیم صاحب دو بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی کچھ غیر مطمئن اور ادھورے سے شوہر تھے۔

کلاس روم میں طلبا کے چھوٹے چھوٹے گروپ بڑی دلچسپی سے گٹر سوسائٹی کی معنوی وسعتیں دریافت کرنے میں مصروف تھے۔ سبھی ایک دوسرے کی طرف جھکے نیچی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ اسی دوران دھیمی آوازوں کی بھنبھناہٹ میں ایک گروپ کے لڑکے لڑکیاں کسی بات پر محظوظ ہو کر ہنسے۔ ان میں وہ مختصر ہنسی سب سے الگ تھی جو کسی کلی کی طرح چٹکی اور سر سلیم کو بامراد کر گئی۔ یہ وہی لڑکی تھی۔ اگر کلاس روم میں کرسیوں کی قطار در قطار ترتیب ہوتی تو وہ اس کا چہرہ اپنی میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے بھی دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اس وقت طلبا کرسیوں کی ترتیب بدل کر پانچ پانچ کرسیوں کے چھوٹے چھوٹے دائرے بنائے، اپنے اپنے مرکز کی طرف جھکے ہوئے سنجیدہ گفتگو میں مصروف تھے۔ سر سلیم نے ہنسنے والی کا چہرہ ایک طرف سے دیکھا۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگت کا بظاہر عام سا چہرہ تھا۔ سلیقے سے بنے ہوئے بال چٹیا میں گندھے تھے اور جس کا بالائی حصہ ہلکے سبز رنگ کے شیفون کے دوپٹے میں لپٹا تھا۔ سر سلیم اس چہرے کو دیکھ کر کچھ دیر خلاؤں میں گھورتے رہے، پھر انھوں نے اپنی نوٹ پیڈ کے ایک خالی صفحے پر اس چہرے کے سائیڈ پوز کا خاکہ اتارا، یوں جیسے اکثر بیکاری میں ہم میں سے بہت سے، اگر ہاتھ میں قلم ہو تو الٹی سیدھی لکیروں سے کھیل لیا کرتے ہیں۔

وہ مترنم ہنسی والی طالبہ، ایم اے نفسیات فرسٹ ائر کی شاہ بانو تھی۔ اس کی چال ڈھال اور لباس سے پتہ چلتا تھا وہ کسی قصباتی علاقے کے فیوڈل خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ کانوں میں سونے کے ذرا وزنی بندے، مہنگے ریشمی ملبوسات، اور چہرے پر مخصوص قصباتی علاقوں سے آئی لڑکیوں کی شرم و حیا۔ درمیانی ہیل کے سینڈل پہنے وہ ایک خاص انداز میں آنکھیں نیچی کیے چلا کرتی، اپنے گدرائے ہوئے جسم کے حسن کو ریشمی دوپٹے میں لپیٹے، ایک بڑی سی فائل سے چھپائے، ہمیشہ دو تین سہیلیوں کی معیت میں نظر آتی۔ بس ایک بات تھی جو اسے اپنے پس منظر

سے بلکہ کسی بھی پس منظر سے آزاد کرتی تھی، اور وہ تھی اس کی بے ساختہ مترنم ہنسی، کانوں میں رس گھولتی ہوئی، جانے کتنے سہانے احساسات کو اندر تک جگا دیتی۔ یہ ہنسی اس کے ڈھکے چھپے وجود کی وہ کھڑکی تھی جہاں سے دیکھنے والے اپنی اپنی بصارت کے مطابق اسے دیکھ سکتے تھے۔ شاہ بانو یونیورسٹی کے ہوسٹل میں رہتی تھی۔ تعلیم میں زیادہ نمایاں نہیں تھی۔ اس کی کچھ قریبی سہیلیوں کو معلوم تھا کہ اس کی منگنی بچپن ہی میں اسکے ایک کزن سے ہو چکی ہے۔ شاہ بانو اپنی زندگی کے اس انجام سے جسے شادی کہا جاتا ہے، کئی سالوں سے بھاگ رہی تھی۔ اسے اپنا کم تعلیم یافتہ کزن کسی طرح پسند نہیں تھا۔ شائد اعلیٰ تعلیم کا حصول بھی اس کا اس مقدر جیسی اٹل حقیقت سے فرار ہی تھا۔ لیکن ایم اے کر چکنے کے بعد تو۔۔۔۔ وہ یہ سوچ کر اپنی تنہائوں میں لرز جایا کرتی کہ ایک قیدی کی زندگی اس کی منتظر ہے۔

پندرہ منٹ کی ابتدائی گروپ ڈسکشن کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ ہر گروپ کے منتخب کردہ ترجمان اپنے اپنے گروپ کی نمائندگی کرتے ہوئے معاشرے کے مختلف گٹروں کے ڈھکن اٹھا رہے تھے۔ غربت، جہالت، کرپشن، سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، سماجی اونچ نیچ، چائلڈ لیبر، عورتوں کی حالتِ زار، قبیح سماجی رسوم ورواج، مہنگائی، بیروزگاری، جاگیرداری نظام، لنگڑی جمہوریت، بار بار کا مارشل لا، وردی پوش کالے انگریزوں کی انتظامی آبروریزیاں،۔۔۔۔ غرض معاشرے کے گٹر لاتعداد تھے۔۔۔۔ پھر سر سلیم خود میدان میں اترے اور ترقی یافتہ ممالک کے سماجی بہبود، عدل وانصاف اور قانون کی حکمرانی کے ماتحت چلنے والے معاشروں کی مثالیں دے کر اپنے خیالات تقابلی جائزے کی روشنی میں سمجھانے لگے۔ سر سلیم گفتگو کے بادشاہ تھے۔ بامعنی باتیں پر اثر انداز میں یوں کرتے کہ دلوں میں اتر جاتیں۔ اکثر باتوں باتوں میں معاشرے کی مکمل تبدیلی کو مکمل انقلاب سے مشروط کیا کرتے۔ آج بھی تمام بحث اسی ایک نوٹ پر منتج ہوتی نظر آ رہی تھی، یعنی معاشرے کی مکمل تبدیلی۔ وہ اپنی سوچ میں جدید تھے اور شائد اسی لیے نئی نسل یعنی اپنے طلبا میں خاصے مقبول تھے۔

پورا سمسٹر گزر گیا، سر سلیم نے شاہ بانو کو اب ہر پوز میں، ہر طرح کے ملبوسات میں دیکھ لیا تھا۔ وہ کہیں سے بھی کوئی خاص لڑکی نہیں تھی۔ لیکن مسئلہ تو اس ظالم ہنسی کا تھا جو سر سلیم کی بظاہر متوازن ہستی میں قیامت برپا کر چکی تھی۔ یہ ہنسی ان کے وجود میں ایک اجنبی سی سنسنی پیدا کر دیتی

تھی۔شاہ بانو کی ہنسی نے ان کے اندر بینام سی نا آسودگی کا احساس جگا دیا تھا۔ایک ایسی بھوک جیسی ں آ سودگی جو کھانا کھا چکنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔انھیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان کے اندرون میں اب بھی کچھ نہ کچھ کنوارا رہ گیا تھا، کچھ ان چھوا، جسے شاہ بانو کی ہنسی ہی نہیں اسکی بازگشت بھی گدگدانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔اس ہنسی میں شائد زندگی کا وہ احساس تھا جس کی سر سلیم کو ضرورت تھی۔نفسیات کی گتھیاں سلجھانے والے سر سلیم، شاہ بانو کی ہنسی کے پیچ وخم میں الجھتے جا رہے تھے۔

گرمیوں کی چھٹیاں پونے میں اب چند روز باقی تھے۔زیادہ تر امتحانات ہو چکے تھے۔ اسی لیے یونیورسٹی کے ماحول پر کسی قدر خاموشی اور گرمیوں کی اونگھ سی طاری تھی۔ شاہ بانو چونکہ ہوسٹل میں رہتی تھی تو یونیورسٹی بلا ناغہ جایا کرتی۔اگر کسی کلاس فیلو سے ملاقات نہ ہوتی تو لائبریری ہی کا چکر لگا لیتی۔اس روز بھی وہ لائبریری جانے کے لیے ہی یونیورسٹی گئی تھی۔پھر یہ سوچ کر اس نے ایک چکر ڈیپارٹمنٹ کا بھی لگایا کہ شائد کوئی کلاس فیلو آئی ہو۔ڈیپارٹمنٹ کے قدرے سنسان کوریڈور میں اس کی ہیل کی ٹک ٹک سے ایک خاص ردھم پیدا کرتی ہوئی اس کی مخصوص چال آفس میں بیٹھے سر سلیم کو اس کی آمد کی خبر دے گئی۔سر سلیم اب اس کی چال کی موسیقی کو بھی اس کی ہنسی کی طرح پہچانتے تھے۔۔۔۔وہ ابھی کوریڈور ہی میں تھی جب ڈیپارٹمنٹ کے چپڑاسی نے اسے پیچھے سے پکارا: میڈم جی، آپ کو سر سلیم اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔

مجھے؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔۔۔ کیوں؟ یہ اس کا دوسرا سوال تھا، کسی قدر احمقانہ۔

یہ تو مجھے نہیں پتہ میڈم، آپ خود ہی چل کر پوچھ لیں چپڑاسی نے مسکین سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

شاہ بانو آفس میں داخل ہوئی۔سر سلیم دروازے کی طرف رخ کیے اسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔

تشریف رکھیے، انھوں نے گم سم، پریشان سی شاہ بانو سے کہا

آپ نے مجھے بلایا؟ شاہ بانو نے پوچھا

جی میں نے ہی آپ کو بلایا، کیسی ہیں آپ؟ سر سلیم نے مسکرا کر کہا

ٹھیک ہوں سر شاہ بانو کے چہرے پر کوئی رنگ تیزی سے آ کے چلا گیا۔

امتحان کیسے ہوئے ہیں؟

یہ تو رزلٹ آنے پر ہی پتہ چلے گا سر شاہ بانو کی نگاہیں کوئی جائے پناہ ڈھونڈ رہی تھیں۔

اس نے جلدی سے پھر پوچھا: آپ نے مجھے کسی کام سے بلایا سر؟

ہاں سر سیم نے ایک طویل سانس لی، پھر کچھ توقف کے بعد کہنے لگے

آپ جلدی میں دکھائی دیتی ہیں۔ چلیے میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ یہ کہہ کر انھوں نے میز پر ایک طرف رکھے بریف کیس کو اپنے قریب کیا۔ اس میں سے کچھ کاغذات نکال کر شاہ بانو کی طرف پھیلا دیے۔ اس بار شاہ بانو سر سیم کی آنکھوں کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ اف کتنی آگ تھی ان میں۔ شاہ بانو نے جلدی سے کاغذوں پر نگاہ دوڑائی۔ ان پر کسی نسوانی وجود کے پنسل سے کھینچے خاکے تھے۔ ایک ہی چہرے کے مختلف روپ تھے، ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے، دلربا نگاہوں سے دل لبھاتے ہوئے۔ یکدم شاہ بانو کا تیزی سے دھڑکتا دل ایک دھڑکن بھول گیا۔ اس چہرے نے تو ویسے ہی بندے پہن رکھے تھے جو شاہ بانو اپنے کانوں سے کبھی جدا نہیں کرتی تھی، یہ بندے اس کی مرحومہ ماں کی نشانی تھے۔ پھر انھی خاکوں میں سے ایک اسے سر تا پا پسینے میں نہلا گیا، عورت کا بالائی دھڑ، عریاں، فائل کی اوٹ سے جھانکتا ہوا۔۔۔۔ اسی لمحے اسے سر سلیم کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی:

میں اس لڑکی کی تلاش میں ہوں۔ اگر یہ مل جائے تو میں اس کے ساتھ مل کر ان خاکوں میں رنگ بھرنا چاہتا ہوں

شاہ بانو یہ سن کر جیسے یکا یک ہوش میں آ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی، خاموش پُر احتجاج نگاہوں سے سر سلیم کو دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ شاہ بانو کی روم میٹ پرسکون نیند میں ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ کمرے کی چھت پر لگا بجلی کا پنکھا جانے کب سے گھوم رہا تھا۔ سب کچھ ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ پر تھا، ماسوا شاہ بانو کے۔ وہ اب تک جس زمین پر کھڑی تھی وہ اپنی جگہ سے کچھ سرک گئی تھی۔ اسے اپنا آپ اجنبی سا لگ رہا تھا۔ متضاد کیفیات کی ریل گاڑی اس کے حسی وجود کو کچلتی ہوئی گزر رہی تھی، بار بار۔ اپنی کسی بھی کیفیت کو گرفت میں لانا اسے ناممکن لگ رہا تھا۔ کبھی

اسے ایسا محسوس کر کے ایک جھرجھری سی آتی کہ کوئی اس کے کنوارے بدن کو بلا اجازت چھو گیا ہے۔کبھی اسے لگتا جیسے کسی نے اسے غسل لیتے سمے بے لباس دیکھ لیا ہے۔کبھی اسے محسوس ہوتا جیسے کسی چور نے نقب لگا کر اس کی خلوت گاہ میں گھسنے کی کوشش کی ہے۔وہ جس قدر اپنی ستر پوشی کے اعتماد کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی وہ اتنا ہی ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔۔۔ایسی ہی دم گھونٹ دینے والی کیفیت میں وہ بستر سے اٹھ کر باہر بالکونی میں چلی آئی۔پچھلی راتوں کا بیمار چاند رات کے اندھیرے کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔اس کے بالوں کی ایک لٹ اس کے گال سے مس ہوئی تو وہ خوف سے کپکپا گئی، جیسے کوئی آس پاس ہو۔اس نے خود کو شانت کرنے کے لیے گہرا سانس لیا۔کہیں قریب لگی رات کی رانی کی مہک میں آج کسی کھلے گٹر کی بو بھی شامل تھی۔آج پھر شائد سامنے کی سڑک والے گٹر کا ڈھکن چوری ہوا تھا۔

اگلے روز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

☆☆☆☆

واپسی

ارشد علی (اسلام آباد، پاکستان)

گاڑی گردوغبار کے بگولے بناتی، ہچکولے کھاتی تیز تیز دوڑے جا رہی تھی۔ تا حدّ نگاہ کپاس کی سوکھی چھڑیاں دُھند کی شال اوڑھے اکٹھی ہوئیں، ایک دوسرے سے سر جوڑے کھڑی تھیں۔ سورج کئی دن سے کھوئے رہنے کے بعد کچھ وقت پہلے بادلوں کی اوٹ سے نمودار ہُوا تھا اور اب افق کے مغربی کنارے اُس بچّے کی طرح جو اپنی مرضی سے گھر سے بھاگا ہو اور اب گلی کی نکڑ پر شرمندہ شرمندہ سا اِس انتظار میں کھڑا ہو کہ کوئی اُسے پھر سے گھر لے جائے، سَر نیہوڑائے اپنے ہی بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔۔

''اُف۔۔ آج تو بہت ٹھنڈ ہے۔۔'' کپاس کی چھڑیوں نے آپس میں سرگوشی کی اور شکوہ آمیز نگاہوں سے سورج کی جانب دیکھتے ہوئے، ایک دوسرے سے یوں الگ الگ ہو گئیں جیسے بس سٹاپ پر مختلف منزلوں کو روانہ ہونے والے مسافر اکٹھے مگر لاتعلّق کھڑے ہوتے ہیں۔ اُس کا وجود، نگاہ کے رستے بس کے شیشے سے نکلا اور کپاس کی چھڑیوں کو پھلانگتا ٹبّے تک جا پہنچا۔

''یہاں سے ہی مَیں نے سفر شروع کیا تھا اور اب۔۔۔'' اُس نے اُفق پر ڈوبتے سورج کو دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔

''نہیں۔۔۔ سفر تو نا معلوم کب شروع ہُوا تھا''

کہتے ہیں بڑے ابّا پہلے آسمانوں پر رہا کرتے تھے۔۔۔ اُس نے آسمان کی جانب نگاہ

کی، جہاں بادل آپس میں کھیلنے میں مگن تھے اور کھیل کھیل میں وہ کافی دُور نکل آئے تھے۔ اُن کی اِس حرکت پر سورج غصّے سے لال ہُوا جا رہا تھا، لیکن اُس کے پاؤں کسی اَن دیکھی دلدل میں پھنسے ہُوئے تھے اور وہ آدھے سے زیادہ اُس میں ڈوب چکا تھا۔

''اگر بڑے ابّا آسمانوں پر رہتے تھے تو پھر زمین پر کیسے آئے؟''

''امّاں کی وجہ سے۔۔۔۔اُس نے دائیں بائیں دیکھا۔

یہ آواز۔۔۔؟

خیر۔۔۔۔

ابّا بھی امّاں کی وجہ سے۔۔۔۔۔

امّاں بھی۔۔۔۔

مَیں بھی تو امّاں کی وجہ سے ہی۔۔۔۔۔

اُس دن بھی ابّا، امّاں میں کتنا جھگڑا ہوا تھا۔۔۔۔

امّاں کہتی: میری بھانجی۔۔۔۔اور ابّا کہتا: میری بھتیجی۔۔۔۔۔

اور نتیجہ وہی کہ جیت بھی امّاں کی اور غلطی بھی۔۔۔۔اور سزا۔۔۔۔ملی مجھے۔۔۔۔

آج اتنے برسوں بعد۔۔۔پتہ نہیں۔۔۔امّاں مجھے پہچانے گی بھی کہ نہیں۔۔۔اور پتہ نہیں، امّاں ۔۔۔؟؟

نہیں، نہیں۔۔۔۔چُپ۔۔۔۔'منحوس! یہ کیا اُلٹا سیدھا سوچ رہا ہے۔۔۔۔اللہ نہ کرے۔۔۔' کپاس کے کھیت میں مختلف جگہوں سے سردی اور سورج کو کوسنے کی آوازوں پر وہ سب کچھ چھوڑ اُن کی جانب متوجّہ ہو گیا اور پھر اُس نے سورج کی جانب دیکھا جس کے جسم میں فقط چند سانسیں باقی تھیں۔

'اِس جنم کی غلطیوں کا مداوا کرنے کو اب ٹیم کہاں بچا ہے؟!! جما لے! یہ جُرم تو کسی اگلے جنم میں ہی بخشواؤں گا۔' کمال دین نے جواب دیا تھا۔ جب جمالا اُسے ہمیشہ کی طرح واپس لوٹ جانے کو کہہ رہا تھا۔۔۔

'دیکھ، کما لیا! تجھے وِیّیں وَرھے ہو چکے، ماں باپ، بہن بھائی، بیوی کو چھوڑے اور ہاں ایک بیٹی بھی تو تھی نا تیری۔۔۔؟!! گے دن کی بھلا۔۔۔؟!! تُو نے بتایا تھا۔۔۔ایک دار جب۔۔۔۔جا، چلا جا۔۔۔۔اَب بھی چلا جا۔۔۔کیا معلوم، زندگی کے کتنے سورج اور دیکھنے ہیں۔۔۔۔اور کیا معلوم، کب یہ سورج ڈھل جائے۔۔۔!!'

'ناں جمالے! ہر کام کا ٹَیم ہوتا ہے۔۔۔اور غیر ٹَیم تو نماز بھی نہیں ہوتی۔۔۔۔اور یہ ٹَیم۔۔۔اِس میں تو رَب کو سجدہ بھی نہیں، مَیں کیسے چلا جاؤں۔۔۔نہ بھئی۔۔۔ناں۔۔۔ یہ میر سے نہیں ہونے والا۔۔' اُس نے غروب ہوتے سورج کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔۔اور اِس گھڑی، سورج کی طرف دیکھتے ہوئے اُسے احساس ہوا کہ سورج تو ڈوب چکا اور یہ رہی سہی روشنی جتنی ہی زندگی بچی ہے، اور اس روشنی کے ساتھ ہی سفر تمام ہونے کو ہے۔

''بیس سال۔۔۔بیس سال تک مجھے کبھی خیال ہی نہ آیا پلٹنے کا۔۔۔۔اور آج۔۔''
بیس سال بعد وہ مسلسل ایک سوچ سے دوسری اور پھر تیسری۔۔۔۔اور پھر سوچوں کے گھنے جنگل میں بھٹکنے لگا تھا۔ یوں لگتا جیسے ذہن کے غار پر رکھا پتھر سوچ کی پے در پے چوٹوں کے آگے ہار مان گیا ہو۔

'پردے بند کر دیو جی۔۔۔پردے بند کر یو۔' کنڈکٹر کی آواز گونجی۔

اُس نے دُکھ میں بھیگی ہنسی اُس کی جانب نچھاور کی، جس نے ہٹتے ہوئے پتھر کو پھر سے اُس کی جگہ ٹِکا دیا تھا، اور پردہ بند کر کے سیٹ کی پُشت سے سَر لگا لیا۔ بس کے گھومتے پہیے اُسے ہر لمحہ کسی اندھیری وادی میں دھکیل رہے تھے جس کی بدولت وہ بہت دھیرے دھیرے اور سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہی تھی، مگر اِس ساری احتیاط کے باوجود، اس سفر میں اُس کے ہر قدم کے ساتھ وادی کے اندھیرے میں اضافہ ہی ہوا جا رہا تھا۔

اچانک وہ ہڑ بڑا کر اُٹھا اور کان لگا کر کچھ سُننے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے لگا جیسے کوئی مدد کے لیے پُکار رہا ہے۔ کوئی تہہ وجود، ڈرا، سہما، تاریکی کے خوف میں شدّت سے مبتلا۔۔۔اُس نے پردہ ہٹایا اور کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے زمین کے بطن سے کوئی کونپل پھوٹی ہو، جسے بیجنے والا کسان بھی فراموش کر چکا تھا۔ لیکن زمین کی زرخیزی کو بیج کا ضائع کرنا گوارا نہ ہوا اور اُس نے

مقررہ وقت پر اُسے سینچ دیا۔یقیناً۔۔۔یہ صدا کسی ایسی ہی کونپل کی تھی جو لا وارث تو نہ تھی لیکن اِس وقت اُس کا کوئی پُرسانِ حال بھی نہ تھا۔۔۔

’کما لیا!!۔۔۔‘

’ہُوں؟!!۔۔۔۔‘

’تیری ایک بیٹی بھی تو تھی۔۔۔۔۔گے دن کی بھلا۔۔۔؟!!‘

’میری بیٹی۔۔۔میری بیٹی۔۔۔‘ اُس نے اندھیرے میں گھورتے ہوئے دو تین مرتبہ دہرایا اور نہیں۔۔نہیں۔۔۔پکارنے لگا۔

وہ کبھی ڈرائیور کی جانب متوجہ ہوتا اور سختی سے اُسے گاڑی تیز چلانے کی تاکید کرتا اور پھر باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑاتا۔

’نہیں۔۔نہیں۔۔۔بیٹا! مَیں آ رہا ہوں۔۔۔دیکھ! رونا نہیں۔۔۔ناں، بالکل نہیں رونا۔۔۔!! اُستاد۔۔۔اُستاد!! جلدی چل۔۔۔مجھے اندھیرا گھنے سے پہلے پہنچنا ہے۔۔‘

اُس کی یہ تکرار جاری تھی کہ ساتھ بیٹھے ایک صاحب نے ازراہِ ہمدردی پوچھا،

’بھائی صاحب! کتنی بڑی ہے آپ کی بیٹی۔۔۔؟‘

اِس سے آگے وہ کچھ نہ سُن پایا۔اِتنی۔۔۔۔!نہیں، اِتنی۔۔۔۔!! نہیں، نہیں۔۔۔ اِتنی۔۔۔!!‘

اُس کا ہاتھ مختلف منزلوں سے گزرتا ایک جگہ ٹھہر گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے اُس کی اَن کہی کہانیاں ٹھہر گئی تھیں۔۔

’بابا، بابا!! مجھے کہانی سُنائیں۔۔‘

’کہانی۔۔! کون سی بیٹا!!‘

’بابا، کوئی سی بھی۔۔‘

’اچھا۔۔!! تو سُنو۔۔!!۔۔ایک تھا بادشاہ۔۔۔‘

’بابا! یہ بادشاہ کیا ہوتا ہے؟

’بادشاہ! بیٹا۔۔ بیٹا! سوال نہیں پوچھتے کہانی کے دوران‘

’پھر بھی بابا!۔۔۔‘

’پھر بھی۔۔‘

’بیٹا! بس یوں سمجھ لو، بادشاہ بہت بڑا ہوتا ہے۔۔۔اور اب خاموشی سے کہانی سُننا‘

’کوئی سوال نہ پوچھوں؟‘

’نہیں۔۔۔‘

’وہ کیوں بابا؟‘

’وہ اس لیے بیٹا! کہ کہانی تمام اُٹھتے سوالوں کا جواب خود دیتی جاتی ہے۔‘

’اور اگر بیچ میں سوال کرو تو۔۔۔؟؟‘

’تو بیٹا! کہانی اپنا راستہ بدل لیتی ہے۔۔‘

’پھر کیا ہوتا ہے بابا؟‘

’پھر بیٹا! کہانیاں ادھوری ہی رہ جایا کرتی ہیں۔‘

’بھائی صاحب!! آپ نے بتایا نہیں، ماشااللہ سے کیا عُمر ہے آپ کی بیٹی کی۔۔؟‘

لیکن اُس نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں اور گہری سوچ میں کھویا رہا۔۔۔گھر چھوڑنے کے چھ ماہ بعد پنڈ کے ایک بندے سے اتّفاقیہ ملاقات پر اُس کے علم میں آیا تھا کہ پیچھے اُس کے گھر بیٹی ہوئی ہے۔۔۔اور آج بیس سال بعد وہ کتنی کچھ ہوگی؟۔۔۔

’کمال دین! بیس سال۔۔۔بیس سال تجھے جس کی یاد نہ آئی، آج کس منہ سے جا رہا ہے اُس کے پاس۔۔۔؟؟

کیا وہ پہچانے گی تجھے؟

مانے گی۔۔۔؟؟

تُو۔۔۔تُو۔۔۔کیا ہے۔۔۔؟

کیا ہے تیرے پاس اُس کے لیے۔۔۔اُسے دینے کے لیے۔۔۔۔تُو تو اُسے اپنی پہچان بھی نہ کروا سکا۔۔۔پتہ نہیں اُس کی ماں نے تجھے اُس کے خیالوں میں زندہ رہنے کا حق

دیا بھی ہے کہ نہیں۔۔۔؟؟ نہیں، کمال دین!! نہ کر۔۔۔کہانی کا رُخ نہ موڑ۔۔۔جہاں سے آیا ہے، اُدھر ہی لَوٹ جا۔۔۔

ارے۔۔کمالیا، کیا ہوگیا ہے تجھے۔۔؟ سٹھیا تو نہیں گیا۔۔۔؟؟ خدا خدا کر کے تیری عقل ٹھکانے آئی ہے، تُو پھر۔۔۔نہ، نہ۔۔۔چل، سیدھا گھر چل۔۔۔بہت مسافری کر لی۔آخر کو وہ تیرا خون ہے۔اس سے تو انکار نہیں؛ اور خون تو اپنا آپ دکھائے گا۔تُو چل۔۔۔چل کے معافی مانگ لینا، پاؤں پکڑ لینا۔۔۔پراَب یہ چار دن کسی کِلّے سے بندھ کے گزار دے۔

خود سے اس تُو تکرار میں رات ڈھلتی رہی اور جب کنڈکٹر کے پکارنے پر وہ بھی بس سے اُترا۔۔۔تو یک بارگی چکرا کر رہ گیا۔کہاں وہ جنگل بیابان۔۔۔اور کہاں یہ اُونچے اُونچے پلازوں میں گھرا بَس سٹینڈ۔۔۔پھر وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔اس دوران اُس کی نگاہ آسمان پر پڑی، جہاں سورج اپنی پُوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔اور اس احساسِ تفاخر کے ساتھ کہ مخلوقِ خدا اُس کی گرم کرنوں کی آغوش میں سکون سے ستا رہی ہے، اُس کی سانسیں سینے میں سنبھالے نہیں سنبھلتی تھیں۔۔۔یونہی چلتے چلتے وہ ایک دوکان میں جا گھسا اور بنا سوچے سمجھے ہی ایک گُڑیا لیکر باہر آ گیا۔ پھر دوسری دوکان، پھر تیسری۔۔۔اور یوں پورے بازار میں گھومتا پھرا۔۔۔رنگ برنگی چوڑیاں۔۔۔کپڑے، جوتے۔۔۔نہ جانے کیا کیا کچھ لیتا۔۔جیسے ایک پہر میں ہاتھ سے گرے ہوئے بیس برس سمیٹ لینا چاہتا ہو۔۔۔آخرکار، اُس نے ٹیکسی روکی، کرایہ طے کیے بنا سامان رکھا اور بولا،

'چک۔41'

'کس جگہ؟؟'

'ٹبّے پہ۔۔۔'

اس موقع پر ڈرائیور نے بھی کچھ بولنا ضروری نہ سمجھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

سب کچھ کتنا بدل چکا ہے۔ پکّی سڑکیں، بڑی بڑی مارکیٹیں، ٹریکٹر ٹرالیاں، رکشے، ویگنیں۔۔

'کمال دین!'

’ہُوں۔۔۔!‘

’اگر وہ گھر بدل چکے۔۔‘

اُس کے ذہن میں ایک خیال اُبھرا اور یک لخت اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔۔۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔۔۔۔

سانس رُک سی گئی اور وہ پکار اُٹھا۔۔

’نہیں نہیں ایسا نہیں ہُوا۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ نہیں ہوسکتا ایسا۔۔‘

’جناب! خیر اے۔۔۔۔۔!! کیا نہیں ہوا۔۔۔؟؟ کیا نہیں ہوسکتا۔۔؟؟‘

ڈرائیور نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’وہ گھر نہیں بدل سکتے۔۔۔۔ وہ کون۔۔؟‘

’وہ۔۔‘

جواب میں ڈرائیور نے دوبارہ پوچھنا گوارا نہ کیا۔

’ہمیں کتنی دیر لگے گی!!‘

’ہیں۔۔۔؟‘

’آدھا گھنٹہ۔‘

’اچھا۔۔!!‘

کمال دین نے زیرِ لب کہا اور نگاہیں دُور تک پھیلے کھیتوں پر جما دیں۔ اُڑتے پرندے، ساتھ دوڑتے درخت، ٹیوب ویل میں نہاتے بچّے، سینہ تانے کھڑی فصلیں۔۔۔ وہ ہر شے کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا تاکہ پھر سے کوئی سوچ اُس پر حاوی نہ ہو سکے۔ گاڑی بائیں کو مُڑی اور چمکتا دمکتا سورج، ایک بار پھر اُس کے عین سامنے تھا۔

"جمالے! اِس جنم کی غلطیوں کا مداوا تو اگلے جنم میں ہی ہو پائے گا۔۔۔۔!!"

اُس کے کان میں جیسے کسی نے سرگوشی کی اور وہ بے بسی سے خیالات کے ایک نئے دھارے میں بہنے لگا۔۔۔

’کمال دین! تیری واپسی۔۔۔ یہ چار تھیلے کیا سب کچھ دھوڈالیں گے۔۔۔؟؟‘

ڈرائیور نے گاڑی کو تیزی سے کاٹا اور بیک وِیو مرر میں دیکھتے ہوئے ٹرالی والے کو صلواتیں سنانے لگا۔۔۔ پکّی سڑک سے اُتر کر گاڑی ڈھول کے بادل اُڑانے لگی اور وہ تیز تیز دھڑکتے دل، ساکن آنکھوں، کُھلے مُنہ اور کپکپاتے جسم کے ساتھ نظروں کے سامنے موجود مٹی سے لِپی ہوئی دیواروں کے درمیان لکڑی کے دروازے کو تکنے لگا۔

'یہی ہے۔۔۔۔!'

'ہاں۔۔ !!یہیں روک لو۔۔۔۔!!'

گاڑی رُکنے پر وہ لرزتا، کانپتا دروازہ کھول کے اُترا، سامان سمیٹا۔ اور گاڑی کے پلٹنے تک وہیں کھڑا رہا۔ پھر اس چور کی مانند، جو دیوار پھلانگنے سے پہلے یہ تسلّی کرنے کے لیے دائیں بائیں دیکھتا ہے کہ کوئی اُسے دیکھ تو نہیں رہا دیکھتے ہوئے، آہستہ قدموں سے آگے بڑھا اور کپکپاتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی۔ پھر دوبارہ۔۔۔ اور جب سہ بارہ دستک کے لیے ہاتھ اُٹھایا تو اُس کے کانوں میں آواز پڑی۔

'کون؟'

'مَیں۔۔۔۔'

اُس نے ہونٹوں پر اپنی زبان پھیرتے ہوئے بولنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کے گلے میں کوئی بانس کی فصل کاشت کر گیا تھا جس کی کونپلیں، تیزی سے بڑھتے ہوئے اُس کے حلق تک آن پہنچی تھیں۔۔۔

'مَیں۔۔ کمال دین۔۔ مِیدو کا پُتّر۔۔۔ صفیہ کا گھر والا۔۔۔ تیرا باپ۔۔۔ نہیں، بابا۔۔۔ نہیں، تیرا۔۔۔!'

ہزار کوشش کے باوجود بھی کوئی لفظ اس کے مُنہ سے نہ نکل سکا۔۔۔

یوں لگتا تھا، اُس کی قوّتِ گویائی اچانک سلب ہو گئی ہے۔ اُس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دروازے کے پیچھے دوپٹہ درست کرتے وجود کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن آنکھوں سے بھی جیسے بینائی رخصت ہو چکی تھی۔۔۔ کانپتا بدن، سامان کا بوجھ نہ سہار سکا اور اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر سب کچھ زمین پر آ رہا۔ کانچ کے ٹوٹنے کی آواز پر اندر سے آنے والی دَبی دَبی چیخ

پگھلا ہوا سیسہ بن کر اُس کے کانوں میں داخل ہوئی اور یوں سماعت بھی اُس کا ساتھ چھوڑ گئی۔۔۔

’نہیں، کمال دین! بعض جرم ایسے ہوتے ہیں، جن کا مداوا کرنے کے لیے کئی جنم لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔نہ کمالے! تیرا جرم معافی والا نہیں۔۔۔ناں!!‘

اُس کا اندر گونج اُٹھا۔۔۔نہیں، نہیں پکارتا ہوا وہ ایک جانب دوڑا۔۔۔اور دھول کی دیوار پھلانگ کے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔۔۔۔۔۔

☆☆☆☆

پلیٹ فارم

پروفیسر لیاقت علی (ملتان، پاکستان)

ایک ہفتے کے بیرونِ شہر دوروں اور دن بھر کی دفتری مصروفیات کے بعد آج ارادہ تھا کہ دفتر سے ذرا جلد رخصت لوں اور گھر جا کر آرام کر سکوں مگر ایک ضروری ڈاک نے نہ چاہتے ہوئے بھی آدھ گھنٹہ دفتر کی کرسی پر لا بٹھایا۔ اس ڈاک پر ضروری کارروائی کے بعد سر نیند سے بوجھل تھا اور ہاتھ میں پکڑا دفتری بیگ بھی بار محسوس ہو رہا تھا کہ بیگم نے گھر کا مین گیٹ کھولتے ہی اِک اور بوجھ کندھوں پر آن رکھا۔

''نیازی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے''

کب؟

شاید میں ''کیوں'' کہنا چاہ رہا تھا۔

آج صبح۔

میں صوفے پر ڈھے سا گیا۔

نجانے دکھ سے یا دکھ سے نباہ کے خوف سے!

بیڈ روم میں نصب وال کلاک بتا رہا تھا کہ دوپہر کے دو بج رہے ہیں۔

''اور جنازہ کتنے بجے ہے؟''

میں نے بوٹ اور جرابیں اُتار کر صوفے ہی پر لیٹتے ہوئے پوچھا۔

چار بجے.... گرمیاں ہیں تو ڈیڈ باڈی زیادہ دیر تو نہیں رکھی جا سکتی نا!

بیگم نے میز پر کھانا چنتے ہوئے جواب دیا

''کیا کہا تھا گھر ہیں؟''

''فوری طور پر کیا جھوٹ بولتی۔ بتایا تھا دفتر ہیں مگر ابھی آنے والے ہیں میں اطلاع دے دوں گی''

ضرور دیجیے گا۔ بتانے والے نے کم و بیش روتے ہوئے تاکید کی تھی۔

اِدھر بے اختیار اِک ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ ''چلو اچھا کیا۔ ایسے موقعوں پر شریک ہونا ہی چاہیے''

میں نے پہلی بار جیسے اس خبر کو اطمینان سے نگلتے ہوئے جواب دیا۔ پھر شام کی مصروفیات کو از سرِ نو ذہن میں ترتیب دیا تو سہ پہر کی نیند پر نیازی صاحب کے جنازے میں شرکت کو ترجیح دیتے ہوئے یوں اِک اطمینان کا سانس لیا جیسے اپنی رفاقت کا مقدور بھر حق اُسی لمحے ادا کر دیا ہو۔

پونے چار بجے میرے موبائل پر فلیش ہوئی اس یاد دہانی نے مجھے نیند سے بیدار کیا کہ مجھے جامع مسجد جانا ہے۔ میری بیوی نے اِس آواز پر بے زاری سے اِک کروٹ بدلی تو میں نے فوراً اس آواز کا گلا دبا دیا۔ اے۔ سی کی ٹھنڈی ہوا اور سکوت نے کمرے کو واقعی اس قدر پُرسکون بنا رکھا تھا کہ بچوں کے سانسوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں خاموشی سے اُٹھا اور وضو کرتا مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔

جنازہ گاہ پہنچنے اور پھر گھر واپس لوٹنے تک میں خود کو جنازے میں شرکت کے حوالے سے ذہن میں پیدا ہوتی بے زاری پر سو بار ملامت کر چکا تھا۔ اِک عجیب سی عاجزی اور نیکی کی خواہش نے مجھے سحر میں لے رکھا تھا اور میں نے گاڑی اب گھر موڑنے کے بجائے نیازی صاحب کے دیرینہ دوست قریشی صاحب کے گھر کے راستے پر ڈال دی تھی۔ عجیب بات تھی کہ آج گاڑی کی ونڈ سکرین کے اُس پار سخت گرمی سے پگھلتی تارکول کی سڑک ہی ٹائروں کے نیچے سے دوڑتی ہوئی نہیں گزر رہی تھی، نیازی صاحب کے ساتھ گزرے روز و شب بھی اسی تیزی سے اپنی جھلک

دکھاتے دوڑتے چلے جارہے تھے۔

اُس وقت ہم ریلوے کوارٹرز میں رہتے تھے۔ ابا ریلوے میں درجہ دوم کے ملازم تھے۔ میں ابھی مڈل میں ہی پڑھتا تھا مگر اپنے ہم عمر لڑکوں کے برعکس سنجیدگی میرے مزاج کا حصہ تھی۔ ابا کے کئی دوست تو انہیں چھیڑتے تھے کہ لوگ اولاد پیدا کرتے ہیں تم نے باپ پیدا کرلیا ہے۔ سکول جانے اور گھر کا سودا سلف لانے کے علاوہ میں شروع ہی سے مطالعے کا بے حد شوقین تھا۔ ابا گزشتہ روز کے باسی اخبارات گھر لاتے تو میں اُس کی ایک ایک سطر پڑھ ڈالتا۔ اپنی جیب خرچ سے پیسے بچا بچا کر قریبی لائبریری سے روز کے روز کتابیں اور رسالے لاتا اور اس خوف سے کہ ان کا کرایہ نہ بڑھ جائے ایک ہی رات میں پڑھ لیتا۔ ان کتابوں میں مذہبی، علمی اور ادبی ہر نوعیت کی کتابیں شامل تھیں، ہاں مگر کہانیوں سے مجھے خصوصی دلچسپی تھی۔ مختلف سلسلہ وار کہانیوں کی شاید ہی کوئی قسط میں نے کبھی چھوڑی ہو۔ اس مصروفیت کے ساتھ ساتھ ہر شام کچھ دیر کے لئے پلیٹ فارم پر جا بیٹھنا بھی میرے معمول کا اہم حصہ تھا۔

میٹرک کے امتحانات سے فراغت کے بعد تو اس معمول میں اور بھی پختگی آ گئی اور میں گھنٹوں پلیٹ فارم کے بینچوں پر بیٹھا گاڑیوں اور مسافروں کو آتے جاتے دیکھتا تو کچھ یوں محسوس ہوتا جیسے یہ بھی قسط وار چلنے والی کوئی دلچسپ کہانی ہے کہ جس کی ہر نئی قسط دیکھنے کا تجسس مجھے ان بینچوں پر لا بٹھاتا ہے۔

پلیٹ فارم پر کھانے پینے اور خریداری کے مختلف النوع اسٹالز میں سے ایک کتابوں کا اسٹال میری خصوصی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ میں اُس کے آس پاس منڈلاتا رہتا۔ کاؤنٹر پر سجے اخبارات کی شہ سرخیاں پڑھتا، رسائل کے سرورق دیکھتا اور کتابوں کے عنوانات پڑھ پڑھ کر دل ہی دل میں انہیں پڑھنے کی خواہش پالتا۔ انہی اخبارات، کتب اور رسائل کے بیچ میں نے ایک درمیانی عمر کے صاف ستھرے اُجلے لباس میں ملبوس نہایت چاک و چوبند شخص کو دیکھا۔ وہ غالباً سٹال کا مالک تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کی شخصیت اور نفاست سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ اس میں اپنائیت کی عجب کشش محسوس کرنے لگا۔

پھر اِک روز اسی سٹال پر سفید چارٹ پر سیاہ مارکر سے لکھا یہ اشتہار میری نظر سے گزرا۔

''ایک سیلز بوائے کی ضرورت ہے''

نجانے مجھے کیا سوجھی کہ میں اُٹھا اور کاؤنٹر پر جا پہنچا۔

''جی بیٹا؟''

اخبار کی ورق گردانی کرتے اُس شخص نے ایک اُچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

میں فی الفور کوئی جواب نہ دے پایا۔

اُس نے اخبار لپیٹ کر مجھے بغور دیکھا اور قبل اس کے کہ اگلا سوال کرتا میں نے چارٹ پر لکھے اشتہار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''جی میں اصل میں یہ اشتہار پڑھ کر آیا ہوں''

تم کروگے نوکری؟

اُس نے یوں حیرت سے پوچھا جیسے میری وضع قطع اور شکل وصورت سے اُسے اس ملازمت کے مطلوبہ معیار کی تائید نہ مل رہی ہو۔

''جی میں ہی کروں گا''

میں نے اب قدرے اعتماد سے جواب دیا۔

یوں وہیں کھڑے کھڑے میرا انٹرویو مکمل ہوا اور میری کتاب دوستی اور مطالعے کی عادت نے اُسے ایسا متاثر کیا کہ مجھے ایک ہزار ماہانہ تنخواہ پر سہ پہر چار بجے سے رات گیارہ بجے تک یہاں ملازمت مل گئی۔ ہاں ایک شرط ضرور عائد کی گئی کہ کل تک میں ابا کو ساتھ لے آؤں۔ اُس رات میں نے منت سماجت اور کالج داخلے تک کی ایک معقول مصروفیت کا جواز دے کر ابا کو رضامند کرلیا اور اگلے روز وہ خود مجھے وہاں چھوڑ آئے۔

میرے لئے اب اُجلے سنورے لباس میں ملبوس یہ خوش مزاج شخص اب محض اِک اجنبی نہ رہا بلکہ پلیٹ فارم کی ہردل عزیز شخصیت نیازی صاحب میں ڈھل گیا۔

یہ میری نیازی صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔

اور پھر پندرہ برس کی اس رفاقت میں ہر بار مجھے یہی محسوس ہوتا رہا میں نیازی صاحب سے پہلی ہی بار مل رہا ہوں۔ ہر نئے دن میں ان کے اندر سے ایک نئی شخصیت کو دریافت ہوتا دیکھتا رہا اور قبل اس کے کہ میں تعین کرتا ہاں یہ اصل نیازی صاحب ہیں وہ جیسے کسی بہروپیے کی مانند اِک

نئے سوانگ میں دکھائی دیتے اور میں سوچتا رہ جاتا ''اللہ یہ نیازی صاحب آخر کیا شے ہیں؟''

میری ملازمت کا آغاز ہوا تو میں نہایت مستعدی سے ٹھیک سہ پہر چار بجے سٹال پر آن پہنچتا۔ نیازی صاحب نظر کا اِک نفیس فریم والا چشمہ آنکھوں پر ٹکائے کسی کتاب یا رسالے کی ورق گردانی کر رہے ہوتے۔ میری آمد پر مجھے بغور دیکھتے اور پھر میرے صاف ستھرے لباس اور احتیاط سے بنائے بالوں کو دیکھ کر اطمینان سے مسکرا دیتے۔

کچھ ہی روز میں، میں نیازی صاحب کی اسی عادت کو جان گیا تھا کہ انہیں میلے کچیلے کپڑوں اور بے ترتیب اشیاء سے سخت کوفت محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا میں اب اس بات کا باقاعدہ اہتمام کر کے آتا کہ میرے کپڑے صف ستھرے ہیں۔ سٹال میں رکھی کتابیں، رسائل اور ضرورت کی دیگر اشیاء نیازی صاحب کی نفاست اور ستھرائی کی تو تائید کر رہی تھیں مگر شاید وہ اب تک نئی کمرشل ضروریات سے غافل تھے۔

سو میں نے یہ کیا کہ اب تمام اشیاء کو کچھ ایسی ترتیب دی کہ یہ دور ہی سے دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہاں روزمرہ یا سفری استعمال کی دیگر اشیاء اور بچوں یا رشتے داروں کے لئے خریدے جا سکنے والے سستے تحائف بھی رکھنے کا مشورہ دیا تو نیازی صاحب نے اجازت دے دی۔ یوں چھوٹے سائز کی ٹارچ، کی رنگز، تالے، ربن، گفٹ پیکس اور اس نوع کی دیگر اشیاء نے کاؤنٹر کو کچھ ایسا جاذب نظر بنایا کہ کئی ایک مسافر تو اپنی ضرورت کا تعین یہاں آنے کے بعد کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دکان پر گاہکوں کی آمد و رفت دوگنا ہو گئی۔

ایسے میں بجائے اس کے کہ نیازی صاحب خوش ہوتے، میں ان میں عجب چڑچڑاپن دیکھ رہا تھا۔ آخر اِک روز ان گاہکوں سے فراغت پا کر نیازی صاحب نے اپنی بے زاری کا اظہار کر ہی دیا۔

''بھئی ذیشان میاں یہ میلہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا''

میں پہلے تو اس جملے کے مفہوم ہی کو نہ سمجھ پایا مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ دراصل نیازی صاحب دن رات پیسہ کمانے والا تاجرانہ ذہن نہیں رکھتے تھے۔ یہ کتابیں اور رسائل نہ صرف یہ کہ وہ فروخت کرتے تھے بلکہ خود بھی پڑھتے تھے اور اگر کتاب فروخت کرتے ہوئے انہیں اس

بات کا شائبہ بھی ہو جاتا کہ خریدنے والا کتاب دوست نہیں تو اپنے خسارے کی پرواہ کئے بغیر فوراً کہہ دیتے:

''صاحب کتاب دستیاب نہیں ہے''

سامنے رکھی ہوئی کتاب کیا نیازی صاحب کے اس جملے کی تائید کر سکتی تھی؟ ایسے میں، میں احتیاطاً اشارہ کرتے ہوئے انہیں کتاب کی طرف متوجہ کرتا تو تیزی سے جواب دیتے۔

''مگر یہ کوئی لے چکا ہے اس لئے معذرت''

نیازی صاحب ایسے میں اس قدر سنجیدہ ہو جاتے کہ سوائے چپ سادھ لینے کے کوئی چارہ نہ بچتا۔ پھر کچھ دیر بعد خود ہی کہتے۔

''ارے ذیشان میاں اس بد بخت کو کتاب دینے سے تو بہتر ہے یہ یہیں رکھی رہے''

میں حیرت سے سر پکڑ لیتا۔

''مگر نیازی صاحب اس طرح تو......''

''بھئی میرا تو یہی اصول ہے''

وہ میری بات کاٹ کر کہتے اور پھر اخبار پڑھنے لگتے۔ مگر دوسری طرف یہ ہوتا کہ ہفتے، ڈیڑھ ہفتے بعد وہ کیلکولیٹر پر جھکے دکھائی دیتے۔ انگلیاں بار بار کیلکولیٹر کے ''کی پیڈ'' پر اِدھر اُدھر دوڑتیں اور بھنویں سکڑتی چلی جاتیں۔

''ذیشان صاحب کچھ خیال کیجیے۔ آج کل خاصا مندا چل رہا ہے''

اب میں اس مندے کے اسباب انہیں کیا یاد دلاتا، فقط یہ کہہ کے چپ ہو جاتا ''نیازی صاحب ان شاء اللہ اب بہتری ہوگی۔''

میری ملازمت کا پہلا مہینہ ختم ہوا تو دو تین روز تو میں اپنی تنخواہ کا انتظار کرتا رہا۔ مگر نیازی صاحب کو تو جیسے اس کی خبر ہی نہ تھی۔ آخر پانچویں روز میں نے کچھ ڈرتے ڈرتے انہیں یاد دلایا۔

''نیازی صاحب وہ...... میری تنخواہ''

''تنخواہ تو صاحبزادے تمہیں اگلی یکم سے ملے گی''

تنخواہ تو صاحبزادے تمہیں اگلی یکم سے ملے گی!

وہ تو جیسے اس جملے کا ریاض کر کے بیٹھے تھے۔

مگر میرے کان ایسا سفاک جملہ سننے کے لئے کہاں تیار تھے۔

''مگر کیوں؟''

میں نے جھلاّ کر کہا۔

''بھئی ذیشان میاں وہ کہتے ہیں نا کہ دودھ کا جلا چھاچ بھی پھونک کر پیتا ہے''
میں نے حیرت سے اس بے محل محاورے پر ان کی طرف دیکھا تو مسکرا کر کہنے لگے۔
''وہ اشتہار جو تم پڑھ کر یہاں آئے تھے جانتے ہو لگانے کی نوبت کیوں آئی تھی؟''
میں پھر فقط اُن کا منہ دیکھتا رہا۔

''اس سے پہلے بھی یہاں دو بیلز بوائز کام کر چکے ہیں۔ مگر دونوں بدبخت میرا اچھا خاصا نقصان کر کے بھاگ گئے۔ اب تیسری مرتبہ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پہلی تنخواہ بطور سیکیورٹی اپنے پاس رکھوں گا جو ملازمت چھوڑنے پر ادا کی جائے گی۔''

''مگر آپ مجھے یا میرے ابا کو نہیں جانتے کیا؟''

میں جو اس نئے نئے روزگار کے زعم میں اب گھر والوں سے جیب خرچ مانگنے کو بھی شرمندگی سمجھنے لگا تھا، جیسے بھنا سا گیا۔

''بھئی یہ سب بجا مگر یہ میرا اصول ہے''

نیازی صاحب نے حتمی فیصلہ سنایا تو نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نیازی صاحب کہ جن کی پورے پلیٹ فارم پر ایک خاص عزت تھی اور سبھی ان کی وضع داری اور نفاست کے گرویدہ تھے، اب خاموشی سے سر جھکائے اُس نوعمر کی بے تکان سن رہے تھے جس کی ابھی پوری طرح مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔

میں جب اپنا سارا غصہ اُگل چکا تو میری نگاہ آس پاس کھڑے پلیٹ فارم کے اہلکاروں پر پڑی جو حیرت سے میری اُس بدتمیزی کا جائزہ لے رہے تھے کہ میں جسے اپنی جرأت سے تعبیر کر رہا تھا۔ نیازی صاحب خاموشی سے یہ سب سنتے رہے اور پھر اِک توقف

کے بعد بولے۔

''اچھا اب جاؤ چائے کا کہہ آؤ صبح سے پی نہیں تو بدن ٹوٹ رہا ہے''

میں غصے سے پاؤں پٹختا گھر پلٹ گیا۔

اگلے روز شام کو نیازی صاحب میرے گھر آن موجود ہوئے۔ اس گزری ہوئی شب اورابا کے سمجھانے کے بعد میرا غصہ اب شرمندگی میں ڈھل چکا تھا۔ نیازی صاحب کو دیکھا تو مزید کھسیانہ ہوگیا۔ ایسے میں انہوں نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولے۔

''کل تم نے جو جو کچھ کہا کچھ ایسا بے جا بھی نہیں تھا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی وہی سب کہتا۔ لو اپنی تنخواہ رکھو اور کل وقت پر پہنچ جانا''

میں شرمندگی سے فقط اتنا کہہ سکا۔

نیازی صاحب......اور نیازی صاحب میرا جملہ کاٹ کر بولے۔

''اور ہاں اس ایک چھٹی کی تنخواہ میں ضرور کاٹوں گا یہ میرا اُصول ہے''

میں یہ سن کر مسکرا دیا تو انہوں نے اپنی عینک کھسکائی اور سر کو ذرا جھکا کر براہ راست میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے چل دیے۔ نیازی صاحب کی نظر کمزور تھی اور عینک لگاتے تھے۔ مگر عجیب بات تھی کہ جب کبھی انہیں کسی کو اپنائیت اور محبت سے دیکھنا مقصود ہوتا تو عینک ذرا نیچے کر کے براہ راست دیکھا کرتے تھے۔

یوں دوسرے روز میں وقت پر سٹال پر جا پہنچا۔ لیکن اگلے مہینے یہ بات میرے لئے ہضم کرنا مشکل تھی کہ نیازی صاحب نے واقعی میری ایک دن کی تنخواہ کاٹ لی تھی۔

پھر اِک روز میں نے نیازی صاحب کو نہایت مستعدی سے ایک ریڈیو کے کل پرزوں پر طبع آزمائی کرتے ہوئے پایا۔ وہ نہایت باریک بینی سے اس کا آپریشن کرتے رہے تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے کہا۔

''نیازی صاحب یہ آپ کا کام نہیں اِسے کسی مکینک کو دکھایئے''

انہوں نے میری بات کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ یوں لگا جیسے وہ سن ہی نہ رہے ہوں۔ مگر پھر کچھ ہی دیر میں مجھے میرے سوال کا جواب ریڈیو پر بجتے ہوئے اُس ریکارڈ نے دیا کہ

جسے نیازی صاحب سنتے جاتے تھے اور سر دھنتے جاتے تھے۔

''جانتے ہو کون سا راگ ہے؟''

نیازی صاحب نے مجھ سے پوچھا تو نفی میں سر ہلاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا پوچھ یوں رہے ہیں گویا سبھی راگوں سے واقف ہوں۔

مگر پھر اِک روز عجب تماشہ ہوا۔ کسی سیاسی احتجاج پر شہر میں ہڑتال ہوئی تو شہر کے ساتھ ساتھ پلیٹ فارم کے سٹالز بھی بند ہونے لگے۔ ہم نے بھی شٹر گرایا اور پلیٹ فارم سے نکلے تو نیازی صاحب بولے۔

''آؤ ذیشان میاں آج تمہیں ایک نئی جگہ کی سیر کروا آئیں۔''

وہ آگے آگے چلتے رہے اور میں اُن کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے سوچتا رہا کہ اس تنگ و تاریک محلے میں ایسی کون سی نئی جگہ ہے جسے میں اب تک دیکھنے سے محروم رہا۔ کچھ دیر بعد نیازی صاحب ایک پرانی وضع کے مکان کے سامنے جا کر رُک گئے اور مجھے کہا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ دروازہ کھلا تو منہ میں پان رکھے ایک نسوانی وضع کا شخص برآمد ہوا اور نیازی صاحب کو دیکھتے ہی خوشی سے کِھل اُٹھا۔ دوڑ کر اُن کے قدم چھوئے اور ہمیں اندر لے آیا۔

پھر کچھ ہی دیر میں نیازی صاحب کمرے میں بپا موسیقی کی ایک غیر رسمی محفل میں نہایت انہماک سے ستار بجا رہے تھے اور میں حاضرین کی داد سے بے خبر آج اُنہیں صرف دیکھ رہا تھا۔

یہ نیازی صاحب آخر کیا شے ہیں؟

نر نئے دن یہ سوال مجھ سے ہم کلام ہوتا رہا اور میں اس کا جواب ڈھونڈتا رہا۔

اِک روز اسٹیشن پر بجلی کا سرکٹ منقطع ہوا اور پلیٹ فارم تاریکی میں ڈوب گیا۔ بجائے اس کے کہ الیکٹریشن کی پیشی پڑتی نیازی صاحب کا بلاوا آ گیا۔ اور پھر میں نے ایک ماہر اور پھرتیلے الیکٹریشن کے روپ میں نیازی صاحب کو برقی رو بحال کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ برقی رو ہی کیا آس پڑوس کی آبادی کے بچوں کے کھلونوں سے گھریلو استعمال کی مشینری تک خرابی کی صورت میں نیازی صاحب کے پاس آن پہنچتیں اور وہ اس وقت تک اُس میں مصروف رہتے

جب تک کہ اُسے ٹھیک نہ کرلیں۔ یہ وہ مشغلہ تھا جو اپنے انجام میں ان کے لئے ایسی سرمستی لاتا کہ وہ اطمینان کی اِک طویل ٹھنڈی سانس لیتے اور مسکراتے ہوئے کہتے۔

''بھئی ذیشان صاحب یہ مستری کے بس کا روگ نہیں تھا''

اوراس فراغت کے بعد چائے کا آرڈر تو مجھے اب یاد ہو گیا تھا۔

یہاں کام کرتے ہوئے مجھے اب چھ ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ میرا رزلٹ آیا اور کالج میں ایڈمشن بھی ہو گیا۔ مگر نیازی صاحب کی خواہش تھی کہ نئے لڑکے کے بندوبست تک میں سٹال پر بھی آتا رہوں تو کیا حرج ہے؟ میں بھی اب اس معمول کا عادی ہو چکا تھا اس لئے ایک بار پھر ابا سے درخواست کی اور ملازمت کا یہ سلسلہ جاری رہنے دیا۔ یوں دن میں کالج جانا اور سہ پہر سے رات گئے تک اس سٹال پر آنا اب میرا معمول بن گیا۔

نیازی صاحب کا اپنا بیٹا بھی کالج میں پڑھتا تھا مگر وہ اُس کی ناقص تعلیمی کارکردگی اور بری صحبت سے اس حد تک نالاں تھے کہ کبھی کبھی تو کالج کی پڑھائی ہی کو وقت کا زیاں سمجھنے لگتے۔ بار ہا ریلوے کے اہم افسران سے بیٹے کی ملازمت کا وعدہ لے چکے تھے مگر بیٹا تھا کہ گزشتہ چار برس سے ایف۔ اے بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

میری اب نیازی صاحب کے توسط سے پلیٹ فارم کے چھوٹے بڑے سبھی اہل کاروں سے شناسائی پیدا ہو گئی تھی۔ نیازی صاحب ان سماجی تعلقات کے نباہ میں بے حد جذباتی تھے۔ اخلاقی تقاضوں سے مالی معاونت تک کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بہت سے دوست احباب تو محض وقت گزارنے یا چائے کا کپ پینے بھی اُن کے پاس آن بیٹھتے تھے۔ مگر وہ تھے کہ گاہکوں کی آمد پر تیوری چڑھ سکتی تھی، دوستوں کے معاملے میں ان کے ماتھے پر کبھی بل نہ آیا۔

اِدھر کوئی دوست ان کے پاس آتا اُدھر محسوس ہوتا جیسے اُن میں کسی نے کوئی انجانی توانائی بھر دی ہے۔ دنیا جہاں کے قصے، واقعات اور قہقہے گونجتے اور میں سٹال میں رکھے بڑے سٹول پر بیٹھا ان تعلق داروں کو دل ہی دل میں کوستا رہتا جو سٹال کو مسلسل خسارے کی طرف لئے جا رہے تھے۔

دو تین ماہ بعد ایک نئے لڑکے کا بندوبست ہو گیا تو میں ملازمت چھوڑ کر واپس گھر

آ گیا۔

پھر نیازی صاحب سے میری ملاقاتیں دنوں سے ہفتوں اور ہفتوں سے مہینوں کے فاصلوں میں ڈھلتی چلی گئیں۔

اس عرصے میں ہر بار میں سٹال کو آہستہ آہستہ زوال کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سٹال خالی اور نیازی صاحب کی معاشی بدحالی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس بڑھتی ہوئی معاشی بدحالی میں پلیٹ فارم پر لاگو ہونے والے بعض نئے قوانین نے مزید اضافہ کر دیا۔

حکومت نے غیر متعلقہ افراد کے اسٹیشن میں داخلے کو کم کرنے کے لئے پانچ روپے کے پلیٹ فارم ٹکٹ کا اجراء کیا تو اسٹیشن سے ملحقہ آبادی کی وہ ساری خواتین جو نیازی صاحب سے رسائل، اخبارات اور ضرورت کی دیگر اشیاء منگوایا کرتی تھیں اب شہر ہی سے خریداری کرنے لگیں۔ مزید یہ ہوا کہ اسٹیشن کا علاقہ اب کینٹ میں شامل ہوا تو آرمی انسپکشن ٹیم کو لگا ایک سٹال کا چالیس ہزار سالانہ ٹھیکہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہے۔ یوں کھلی بولی ہوئی اور یہ ٹھیکہ ایک لاکھ فی سٹال تک جا پہنچا۔

چار و ناچار نیازی صاحب نے ٹھیکہ لے تو لیا مگر ایک طرف کم ہوتی آمدنی اور دوسری جانب اخراجات میں اضافے نے انہیں قرض کے بوجھ تلے لا بٹھایا۔ دو تین برس کی بے سود کوشش کے بعد آخر کار وہ سٹال فروخت کرتے گھر جا بیٹھے۔ رقم کا بیشتر حصہ تو قرض داروں نے بانٹ لیا بقیہ ماندہ سے انہوں نے اپنے محلے میں ایک چائے خانہ کھول لیا۔ جلد ہی اُن کے انہی مفت خور دوستوں نے اس چائے خانے کو بھی وقت گزارنے کا ٹھکانہ بنا لیا اور اسے بھی دیوالیہ کر دیا۔ دکان مالک نے چھ ماہ تک کرایہ نہ ملنے کے بعد بذریعہ عدالت دکان خالی کرنے اور کرایہ ادا کرنے کا نوٹس بھجوا دیا۔ اس کے بعد میں نے مختلف اوقات میں نیازی صاحب کو مختلف کام کرتے ہوئے پایا۔ کبھی کسی الیکٹریشن کی دکان پر الیکٹرک کے سامان کی مرمت کرتے ہوئے تو کبھی کسی ریڈیو مکینک کی دکان پر کسی پرزے کو درست کرتے ہوئے۔ ایک روز تو میں نے انہیں پبلک ٹرانسپورٹ کی ایک بڑی بس میں سستے داموں پرانی کتابیں بیچتے ہوئے دیکھا تو دانستاً ان سے نظریں چرا لیں۔

گھونسلے سے گرے نوزائیدہ پرندے کی مانند وہ بہت ہاتھ پاؤں مارتے رہے مگر کبھی

پلٹ کر اپنے مستقل ٹھکانے پر نہ بیٹھ سکے۔ میں نے اسی اثناء میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر لیا اور اکاؤنٹس میں ایک اہم سرکاری منصب پر فائز ہو گیا۔

اس دوران اُن سے میری ایک ملاقات ہوئی۔ ایک مرتبہ خبر ملی نیازی صاحب بے حد بیمار ہیں۔ یہ خبر سن کر مجھ سے رہا نہ گیا تو میں اُن کی خیریت دریافت کرنے اُن کے گھر چلا گیا۔ میری آنکھیں حیرت اور دکھ سے بھر آئیں۔ اُجلے سنوارے لباس میں ملبوس، ہنستے کھیلتے وضع دار نیازی صاحب اور اس ڈھیلی ادوائن کی چھلنگا چارپائی میں میلی شلوار اور بوسیدہ بنیان میں پڑے ہڈیوں کے اس ڈھانچے میں کتنا فرق تھا۔ مجھے دیکھ کر نیازی صاحب کے کمزور جبڑے تھرتھرائے اور ہنسنے کی خواہش میں کھانسی کے ایک طویل دورے سے اُن کی آنکھیں جیسے اُبل کر باہر نکل آئیں۔ کچھ دیر بعد قدرے آرام آیا تو اُکھڑی اُکھڑی سانس میں بولے۔

''ذیشان میاں بس دیکھ لو اپنے اللہ میاں کو کیا گت بنا دی ہے''

میں نے کہا نیازی صاحب گھبرائیں نہیں معمولی کھانسی ہے یہ آپ کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ آپ تو ماشاءاللہ اب بھی اسی طرح جوان دکھائی دے رہے ہیں۔ ہاں ذرا دبلے ہوئے ہیں تو کیا زیادہ سجیلے نظر آنے لگے ہیں۔

''ہاں وہ تو خیر میں ہوں'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے پوری قوت سے اُٹھ کر بیٹھنا چاہا تو میں نے لپک کر انہیں سہارا دیا اور کمر کے پیچھے دو تکیے رکھتے ہوئے کہا ''اب کہیے کیسے ہیں؟''

''ارے کیا بتائیں ذیشان میاں پہلے چائے تو پی لو''

''ارے اپنے ذیشان صاحب کے لئے کوئی چائے وائے بناؤ بھئی''

انہوں نے بیٹیوں کو آواز دے کر کہا تو میں نے کہا۔

''نیازی صاحب اس تکلف کو چھوڑیے یہ بتایئے بیٹے کی ملازمت کا کچھ ہوا کہ نہیں؟''

''ہونا کیا ہے ذیشان میاں۔ بدبخت ایف۔ اے ہی کر لیتا تو شاید بات بن جاتی۔ اب ایک جاننے والے نے کلرک بھرتی کروانے کا عندیہ تو دیا ہے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

''فکر نہ کریں نیازی صاحب اللہ سبب پیدا کرنے والا ہے''

میں نے یونہی انہیں تسلی دی۔

''ہاں خیر یہ تو ہے ہی''

نیازی صاحب نے کچھ ایسے تھکے ہوئے لہجے میں کہا جیسے انہیں اس بات پر زیادہ اعتبار نہ رہا ہو۔ یوں باتیں چل نکلیں مگر نجانے کیوں یہ خیال بار بار کوند کر میرے ذہن میں آتا رہا کہ میں نیازی صاحب سے آخری بار مل رہا ہوں۔ میں چائے کا کپ پیتا اُٹھا اور کچھ رقم ان کے سرہانے یہ کہتے ہوئے چھوڑ آیا کہ ''آتے ہوئے پھل خریدنے کا ارادہ تھا مگر یاد نہیں رہا تو سوچا جواد خرید لائے گا۔''

''نیازی صاحب کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ خوشی کے یا شاید بے بسی کے!''

میں واپس گھر پلٹ گیا۔

اور آج جب ان کا جنازہ پڑھ کر واپس آ رہا ہوں تو نجانے کیوں بار بار اُن کے لئے کچھ نہ کر سکنے کی کسک اور کچھ کرنے کی خواہش بے ارادہ مجھے قریشی صاحب کے گھر کی طرف لئے جا رہی ہے۔

قریشی صاحب کے گھر کے باہر لگی نام کی تختی کو غور سے پڑھنے کے بعد میں نے کال بیل پر انگلی رکھی تو قریشی صاحب نے گیٹ کھولا اور مجھے پہچاننے کی کوشش کے بعد بولے آپ کہیں ذیشان...........!

جی میں ذیشان ہی ہوں۔ میں نے ان کی بات کاٹ کر جواب دیا تو وہ خاموش ہو گئے۔

''نیازی صاحب کا پتہ چلا تو بے حد صدمہ ہوا''

میں اس خاموشی کو سمجھتے ہوئے بولا۔ اُس لمحے میں واقعی ایک شدید کرب سے گزر رہا تھا۔

''ہاں ذیشان صاحب۔ بس اللہ کے سامنے پہلے کسی کی چلی ہے جو اب چلے گی!''

قریشی صاحب نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا تو میں نے دل میں کوئی موہوم سی آس پالتے ہوئے پوچھا۔

''نیازی صاحب کی تین بیٹیوں اور بیٹے کی کفالت کا کوئی بندوبست ہے کیا؟''

''بس ذیشان صاحب کفالت کیسی۔ کچھ لوگ فقط جیئے جاتے ہیں۔ وہ بھی جی لیں گے''

قریشی صاحب نے اِک تاسف سے جواب دیا۔

''پھر بھی کوئی ذریعہ آمدنی تو ہوگا؟''

میں پھر کوئی اطمینان چاہتا تھا جو میرے اضطراب کو کم کر سکے۔

''بیٹیاں ہیں نا اُن کی۔ جہاں نیازی کے دوادارو کا بندوبست کرتی رہیں وہیں اس بے غیرت بھائی کو بھی پال لیں گی''

قریشی صاحب کے اِس تلخ جواب نے ایک لمحے کو جیسے میرے سر پر کوئی بجلی سی آن گرائی جو میرے پورے وجود کو جھنجھوڑتی ہوئی پاؤں کے تلووں سے نکل گئی۔

''بیٹیاں کیا کرتی ہیں اُن کی؟''

میں نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل پوچھا۔

کیا کرتی ہیں!

''قریشی صاحب ایک لمحے تک تو مجھے یوں دیکھتے رہے جیسے میری بے خبری یا عیاری میں تمیز نہ کر پا رہے ہوں۔ پھر سر نیہوڑائے بولے۔''

چائے پیو گے؟

جی شکریہ! میں نے تیزی سے قریشی صاحب سے ہاتھ ملایا اور پلٹ کر چل دیا۔ میرے پاؤں آج منوں وزنی تھے اور میں خود کو گھسیٹتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

انہی بوجھل قدموں کے ساتھ میں واپس گھر پہنچا تو بچے بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

''پاپا اتنی دیر کر دی''

میری بیٹی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

سوری بیٹا۔ میں نے اُس کے گال تھپتھپائے۔

''اوپر سے سیل فون بھی ریسیو نہیں کر رہے تھے۔ میں تو ڈر گئی خدا خیر کرے''

اس بار میری بیوی مخاطب تھی۔

''چلیں اب جلدی کریں ہم نے کے۔ایف۔سی جانا ہے''

میرے بیٹے نے تیزی سے کہا۔

''نہیں بیٹا آج نہیں''

''کیوں آج کیوں نہیں؟''

میری بیوی نے تنک کے پوچھا۔

''بس آج نہیں''

میں نے بنا کوئی وضاحت دیے فقط اپنا فیصلہ دہرایا۔

''ذیشان بچے صبح سے انتظار کر رہے ہیں اور.....''

''اور کیا!''

میں نے چیخ کر کہا۔

''اور کیا!''

''کچھ نہیں''

میری بیوی نے ضبط کرتے ہوئے جواب دیا اور پرس صوفے پر پٹختی سیڑھیاں چڑھتی بالائی منزل پر چلی گئی۔ بچے خاموشی سے آنسو بہاتے بیڈروم کی طرف چل دیے اور میں بہت دیر ٹی۔وی لاؤنج کے صوفے پر لیٹا قریشی صاحب کے جملے کی گونج سنتا رہا۔اس گونج نے گھر کے سناٹے میں اور بھی اضافہ کر دیا تو بالآخر میں نے اس سکوت کو توڑا۔

''سوری میں کچھ اَپ سیٹ تھا چلو چلیں''

میری بیوی نے کوئی جواب نہ دیا۔

''پلیز''

میں نے اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے کہا تو وہ Its Okay کہتے واپسی نیچے اُتر آئی۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں، میں کے۔ایف۔سی کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر رہا تھا اور

بچے ٹیپ پر بجتے پاپ میوزک کی دُھن پر لہک لہک کر اِک کورس میں گا رہے تھے۔

جدا ہو کے بھی   تو مجھ میں کہیں باقی ہے۔

جدا ہو کے بھی.....!

☆☆☆☆

رکھوالی

قمر سبزواری (دبئی، یو اے ای)

سنو ذرا ایک ماچس تو دینا۔۔۔۔دیکھو بھئی، ادھر بھی دیکھ لو۔۔۔۔توبہ ہے، چھوٹی موٹی چیز لینی ہو، تو پھر تو انتظار ہی کرتے رہو، کریانہ سٹور پر کھڑی چھوٹے قد اور کپڑوں سے لڑائی کر کر کے زبان باہر نکالے، ہانپتیو جود والی عترت دوپٹے کا وجود ڈھیک ہونے کے باوجود دوبارہ کھول کر ٹھیک طرح سے اُڑھتے ہوئے بڑبڑائی، یکدم وہ اُچھل کر رہ گئی؛ کوئی نوکیلی شے اُس کے کولہے کے داہیات حد تک پیچھے نکلے ہوئے حصے پر زور سے چبھی۔ وہ بھنا کر پیچھے مڑی، رشیداں ہاتھ میں بالوں کی سوئی دبائے اُس کے بالکل ساتھ پیچھے کھڑی اپنے دانت دکھا رہی تھی۔ کیوں ری۔۔۔بدمعاش یہ ماچس خریدنے کا کون سا وقت ہے۔ بچے ناشتہ کر کے سکولوں کالجوں کو چلے گئے اور خصم تیرا گھر پر ہے نہیں، تو نے اس وقت کون سی آگ جلانی ہے۔ رشیداں نے اپنے منہ پر ترچھا ہاتھ رکھ کر عترت سے سرگوشی کرنے کی بھونڈی سی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اسی اثناء میں دُکان میں موجود بچے نے تر تو یعنی عترت کی طرف متوجہ ہو کر کہا، جی خالہ جی کیا چاہیے آپ کو۔ عترت نے روپے کا سکہ اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا، ماچس چاہیے اور کیا تیرا سارا سٹور خریدنے آئی ہوں۔ بچے نے فوراً ماچس لا کر پکڑائی اور جان چھڑاتے ہوئے دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عترت واپس مڑتے ہوئے رشیداں سے بولی تو نے کیا لینا ہے۔ نہیں کچھ نہیں میں نے کیا لینا، میں تو شاہدہ کی طرف جا رہی تھی تم پر نظر پڑی تو رُک گئی۔ اور تو کدھر؟ رشیداں نے واپس تر تو سے سوال کیا، جا تو میں بھی شاہدہ ہی کی طرف رہی تھی، دروازے

سے نکلی تو پچھلی گلی کی وہ بل کٹی لڑکی نہیں ہے۔۔۔۔ جس کی پچھلے مہینے شادی ہوئی تھی۔۔ بڑی بن ٹھن کے نکلتی ہے۔۔۔اری حرام زاد جو گلی میں بھی اپنے یار کا ہاتھ پکڑ کر چلتی ہے۔عترت نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔ہاں ہاں وہ چھوٹی چھوٹی ماسمیوں والی۔

رشیداں نے لڑکی کا حوالہ پہچانتے ہوئے کہا۔۔۔ہاں وہی۔۔۔وہ بڑی گھبرائی ہوئی سی جا رہی تھی میں اُس کے پیچھے چل پڑی سوچا پتہ نہیں کیا بات ہے کچھ پتہ تو چلے،لیکن جوان ٹانگیں زیادہ پھدکتی ہیں ناں، یہاں پہنچی تو وہ آگے نکل گئی میں نے سوچا اب آدھے رستے سے یکدم واپس مڑنا اچھا نہیں لگے گا، ماچس خریدنے کا بہانہ کرلوں، باتیں کرتی کرتی دونوں شاہدہ کے گھر کی طرف جا رہی تھیں۔

اور سنا،کل بھاگی چلی آئی تھی شہدو کے گھر سے خصم کا فون سننے،کیا کچھ کہتا ہے۔عترت نے بات چھیڑی۔کہنا کیا ہے وہی حال احوال اور نصیحتیں۔بچوں کی پڑھائی کا خیال رکھنا، جا کے میری بہن کے گھر ہو آیا کرو، کیا کہیں گے اُس کے سسرالی کہ میکے میں کوئی ہے ہی نہیں خبر لینے والا۔اب بھلا میں کیا پتہ کروں اُس حرام زاد کا ہنٹی کٹی ہے کھا کھا کے کپا ہو رہی ہے، ہر دوسرے روز خاوند کے ساتھ کہیں نہ کہیں سیر سپاٹے ہو رہے ہوتے ہیں۔کبھی پکنک اور کبھی شاپنگ۔رشیداں نے عجیب حسرت بھرے لہجے میں بات کا جواب یا شاید بھڑاس نکالی۔اچھا چھوڑ و عترت نے بھی اُس کے دل کو مزید ٹھیس پہنچانا مناسب نہ سمجھا۔

اب کے شیداں نے بات چھیڑی بلکہ بات کیا چھیڑی اپنا بدلہ لیا۔مجھ سے تو خصم کا پوچھتی ہے اپنی سنا کچھ سکون ملا، یا ابھی تک نیند کی گولیوں کے پتے کھا کر بھی نیند نہیں آتی۔ترتو نے اُس کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھا اور بولی تو میرا حال پوچھ رہی ہے یا میرا مذاق اُڑا رہی ہے۔ابھی اُسے گئے ہوئے ہفتہ ہی تو گزرا ہے آجائے گی نیند بھی آہستہ آہستہ اور سکون بھی، اپنا یاد نہیں ہے جب فوج سے چھٹی آتا ہے تو کس طرح ہواؤں میں اُڑ رہی ہوتی ہے جوڑے کے ساتھ کے جوتے پہنتی ہے اور ساری گلی میں تیری چوڑیوں کی چھن چھن مچی ہوتی ہے۔نہ مہندی ہاتھوں سے اُترتی ہے اور نہ دنداسہ تیرے منہ سے جدا ہوتا ہے۔مگر جب مہینہ لگا کر واپس چلا گیا تو یاد ہے دس پندرہ دن تک تو شہدو کے گھر میں بیٹھ کر بھی تجھ سے بات نہیں ہوتی تھی، گم سم اور بالکل

نئی نئی بیوہ کی طرح لگتی تھی، تیرا تو پھر بھی، اپنے ملک میں تو ہے ناں میرا تو سات سمندر پار گیا ہوا ہے اب آئے گا بھی نصیبوں سے اور پتہ نہیں اگلے پھیرے تک وہ بات رہتی بھی ہے یا نہیں پچاس کا تو ہو چکا ہے اب آئے گا تو اپنی لاش سنبھالے گا یا مجھے، عترت ایسے بولی جیسے سارا غبار نکالنے کے لئے اُسے کسی کی تلاش تھی۔

اچھا چھوڑو ناں بہن، ہم دونوں ایک دوسرے کا کیا مذاق اُڑائیں گی، خود ایک چلتا پھرتا مذاق ہی تو ہیں، ارے یہ دیکھو یہ کون نکل رہا ہے شہدو کے گھر سے، بڑا جان جٹّے والا ہے بھئی جو کوئی بھی ہے، دیکھ ہمیں دیکھتے ہی ایک دم گلی مڑ گیا ہے، حرامی نے منہ بھی نہیں دیکھنے دیا اپنا۔

دونوں تیز تیز قدموں سے شاہدہ کے دروازے کی طرف بڑھنے لگیں۔ دونوں کے دل میں ایک ہی بات تھی، آج تو باتوں کا مزہ آئے گا، آج رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے شہدو کو۔ عترت نے شہدو کے دروازے پر واجبی سی دستک دی اور دونوں اندر داخل ہو گئیں۔

شاہدہ اپنی تینوں سہیلیوں عترت، رشیداں اور نرگس سے عمر میں چھوٹی تھی اور سب سے آخر میں اِن کی سہیلی بنی تھی۔ اُس کی عمر لگ بھگ پینتیس سال تھی، خاوند دو سال پہلے فوت ہو چکا تھا شاہدہ اپنی ساس ایک نند جو کہ پاگل تھی اور دو بیٹوں کے ہمراہ رہتی تھی، ایک بیٹی بھی تھی جس کی شادی خاوند کی زندگی میں ہی کر چکی تھی۔ بڑا بیٹا جو قریب انیس سال کا تھا ایک آٹو ورکشاپ میں کام کرتا تھا، گو آمدن واجبی سی ہی تھی۔ چھوٹا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ساس جس کی دو آپریشنوں کے بعد نظر تقریباً ختم ہو چکی تھی چھت پر بنے ایک کمرے میں رہتی تھی، نند کبھی اوپر کبھی نیچے کبھی گلی میں اور کبھی تین تین دن کمرے میں رہتی تھی۔

دونوں شاہدہ کے گھر میں داخل ہوئیں تو اندر نرگس کو بھی موجود پایا، نرگس کو دیکھ کر دونوں کو سخت جذباتی قسم کا دھچکا لگا جیسے شاہدہ کی چوری کے امکانات بالکل معدوم ہو گئے تھے۔ عترت سے پھر بھی نہ رہا گیا آنکھ دبا کر شاہدہ سے بولی یہ کون تھا۔ ظالم ہمارا تو بتا دیتی اُسے۔ ہم سے بھی منہ چھپا کر نکل گیا۔ شیداں، ترتو کی بات کاٹ کر بولی اے بہن جو بھی تھا مگر تھا کڑیل جوان یہ چھ فٹ قد اور چوڑے چکلے شانے، کسی کو بھینچے تو ہڈیاں ہی توڑ دے اُس کی۔ شاہدہ کی جگہ نرگس ہنس کر بولی، حرام زادیو تم دونوں کی ماں کا یار میٹر ریڈر تھا۔ بجلی کا میٹر دیکھنے آیا تھا کوئی میرا

کنکشن لگانے نہیں آیا تھا۔ چاروں ہنسنا شروع ہوگئی۔

ہنستے ہنستے ترتو بولی مڑے شہدو ہنس تو ہم رہی ہیں مگر ہے سب کچھ تیرے ہاتھ میں، تو کیوں نہیں ہمت کرتی کیا باقی کی زندگی اسی طرح لوگوں کے کپڑے سیتے گزارے گی ابھی تیری عمر ہی کیا ہے صرف پینتیس چھتیس سال شیداں اُس کے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی اور گنتی تو تُو پچیس چھبیس کی ہے۔ ہم تو مجبور ہیں نہ عمر رہی نہ کوئی حال اور اوپر سے خ وند کا اسٹیکر بھی لگا ہوا ہے عترت نے بات جاری رکھی، ہمارا تو کام ہی خاوندوں کے بچوں اور ماں بہن کی رکھوالی کرنا ہے، جب اپنی زندگیاں اپنی مرضی سے گزار کر یا اپنی ذمہ داریاں پوری کر کے واپس آئے تو سب کچھ پھر اُن کا اور ہم فارغ ،شیداں نے ترتو کی طرف اشارہ کر کے پھر لقمہ دیا ویسے یہ پھاپھاں کٹنی کہتی ٹھیک ہے۔ ہے تو یہ رکھوالی ہی چاہے مکانوں کی کہہ لو بچوں کی کہہ لو یا نرگسو کی طرح نام لگ جانے کی کہہ لو جس کے بدلے ہمیں خاوندوں کی طرف سے کپڑا لتہ اور دو وقت کا کھانا مل جاتا ہے۔

ترتو نے پھر سلسلہ کلام شروع کیا، خاوندوں والی ہوتے ہوئے بھی بیوہ بلکہ ہر دو چار سال بعد شادی اور پھر بیوگی کی زندگی گزار رہی ہیں مگر تیرا سائیں تو رہا ہی نہیں تو کیوں زنجیریں پہن کر بیٹھ گئی ہے۔ شہدو، ترتو کی بات کاٹ کر غصے سے بولی۔

گشتی ، بدمعاش میرے بچوں کو زنجیریں کہتی اور خود جن کی رکھوالی کر رہی ہے وہ کیا ہیں اور پھر ترتو کے سہم جانے پر خود ہی دھیمی پڑ کر لمبی سی سانس چھوڑتے ہوئے بولی ، ویسے باجی کہتی تو تُو بھی ٹھیک ہی ہے، عمر اور کاشف دونوں ہمیشہ اپنی دادی کی طرف داری ہی کرتے ہیں اور عمر تو بات بات پر مجھے ٹوک بھی دیتا ہے جیسے باپ کے مرنے کے بعد اب وہ میرا خاوند ہے۔ کوئی گھر میں آ جائے یا کبھی مجھے گلی میں دیکھ لے تو ایسی خونخوار نظروں سے دیکھتا ہے کہ کبھی کبھی تو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے کہیں ہاتھ ہی نہ اُٹھا دے، کبھی میں سوچتی ہوں یہ دو بھی لڑکیاں لے آئے اور اسلم کی امی بھی گزر گئی تو مجھے تو اپنی پاگل پھوپھو کے ساتھ ہی رکھیں گے۔ پھر خود ہی سر جھٹک کر بولی نہ مڑے باجی چھوڑ۔۔۔

اس معصوم کاشف کو کس کے سہارے چھوڑوں اور اسلم نے مجھ سے اپنی پاگل بہن کا ساری عمر خیال رکھنے کا وعدہ بھی تو لیا تھا۔ ویسے بھی دوسری بار کا انجام یہ نرگسو ہمارے سامنے ہے

اس کا خاوند جب اسے گاؤں سے پہلے والے کے گھر بھگا کر ہمارے محلے میں لایا تھا تو کیسے اس کے پاؤں کے نیچے ہاتھ رکھتا تھا اور کورٹ کچہری کا مسئلہ ہنسی خوشی نمٹاتا تھا اور اب چھ چھ مہینے اس سے منہ ہی نہیں لگاتا کمینہ، نہ پرواہ کیا پہنتی ہے کہاں سے کھاتی ہے اور نہ فکر کے کہاں گئی ہے کہاں سے آئی ہے۔

نرگس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور اُس کے منہ سے جیسے بے خیالی میں نکلا اب نئی جو مل گئی ہے۔ اُس ماں کو چاٹے یا میرا خیال رکھے، مجھ موئی پر بھی عشق کا بھوت چڑھا تھا ناں اُس وقت، حرامی میرے خاوند کا نوکر تھا بس باتوں میں آ گئی اور کچھ اُس کے ظلم سے جان چھڑانے کی جلدی بھی تھی۔ اب کہتا ہے، طلاق بھی نہیں دوں گا اس کے ساتھ میرا نام لگا ہے، یہ میری عزت کی رکھوالی ہے بس بیٹھی رہے، اُس کی آنکھیں خشک تھیں مگر پھر بھی اُس نے ایسے صاف کیں جیسے نمی آ گئی ہو۔ پھر وہ گلاس اُٹھا کر کولر کی طرف جاتے ہوئے بولی میرا ابھی نام نرگسو ہے رکھوالی تو میں بھی خوب کر رہی ہوں۔ کیا یاد کرے گا، وہ اُدھر تو کوئی اور اِدھر۔

عترت، پاس سے گزرتی ہوئی نرگس کے کولہوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی ست خصمی تیری دکان میں ابھی سامان ہے ناں بیچنے کے لئے ہم تو اس سے بھی رہیں۔ رشیداں جو کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھی سلائی مشین کے اندر باہر ہوتے ہوئے گز پر نظریں گاڑھے بے خیلی میں ایک عجیب حسرت بھرے لہجے میں بولی ہماری بھی کتنی عجیب زندگی ہے۔

عام عورتیں جس کام کی زیادتی کے لئے اپنے شوہروں کی شاکی رہتی ہیں یا جس کے زور پر ناز نخرے اٹھواتی ہیں ہم سہاگنیں ہوتے ہوئے بھی اُس کے لئے ترستی ہیں۔ شہدو تُو تو دو سال ہوئے بیوہ ہوئی ہے مگر ہمیں تو اتنے سل ہو گئے کہ ہمیں یاد بھی نہیں۔ تجھے تو چل صبر آ گیا ہو گا مگر ہمارے بارے میں سوچ، نہ کوئی ناز اُٹھانے وال نہ منانے والا، ساون کے دِنوں میں، جاڑے کی راتوں میں عیدوں شب راتوں پہ ہم بیوہ ہوتی ہیں اور جب کچھ بھی نہیں ہوتا یا تھوڑا صبر آ بھی جاتا ہے تو ہم سہاگنیں بن جاتی ہیں۔ ہمیں یقین آنے تک ہم ایک بار پھر بیوہ ہو چکی ہوتی ہیں۔

نرگسو نے پانی کا گلاس منہ سے ہٹا کر گود میں رکھ لیا اور دونوں ہاتھوں سے اُسے دبانے لگی۔ عترت کی نگاہیں رشیداں کے متحرک لبوں پر ٹک سی گئیں اور شاہدہ کے ہاتھ میں سلگتی ہوئی

شلوار کا سارا کپڑا اکٹھا ہو گیا۔

رشیداں کی بات ابھی جاری تھی۔ مجھے تو کبھی کبھی اپنے آپ سے اور تم لوگوں سے بھی نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ ہم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہیں۔ ہم اپنے بیٹوں کی عمر کے لڑکے کو بھی دیکھ کر کمینی سوچوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ کبھی تو ہم سلائی مشین کے چلتے ہوئے گز کو دیکھ کر، سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے، آٹا گوندھتے ہوئے، کرسی کے پائے دھوتے ہوئے، دروازہ بند کرتے ہوئے یا ہنڈیا ہلاتے ہوئے بھی سانسیں بے ترتیب کر کے خیالوں کی دنیا میں گم ہو جاتی ہیں اور کبھی برف کی سِل کی طرح ہو جاتی ہیں، ہمیں یاد ہی نہیں رہتا کہ ہم عورتیں ہیں۔ میں سوچوں تو خیالوں ہی میں اپنے آپ پر تھوکنے کا دِل کرتا ہے کہ ہم کسی عورت کی پٹائی کی خبر سُن کر، کسی کی طلاق کی پتہ چلا کر یا کسی کنواری کا کوئی چکر پکڑ کر اس لئے خوش ہوتی ہیں کہ ہم ہر عورت سے جلتی ہیں، ہم کسی کی خوشی، کسی کا نہانہ برداشت ہی نہیں کر سکتیں۔ نرگس کی آنکھوں میں نمی اب واضع دِکھائی دے رہی تھی۔

یکدم شاہدہ اٹھی اور رشیداں کے کاندھے پر چٹکی کاٹتے ہوئے بولی بدمعاش تو کسی اسکول میں استانی لگ جا۔ بند کر اپنی بکواس میں چائے بنا کر لاتی ہوں تو ذرا اِس شلوار کو کھڑا کر دے۔

عترت کو آہستہ آہستہ دوبارہ نیند آنے لگی، ہاں گولیاں کھانے کی وجہ سے اُس کا رنگ کچھ مزید پیلا پڑ گیا تھا اور پیٹ بھی پہلے سے زیادہ پھول گیا تھا۔ ایک معمولی سی تبدیلی ضرور آئی تھی کی عترت جب بھی گلی محلے کے بچوں کو کھیلتا دیکھتی تو انھیں گھر میں بلا لیتی اور ٹی وی لگا کر خود بھی اُن کے ساتھ بیڈ پر نیم دراز ہو کر دیکھتی رہتی، کبھی کبھی وہ کسی لڑکے کو بہت پیار کرتی اور اُسے بہت دیر تک گود میں اچھالتی رہتی یا پاس ہی لٹا لیتی۔ نرگس اپنی نند کے، کچھ عرصہ بھائی کے گھر رہنے کے لئے آنے کی وجہ سے اپنا کام اب شہدو کے گھر میں کرنے لگی ایک دو بار شہدو نے انکار کیا کہ میرے بیٹے کو بھنک بھی پڑ گئی تو کہرام مچ جائے گا اور ویسے یہ تیرے والا لڑکا ہے بھی چھوکرا سا خود ہی اپنے دوستوں کے سامنے کہہ دے گا اور بات پورے محلے میں پھیل جائے گی مگر پھر نرگس کی منت سماجت کی وجہ سے اس شرط پہ مان گئی کہ تُو ہفتے میں ایک آدھ بار میرے بیٹے کے ورکشاپ جانے کے کم از

کم دو گھنٹوں بعد اور عترت، رشیداں کے چکر لگانے سے پہلے کے ایک گھنٹے میں ہی آ سکتی ہے، بیٹھک میں بیٹھ جایا کرے، وہ دہیں باہر کے دروازے سے آئے اور ادھر سے ہی واپس نکل جائے تب تو کنڈی چڑھا کر اندر کی طرف سے دروازہ کھول لیا کرے۔ شاہدہ نے اپنی بیٹھک کی کھڑکی میں بجلی کے پلگ کے لئے ایک سوراخ بنا دیا تھا جب نرگس اندر ہوتی تو شاہدہ بھی کھڑکی سے ہی جڑی رہتی اور پھر دوپہر کا کھانا بنانے سے پہلے نہا لیتی۔

دو تین مہینوں سے محلے میں کوئی نئی خبر نہیں تھی۔ نہ کوئی سرگوشی نہ کسی کے پیچھے چل کر سٹور سے ماچس خریدنا۔ نرگس کی نئی ملاقاتوں کا راز ابھی اُس کے اور شاہدہ کے درمیان ہی تھا شاید اس لئے کہ دونوں کا کام چل رہا تھا چاہے نوعیت الگ الگ تھی۔ رشیداں کے خاوند کو اگلے مہینے چھٹی ملنی تھی وہ ہر روز کسی نہ کسی تیاری کا بتاتی جسے سُن سُن کر باقی تینوں کے ب کان پک چکے تھے۔ عترت کو کبھی کبھی شک کا دورہ پڑتا کہ شاید اُس کے خاوند نے سعودیہ میں بھی شادی کر رکھی ہے مگر اب اُس نے اِس سلسلے میں زیادہ پریشان ہونا چھوڑ دیا تھا کہ اُسے معلوم تھا کہ اگر کی ہوئی بھی ہے تو اب وہ عمر کے اس حصے میں ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے واپس میرے پاس ہی آئے گا۔

ایک دن نرگس اپنے اُسی کام کے سلسلے میں شاہدہ کے گھر کی طرف جا رہی ابھی کچھ وقت پڑا تھا اس لئے وہ بڑے سکون سے تانک جھانک کرتی گلی کا موڑ مڑی۔ شاہدہ کے گھر کے باہر کچھ لوگ کھڑے تھے ساتھ والے گھروں کی عورتیں اندر داخل ہو رہی تھیں اُس نے دیکھا کہ عترت اور رشیداں بھی چادریں لپیٹے سہمی ہوئی سی چلی آ رہی ہیں تینوں اکٹھی ہی دروازے کے پاس پہنچیں۔ بجائے کچھ بولنے کے دونوں نے نرگس کی آنکھوں میں دیکھا اور گھر کے اندر داخل ہو گئیں۔

صحن میں چارپائی پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی جس پر شاہدہ کی لاش پڑی تھی۔ اُس کا گلا بڑی بے دردی سے کاٹ دیا گیا تھا۔ شاہدہ کی بوڑھی ساس ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز پڑی تھی جبکہ چھوٹا بیٹا جس کو ابھی کوئی سکول سے لایا تھا سکول یونیفارم میں ہی ماں کے پاؤں کے پاس زمین پر سہا بیٹھا تھا۔ ایک بوڑھی عورت نرگس کے کان کے پاس منہ کر کے بولی

شاہدہ کے بڑے بیٹے نے اُسے ذبح کر دیا ہے۔ کام پر گیا اور بٹوہ گھر بھول جانے کی وجہ سے راستے سے ہی واپس آ گیا تھا۔ شاہدہ بیٹھک میں تھی۔ پتہ نہیں ظالم نے کیسے مارا اپنی ماں کو سارے جسم پر چھریوں کے نشان ہیں۔ ہاتھ تو بالکل بوٹی بوٹی ہو رہے ہیں۔ شاید چھریوں کے وار روکتی رہی بیچاری۔

نرگس گھر والوں کو بلانے کے لئے واپس مڑی، بیٹھک کے دروازے کے پاس بجلی کے میٹر کا کارڈ پڑا تھا جس پر اِس مہینے چار بار ریڈنگ درج کی گئ تھی۔

☆☆☆☆

پھانسی

قربِ عباس (لاہور، پاکستان)

جو ابھی ابھی سفید گاڑی یہاں سے گزری ہے، اس میں سوار تین لوگ اس کوشش میں ہیں کہ صبح ہونے سے پہلے سپریم کورٹ تک پہنچ جائیں۔ دورانِ سفر جرم اور مجرم انکا موضوع ہے۔ اس گاڑی کو بہت دور جانا ہے۔ لیکن۔۔۔۔ دھند گہری ہے، بہت گہری ہے۔۔۔ کہ جیسے جہالت ہو۔۔۔ جہالت جیسی گہری دھند میں اس گاڑی کی رفتار بیس کلومیٹر فی گھنٹہ سے ہی کم ہے۔ یعنی بہت آہستہ، بہت سست۔۔۔ بالکل ایسے ہی سست جیسے کسی بدنظم معاشرے کا نظام ہو۔۔۔

عبداللہ ڈرائیور کی آنکھیں دھند کو کاٹ کر سامنے سڑک پر راستہ تلاش کر رہی ہیں۔ ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھے وکیل صاحب اپنے ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے، سمٹے بیٹھے ہیں اور پچھلی سیٹ پر ایس ایچ او دین الٰہی نیم دراز ہے۔

کل عدالت میں کسی کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہے اور یہ تینوں لوگ اس فیصلے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ دلیلوں اور ثبوت میں وزن ہوا تو موت یقینی ہے، لیکن اگر ڈرائیور نے کوتاہی دکھائی اور گاڑی وقت پر نہ پہنچ سکی تو ایک مجرم کی زندگی کے امکانات پکے ہو سکتے ہیں۔

وکیل صاحب نے اپنے اکڑے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑا اور ایک گہری سانس لے کر بہت پُرفکر انداز میں بولے۔۔۔

اکثر سوچتا ہوں۔۔۔ کہ مجرم بڑی سے بڑی سزا سے بھی کیوں نہیں ڈرتا؟'' وہ جرم

سے توبہ کیوں نہیں کر لیتا؟''

پچھلی سیٹ پر لیٹے ایس ایچ او کی آواز جو قدرے بھاری تھی، سنائی دی۔

او جی۔۔۔بے غیرت ہوتے ہیں یہ لوگ۔۔۔۔جرم انکی عادت میں ہے،''ماں باپ کی تربیت ہی ایسی ہوتی ہے۔'' کچھ حرام کھانے کی لت بھی پڑ جاتی ہے۔

وکیل صاحب کو جواب نامعقول لگا، انھوں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو ایس ایچ او سگریٹ کی ڈبیا میں سے سگریٹ نکال رہا تھا۔

گاڑی میں دیا سلائی جلتے ہی مٹیالی روشنی پیدا ہوئی، جس میں ایس ایچ او کا کالا چہرہ واضح دکھائی دینے لگا۔

سگریٹ جلانے کے بعد وہ بولا:

او جی ہم نے بڑے بڑے کمینوں کو مارا ہے۔ جب ڈپٹی صاحب ہوتے تھے تھانے میں تو سیدھا ''اِن کاونٹر'' ہوتا تھا۔

اس نے بات کہہ کر کش لگایا، دھواں باہر چھوڑا جو کہ ایک قہقہے نے غائب کر دیا۔

ایک دفعہ جی۔۔۔۔ میں نے بڑے مشہور قاتل کو پکڑا۔ حرامزادے نے نو قتل کیے ہوئے تھے۔ کسی کے ہتھے نہیں چڑھتا تھا۔ پکڑ لیا۔۔۔ وہ دو راتیں تھانے میں رہا۔۔۔ اس کے آڈر آ گئے۔۔۔ آڈر سرکاری نہیں۔۔ ڈپٹی صاحب کے۔۔۔ ہم موٹر وے کے پار اسے لے گئے اور وہاں جا کر اُسے کہا بھاگ جا۔۔۔ اتنا کمینہ تھا۔۔۔ بولا تم مجھے مارنے آئے ہو۔ میری زندگی لینے۔ اور میں تمھارا ہی حکم مانوں؟ نہیں بھاگتا۔۔۔ سینے پر گولی مارو۔۔۔

ہم نے تو کام ہی کرنا تھا جی۔۔۔ بس میں نے گولی چڑھائی اور کنپٹی پر پستول رکھ کر بولا کہ چل فیر۔۔۔۔ پڑھ لے کلمہ۔

اس بے غیرت کی آنکھوں میں ڈر نہیں تھا۔۔۔ بولا کس کا کلمہ؟ جس سے زندگی مانگی اور دے نہیں سکا؟ کہانیاں نہ ڈال سیدھی گولی مار اور ختم کر قصے کو۔

''لو جی۔۔۔ میں نے گھوڑا داب دیا۔۔۔ اسکا بھیجا نکل کر وہ پار دوسرے بنے پر گرا۔

ایس ایچ او نے بات ختم کرتے ہی ایک قہقہہ لگایا۔۔۔ وکیل صاحب کا بے تاثر چہرہ

اُٹھا اور اندھیر میں اسکا منہ تلاش کرنے لگا۔ ڈرائیور دونوں ہاتھوں میں سٹیرنگ تھامے نظریں سامنے گاڑے دھند میں راستہ تلاش کر کے گاڑی کو رفتہ رفتہ آگے لیے جا رہا تھا۔

لو جی ایک ہور سنو۔۔۔ ہم نے تین لوگوں کے اِن کاونٹر کیے۔ لاشیں اُٹھا کر تھانے کے صحن میں رکھ دی۔ سردیوں کے دن تھے۔۔۔ ہوا کیا جی۔۔۔ رات کوئی ایک بجے کا وقت تھا۔ ہم کمرے میں بیٹھے ہیٹر سیک رہے تھے اور اِن لاشوں میں سے ایک اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ایس ایچ او نے ایک بھر پور قہقہہ لگایا، وکیل صاحب نے ایک مرتبہ پھر اُسکے تاثرات دیکھنے کی کوشش میں اپنی گردن پیچھے گھمائی۔

اِدھر تو سب نے شور مچا دیا۔ بندے کو چار فیر لگے تھے جی۔۔۔ اور جب وہاں سے اُٹھا کر لائے تھے تو مرا ہوا تھا۔۔۔ اب مرا ہوا بندہ اُٹھ کھڑا ہو۔۔۔ تو بڑے بڑوں کا مُوت نکل جاتا ہے۔ ادھر تو بھگل مچ گیا۔ میں نے فیر بندوک لی اور پہلے ایک فیر کیا۔۔۔ وہ اسے لگا نہیں۔ دوسرا کیا تو سیدھا سینے پر لگا۔ لو جی دوبارہ مر گیا، حیرانی کی بات ہے جی۔

وکیل صاحب کے منہ سے صرف ''ہوں'' نکلا اور وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

گاڑی گہری دھند کاٹتے ہوئے بہت سست روی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ وکیل صاحب نے اپنے ہاتھوں کو گرم کرنے کے لئے آپس میں رگڑا اور بولے:

دیکھو کل کیا ہوتا ہے۔۔۔ اس بندے کو پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔ پاگل پن کی ایکٹنگ کرتا ہے، ''دراصل وہ پاگل نہیں ہے۔''

وکیل صاحب کے فوراً بعد ایس ایچ او بولا:

''جی جی۔۔۔۔ یہ حرامی لوگ ہوتے ہیں جی۔۔۔ مکر کرتے ہیں بین چو۔۔۔۔

ڈرائیور جو کافی دیر سے ساکت و خاموش تھا اور آنکھیں بڑی کیے، سٹیرنگ پر جھکے دھند میں سے راستہ تلاش کرتے آگے بڑھ رہا تھا، حرکت میں آیا۔ اس نے بیک ویو مرر میں سے ایس ایچ او کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن پیچھے بالکل اندھیرا تھا۔ پھر اپنی کمر کو سیٹ کے ساتھ ٹکا کر بولا:

''سر جی۔۔۔ کیا پھانسی۔۔۔ مجرم کے ساتھ ساتھ جرم کو بھی مار دیتی ہے؟''

اس نے سوال وکیل صاحب سے پوچھا تھا، وکیل صاحب نے اس کی بات سنتے ہی

ہاتھ بغلوں میں دبائے اور بولے:

کہاں مرتا ہے جرم۔۔۔ جرم تو باقی رہتا ہے، اتنی پھانسیاں ہوتی ہیں۔قتل، زنا، چوریاں تو پھر بھی ہوتے رہتے ہیں۔ جرم تو اپنی جگہ پر رہتا ہے،بس مجرم ہی مرتا ہے۔

سر جی۔۔۔میں نے اپنی زندگی میں بس ایک ہی پھانسی دیکھی ہے۔ بڑی عجیب۔۔۔ بہت ہی ڈراونی پھانسی۔۔۔اور میں جب بھی اُس کے بارے میں سوچتا ہوں تو دن کی روشنی میں بھی ڈر لگنے لگتا ہے۔

وکیل صاحب ڈرائیور کی بات سُن کر اس کی جانب کھسکے:

''اچھا؟ایسا کیا تھا اس پھانسی میں؟''

بہت بھیانک تھی سر جی۔

میں نے بی اے پاس کرنے کے بعد بہت جگہ کام کیا۔ میری کسی سے بنتی نہیں تھی۔ ہر بار نوکری سے نکال دیا جاتا تھا اور پھر نوکری آسانی سے ملتی بھی کہاں ہے۔ دوستوں یاروں نے مشورہ دیا کی ٹیکسی لے لوں۔ میں نے قسطوں پر ایک ٹیکسی لے لی۔ دن چلاؤں رات چلاؤں اپنی مرضی ہوتی تھی۔ ٹیکسی کی سواریاں بھی کم ہی ہوتی ہیں۔ مجھ سے زیادہ تو رکشے والے کما لیتے تھے۔

پر پھر بھی دن میں کوئی پانچ سات سواریاں بھی مل جائیں تو اچھی دھاڑی لگتی تھی۔ زیادہ وقت فارغ رہتا تھا۔ میں نے اڈے پر ایک چھپڑ ہوٹل پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ کبھی اخبار پڑھ لیتا تھا کبھی ٹی وی پر خبریں سن لیتا تھا، سواری آگئی تو اسے اسکی جگہ پر پہنچا کر واپس وہیں پر بیٹھ جاتا تھا۔

اتنا کہہ کر ڈرائیور خاموش ہو گیا، وکیل صاحب ڈرائیور کی خاموشی دیکھتے ہوئے بولے:

''اچھا تو پھر۔۔۔؟تم پھانسی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔''

جی سر جی۔ میں نے اُسے اسی اڈے پر دیکھا تھا۔ وہ تب ہوگا کوئی پانچ سال کا۔ گرمیاں تھیں۔

جب وہ ناریل بیچ رہا تھا۔ رات کے ایک بجے۔

ایک بندے نے کرنڈی کا سوٹ پہنا ہوا تھا، ہاتھ میں بیگ تھا۔ بڑی جلدی میں تھا۔ بس کی طرف تیز قدموں سے چلتا ہوا جا رہا تھا کہ اس بچے سے ٹکر ہوگئی، سارے ناریل نیچے گر گئے

، بچے نے ناریل اُٹھائے اور پلیٹ میں رکھے، جس ہوٹل کے بینچ پر میں بیٹھا تھ ساتھ ہی ٹونٹی سے دھونے لگا۔

سر جی ۔۔۔اُس رات میں نے اس کے منہ پر جو نیند اور بھوک دیکھی تھی، وہ میں نہیں بھول سکتا۔

کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔

وکیل صاحب نے سر اثبات میں ہلایا:

ٹھیک کہتے ہو۔۔۔نیند اور بھوک ایسی ظالم چیزیں ہیں جو اپنی ضد منوا کر رہتی ہیں۔ جب تک کھاؤ گے نہیں چین نہیں آئے گا، جب تک سو نہیں جاؤ گے تو تکلیف میں رہو گے۔ ان سے پیچھا نہیں چھڑوایا جا سکتا۔ اچھا پھر؟

ڈرائیور نے دوبارہ بولنا شروع کیا:

پھر کیا جی۔ اس دن کے بعد وہ بچہ میری نظر میں آ گیا۔ پہلے کبھی میں نے غور نہیں کیا تھا، لیکن پھر تو اخبار یا ٹی وی کی طرف میری توجہ اس وقت جاتی جب وہ ارد گرد نہیں ہوتا تھا۔ گرمیاں گزر گئیں۔ سردیاں آ گئیں۔ اور وہ انڈے بیچنے لگا۔ ایک ایک سواری کے پیچھے بھاگتا اور منتیں کرتا۔

وکیل صاحب نے ڈرائیور کی بات کاٹی:

''اس کا باپ نہیں تھا؟''

کہتے ہیں جی نشے کرتا تھا۔ مہینے پہلے کہیں سے اسکی لاش ملی تھی۔ پہلے تو اُن کے پاس رہنے کو چھت تھی لیکن جب کرایہ نہ دیا تو مالک مکان نے سامان اٹھا کر باہر پھینکا اور انھوں نے اڈے میں ہی ایک طرف پڑے خالی کنٹینر کو اپنا گھر بنا لیا۔

میونسپل کمیٹی والے آئے تو اُنھوں نے پہلے آرام سے خالی کرنے کو کہا، تین چار دن جب کنٹینر خالی نہیں کیا تو بستر گھڑی برتن اٹھا کر باہر مارے۔۔۔اور کنٹینر کو کرین کے ساتھ وہاں سے اٹھا کر جانے کدھر لے گئے۔ پھر وہ انہی سردیوں میں ایک کھوکھے کی اڑ میں بیٹھنے لگے۔

ماں تھی کہ چھوٹی سی بچی کو گود میں لٹائے، سر پر ڈوپٹہ باندھے دیوار سے لگ کر بیٹھی رہتی

اور کھانستی رہتی۔ وہ اُبلے انڈے بیچتا پھرتا۔ روٹی کے وقت پر روٹی لیتا جا کر ماں کو کھلاتا خود کھاتا۔
پھر ایک دن اسکی ماں کو خون کی اُلٹی آئی اور اسکی کھانسی چپ ہوگئی، پر بہن نے رونا شروع کر دیا۔

دن رات روتی رہتی تھی۔ وہ اُسے وہیں لٹا کر آس پاس انڈے بیچتا رہتا، نظر اُسکی ایک جگہ ہی ٹکی رہتی تھی۔ انڈے نکال کر دیتے ہوئے، پیسے پکڑتے ہوئے۔ گاہک کے بلانے پر اس کے پاس جاتے ہوئے۔۔۔اسکی نظر اسی کھوکھے کی طرف رہتی تھی جہاں بہن کو لٹا کر آتا تھا۔ اس کے گاہک کچھ کم ہو گئے تھے۔

ایک دن میرے ساتھ بیٹھے بندے نے اُسے بلا کر پوچھا انڈا کتنے کا ہے؟ اس نے پیسے بتائے تو وہ بندہ کہنے لگا ایک دے دو۔ جب برتن میں سے انڈا نکالا تو اُسکا چھلکا کہیں سے اترا ہوا تھا کہیں سے لٹک رہا تھا۔ چھلکے کی چھوٹی دراڑوں میں جگہ جگہ میل پھنسی ہوئی تھی۔ اتنا غلیظ انڈا کون لینا چاہے گا جی؟ کون کھائے گا؟ بندے نے اس سے پیسے واپس لیے اور انڈا نہ خریدا۔

میں بھی ہوتا تو یہ کام ہی کرتا۔۔۔پر پیسے واپس نہ لیتا۔

کچھ مہینے بعد وہ روٹی مانگ کر کھانا سیکھ گیا تھا۔ جو مسافر ہوٹل پر کھانا کھانے بیٹھتے تو پہلے انہیں انڈا بیچنے کی کوشش کرتا وہ نہ مانے تو کہتا صاحب روٹی کھانی ہے، کئی خدا ترس لوگ ہوتے تھے جو اُسے روٹی لے دیتے تھے۔

اب بس ایک ہی خرچہ تھا کہ وہ بہن کے لئے دودھ خریدتا تھا اور اسکی بہن، کبھی چپ نہیں ہوتی تھی، روتی رہتی تھی روتی رہتی تھی۔۔۔وہ چپ کروانے کی کوشش میں رہتا تھا، لیکن اس سے کہاں چپ ہوتی تھی۔

وہ جو اڈا تھا نہ سر جی۔ اس کے پاس ہی ایک طرف چھوٹا سا پارک تھا، جہاں پھول لگے ہوئے تھے، گھاس۔۔۔اور ارد گرد گرل لگی ہوئی تھی۔ وہاں پر کچھ اور بچے بھی آ کر رہنے لگے تھے۔ اسی جیسے بچے۔ کوئی ٹافیاں بیچتا تھا، کوئی نمکو دال۔ کوئی بچوں کے چھوٹے چھوٹے کھلونے اور کئی بھیک بھی مانگتے تھے۔

اسی پارک میں جہاں گورمنٹ نے پھول لگائے تھے وہاں پر کئی پوڈری رات کو آ کر

لیٹ جاتے، نشے کے ٹیکے لگاتے۔اور پڑے رہتے۔

خیر جی۔۔۔ان دنوں میں اسی طرح کی سردی تھی، دھند بھی بڑی ہوتی تھی۔کچھ دن دھوپ نکلی، لیکن پھر بارشیں ہونے لگیں۔

اس کے بعد وہی دھند اُتر آئی۔ایک رات میں چھپڑ ہوٹل پر بیٹھا چادر لپیٹ کر چائے پی رہا تھا کہ دیکھا اسکی بہن بہت رو رہی ہے۔وہ ہوٹل والے کے پاس آیا اور اس سے دودھ مانگنے لگا۔ہوٹل والے نے انکار کیا تو میرے جی میں آیا کہ میں لے دوں دھیان جیب کی طرف گیا تو یاد آیا کہ جو پیسے جیب میں تھے اُسکی چائے لے کر پی چکا ہوں اور اب خود کسی سواری کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔خیر وہ واپس جا کر اسے پھر چُپ کروانے لگا،اتنے میں مجھے ایک سواری مل گئی، میں نے اس سے پیسے طے کیے اور کہا مہربانی ہوگی اگر کچھ ابھی دے دو۔

پیسے لے کر ہوٹل والے سے کہا کہ کسی کے ہاتھ بچے کو دودھ پہنچا دے۔خود سواری لے کر چلا گیا۔

ڈرائیور خاموش ہو گیا۔دھند کچھ زیادہ گہری ہو چکی تھی۔اسکی نظریں راستہ تلاش کرتے کرتے تھک رہی تھیں، بوجھل پن اسکے چہرے پر واضح دکھائی دے رہا تھا۔

وکیل صاحب کچھ وقت کے لیے تو اسکے بولنے کا انتظار کرتے رہے پھر بولے:

"لیکن اس سارے واقعے میں پھانسی کا ذکر کہاں ہے۔۔۔ سے پھانسی کیوں ہوئی؟"

ڈرائیور سوال سن کر کچھ پل کے لیے چپ رہا پھر کہنے لگا:

سر جی۔پھانسی سے پہلے کیا ہوا وہ سنیں۔میں نے اس رات سواری اتاری اور پھر گھر چلا گیا۔اگلے دن دوبارہ اڈے پر آیا تو وہ بالکل چپ تھا۔اس کے منہ پر اُداسی تھی۔اس کے منہ پر وہ نیند نہیں تھی، وہ بھوک نہیں تھی۔بس اُداسی تھی۔وہ بیٹھا ایک بت سا لگ رہا تھا۔اس کے آس پاس اسکی بہن نہیں تھی۔وہ مر گئی تھی۔

گاڑی کے سامنے دھند کا ایک دیو سا ظاہر ہوا، ڈرائیور نے بریک دبائی۔گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور پھر اسی سست رفتار سے چلنے لگی۔

پھر سر جی ۔ میں کئی مہینے وہاں پر رہا۔ اس نے انڈے بیچے نہ ہی ناریل ۔ بس وہ اُداس منہ لے کر کبھی کہیں بیٹھا نظر آتا کبھی کہیں ۔ اس کے کپڑے میلے ہونے لگے۔ اسکے بال بڑھنے لگے۔ کبھی ہنسانہ مسکرایا۔ بس جہاں بیٹھا ہوتا، سامنے گھورتا رہتا۔ ایک سردی میں اسے سخت بخار بھی ہوا۔۔۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ رکھ کر زور زور سے کھانستا، دوسرے ہاتھ سے گلے کو پکڑ لیتا۔۔۔ سردی سے ٹھٹھرتا رہتا۔۔۔ کانپتا رہتا۔۔۔ لیکن منہ پر اُداسی اسی طرح رہتی۔ شکل میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ میں اُسے دیکھنے کے سوا کیا کر سکتا تھا؟ بس ایک طرف بیٹھ کر دیکھتا رہتا تھا۔

میں جب تک وہاں رہا میں نے اسی حال میں اُسے دیکھا۔ پھر جب مجھے نوکری مل گئی تو میں نے ٹیکسی چلانی چھوڑ دی۔ پر وہ ایک نوکری چھوڑ، تین جگہ کام کیا۔۔۔ جیسے پہلے نہیں بنتی تھی تب بھی کسی سے نہ بنی تو نوکریاں چھوڑتا رہا۔ آخر سات سال کے بعد دوبارہ پرانے کام کی طرف آ گیا۔ ٹیکسی چلانی شروع کر دی۔ اس بار جب میں اڈے میں آیا تو وہ بالکل بدل چکا تھا۔

نہیں بلکہ اسکا صرف قد ہی لمبا ہوا تھا باقی منہ پر وہ اداسی اسی طرح تھی۔ اداسی کی تو ایک شکل ہوتی ہے جی۔ نہ عمر بڑھتی ہے نہ ہی شکل بدلتی ہے۔ اسکی شکل تو اپنی تھی بھی نہیں۔ اداسی اسکی شکل ہو گئی تھی اور وہ سات سال کے بعد بھی مجھے ویسا ہی نظر آیا۔ اسکے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، غلیظ ہو گئے تھے، پاس سے گزرتا تھا تو بدبو آتی تھی۔ بال بڑھ چکے تھے اور یوں لگتا تھا کہ جیسے مٹی میں سر دے کر آیا ہے۔ اسی طرح تھا کسی سے بات نہیں کرتا تھا بس چپ چاپ گھومتا رہتا تھا یا بال کھجاتا رہتا تھا۔ انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر انگوٹھے گھماتا رہتا تھا۔

وہاں پر جو پارک بنایا تھا اس کے اندر اب گھاس نہ پھول۔۔۔ جو لوہے کی گرل تھی وہ بھی وہاں نہیں تھی۔ بس کیاریوں میں ٹھیکے پڑے ہوئے تھے اور ان ٹیوں کی طرح نشئی۔ اڈے پر گاڑیوں کا شور بڑھ گیا تھا، سڑک زیادہ ٹوٹ چکی تھی، بھیک مانگنے والے بچے بڑھ گئے تھے، چھوٹی موٹی چیزیں بیچنے والے بھی زیادہ تھے۔ بھوک بھی بڑھ گئی تھی اور نشئی بھی۔ وہ بھی ان نشئیوں کے ساتھ ویسا ہی لگتا تھا۔ میرا خیال ہے نشہ نہیں کرتا تھا۔ ہاں وہ نشہ نہیں کرتا تھا۔

ڈرائیور بات کرتے کرتے اس وقت رک جاتا جب دھند گہری ہوتی، ڈرائیور کی

آواز ختم ہوتی تو ایس ایچ او کے خراٹے واضح سنائی دینے لگتے۔ وہ ہر بات سے بےفکر گہری نیند سو رہا تھا۔

ڈرائیور نے سامنے والے دھندلے شیشے پر کپڑا پھیر کر اسے صاف کیا اور بولا:

سردیاں ہی تھی جب میں نے دوبارہ ٹیکسی چلانی شروع کی تھی، عجیب کام ہوا۔۔۔

وہاں کے چھوٹے بچے ایک ایک کر کے مرنے لگے۔ ایک دن پہلے چنگے بھلے ہوتے اگلے دن صبح ان کا پھولا ہوا جسم فٹ پاتھ پر پڑا ہوا ہوتا تھا۔ ہفتے میں ایک آدھی لاش اُٹھا کر دو چار لوگ پاس کے قبرستان میں دفن کر آتے تھے۔ پر سب کے اندر ایک خوف سا تھا کہ ایسی کیا بیماری آ گئی ہے کہ جو ایک رات میں بچے کو نگل جاتی ہے اور صبح لاش پھول کر اتنی خوفناک ہو جاتی ہے اور صرف بچے ہی کیوں مرتے ہیں؟

کام بڑھتا گیا، فٹ پاتھ پر بچے گھٹتے گئے۔ لوگوں کو زیادہ خوف آنے لگا۔

پر سر جی۔۔۔ اسکے منہ پر وہی اُداسی رہی۔ اسکی شکل بدلی نہ انداز۔ اُس نے کسی سے بات کی نہ کسی سے کچھ مانگا۔

بس پھر ایک صبح میں اڈے پر چائے پی رہا تھا کہ اچانک شور مچا۔ ایک رش سا لگ گیا، میں بھی پیالی رکھ کر اس رش میں چلا گیا۔ تو وہ وہاں پر اُلٹا پڑا ہوا تھا اور لوگ اسے لاتیں مار رہے تھے۔ اسے کسی نے بچے کو ٹیکا لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔۔۔

وکیل صاحب چونک گئے:

''اوہ مائی گاڈ۔۔۔ بچوں کو وہ مار رہا تھا؟''

جی سر جی۔ وہ ان فٹ پاتھ کے بھوکے ننگے بچوں کو ٹیکے لگا کر مارتا رہا۔ کئی بچوں کی جان لی، کئی دلوں میں خوف بھر دیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ لوگ اسے اس لیے نہیں مار رہے تھے کہ اس نے بچوں کی جان لی، اس لیے مار رہے تھے کہ اس نے انھیں ڈرایا بہت تھا۔

اس دن مجھے پتہ چلا کہ ان لاوارث بچوں کے کتنے وارث ہیں۔

پورا اڈا ہی ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے ان بچوں کا ماں باپ ہے۔ وہ چپ چاپ مار کھا رہا

تھا۔ نہ کوئی آواز نہ کوئی چیخ۔۔۔اسے لوگوں کی لاتوں کی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔لگتا تھا کہ وہ کسی بوری کو مار رہے ہیں۔ اس کے منہ سے، ناک سے کان سے خون نکل رہا تھا۔ پر اسکے منہ پر وہ اداسی اسی طرح تھی۔

پھر سر جی۔ اس فٹ پاتھ سے مارتے ہوئے، گھسیٹتے ہوئے لوگ پارک میں لے آئے۔ میں دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، دیکھتا رہا۔ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

گالیوں کے شور میں سے ایک آواز آئی۔۔

اس حرامزادے کو لٹکا دو تا کہ سب کو پتہ چلے کہ بچوں کا قتل کرنے کی سزا کیا ہوتی ہے۔

میرے پورے وجود میں ایک لہر سی اٹھی، اور خود سے کہا بول۔۔۔عبداللہ۔۔۔اب تو کچھ بول۔۔۔اتنے سالوں سے چپ ہے اب ہی بول پڑ۔۔۔

پر سر جی بولا نہیں گیا۔

اس شور کو دیکھ کر اس ہنگامے کو دیکھ کر میرے منہ پڑ تالہ سا لگ گیا تھا۔ میں چپ تھا۔۔۔اور سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ رسہ بھی آ گیا، سامنے پارک میں لگے ہوئے پول کے ساتھ باندھ بھی دیا گیا اور اس بدنصیب کو گھسیٹ کر اسی طرف لے جانے لگے۔ اس نے سر اٹھایا اور سامنے لٹکتے پھندے کو دیکھا جو ابھی کچھ دور تھا اور پھر اسکی نظریں ادھر ہی جم گئیں۔

ابھی دو قدم پیچھے ہی تھے کہ اس کا بے خوف چہرہ ایک طرف ڈھلک گیا۔۔۔جسم بے جان ہو گیا۔۔۔

گاڑی میں ایس ایچ او کے خراٹوں سے بھی زیادہ اونچی دو آہیں سنائی دیں۔

جن لوگوں نے اسے پکڑا ہوا تھا وہ رک گئے۔

ایک بولا یہ تو بے ہوش ہو گیا۔۔

دوسرے نے اس کو زمین پر لٹایا اور کہا مر گیا ہے۔۔۔

تیسرا رش میں سے نکل کر آگے آیا اور بولا۔۔۔مکر کر رہا ہے مادر چو۔۔۔

چوتھا بولا اسے لٹکاؤ، تا کہ سب کو پتا چلے کہ انجام کیا ہوتا ہے۔ شور پھر بڑھنے لگا۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا، کوئی کچھ۔۔۔اور میں ایک طرف کھڑا چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔

اس بے جان جسم کو اٹھایا اور اسے رسے کے ساتھ لٹکا دیا۔

عجیب پھانسی تھی سر جی۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سامنے اداسی کی شکل والی لاش۔۔۔ جو رسے پر جھول رہی تھی۔۔۔ کس کی تھی؟

مجرم کی۔۔۔؟

جرم کی۔۔۔؟

بھوک کی۔۔۔؟

نیند کی۔۔۔؟

یا۔۔۔ یا۔۔۔ انصاف کی۔۔۔؟

ڈرائیور نے آخری الفاظ ادا کرنے کے بعد گاڑی کو سڑک کے ایک کنارے پر لا کر بریک لگائی اور پیشانی سٹیئرنگ پر ٹکا دی۔۔۔ پچھلی سیٹ پر ایس ایچ او کے خراٹوں کی آواز ابھی تک اسی طرح آ رہی تھی۔ وکیل صاحب کافی دیر تک ڈرائیور کی طرف تکتے رہے۔ اور پھر بولے:

''گاڑی کیوں روک دی؟''

ڈرائیور نے سر اٹھایا اور سامنے دیکھتے ہوئے بولا:

''سر جی۔۔۔ اب گاڑی اور آگے نہیں چل سکتی۔۔۔ دھند بہت زیادہ ہے۔۔۔''

☆☆☆☆

حرافہ

قمر سبزواری (دبئ، یو اے ای)

شازیہ ہونقوں کی طرح اپنے خاوند جاوید کا منہ دیکھتی رہ گئی۔۔۔
حرافہ۔۔

سالی بازاری عورت کی بیٹی،۔۔

تیری ماں کی۔۔۔۔۔

میرے ساتھ تمسخر کرتی ہے۔۔۔۔۔۔فاحشہ۔

جاوید۔۔۔میں تو۔۔۔

آپ میری ماں کو۔۔۔۔

شازیہ کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

ہاں تو کیا کہوں کتیا کی بچی، ایک کتیا کو انسان کتیا نہ کہے تو کیا کہے، حرافہ، حرافہ، حرافہ۔۔۔

ایک بار نہیں سو بار کہوں گا۔۔۔

وہ ایک ہی سانس میں ایسے شازیہ اور اُس کی ماں کو مغلظات بکے جا رہا تھا جیسے بہت دنوں سے یہ غلیظ القاب و آداب اُس کے حلق میں جمع تھے اور اُسے بس کسی موقع کی تلاش، کسی ہلکے سے بہانے کی ضرورت تھی۔

شازیہ کے کان بند اور دماغ ماؤف ہو چکا تھا، وہ ہونقوں کی طرح چند لمحے اپنے خاوند کے تیز تیز ہلتے لبوں اور آنکھوں سے نکلتے شعلوں کو دیکھتی رہی اور پھر مٹھیاں بھینچتی ہوئی خودکار انداز میں اٹھ کر بیڈروم سے نکل گئی۔

کرب، خوشی، پیار، دکھ، تکلیف۔۔۔جذبات کا فقط احساس کیا جا سکتا ہے ان کا اظہار کرنے سے یہ کبھی بیان نہیں ہوتے۔

شازیہ کو جاوید کے منہ سے اپنی ماں کے لئے ایسی گالیاں سن کر جو اذیت ملتی تھی اُس کا وہ فقط احساس ہی کر سکتی تھی، اُس کیفیت کا اظہار ممکن نہ تھا۔ کاش وہ جاوید کو احساس دلا سکتی، جواب دے سکتی۔۔۔لیکن جواب۔۔۔وہ جاوید کو جانتی تھی وہ واپس بولنے یا جواب دینے کو اپنی آخری درجے کی توہین سمجھتا تھا اور ایسی صورت میں طلاق پر ہی رکتا۔۔۔۔

طلاق۔۔۔۔نہیں طلاق کیوں۔۔۔۔

وہ چاہتی تھی کہ جاوید کو اُس کیفیت کا احساس ہو، وہ بھی اُس کرب کو محسوس کرے جس سے وہ گزرتی تھی لیکن اِس کے باوجود جب اُسکی آنکھوں میں آنسو اُمڈنے لگتے تو وہ اپنے زیریں ہونٹ کا اندرونی حصہ دانتوں تلے دبا کر اپنے آنسوؤں کو روک لیتی، کم از کم اُس وقت تک جب تک وہ جاوید کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔۔۔

شازیہ کو یہ تو گوارا تھا کہ وہ اس اذیت کے خاتمے کے لئے جاوید کے خود بخود سدھر جانے یا اُس کو سدھارنے کا کوئی طریقہ ہاتھ آنے تک کے وقت کا انتظار کر لے لیکن اُسے یہ گوارا نہیں تھا کہ جاوید کے سامنے اُسی کے بےبسی کے آنسو نکل پڑیں اور جاوید ترس کھا کر اُس کے ساتھ اپنا برتاؤ تبدیل کرے۔

وہ بچپن ہی سے ایسی تھی، پاپا جب اُسکی ماں کو گالیاں دیتے تھے تو وہ کبھی اپنے روم میں جا کر پاپا کے دیئے ہوئے کھلونے توڑ دیتی اور کبھی اپنی نوٹ بک پر اتنی زور زور سے پین چلاتی کہ صفحے آڑھی ترچھی لکیروں سے کالے ہو کر تار تار ہو جاتے۔۔۔

لیکن وہ پاپا کو کچھ کہہ نہ پاتی، وہ اپنی ماں کو گالیاں نہ دینے کے لئے اپنے باپ کی منتیں نہیں کر سکتی تھی۔۔۔

حالانکہ جب پاپا اُس کے اور اُس کے چھوٹے بھائی عاصم کے ساتھ کرکٹ کھیلتے ہوئے عاصم کو بازو گھما کر گیند پھینکتے اور شازیہ کی طرف لڑھکتی ہوئی گیند پھینکتے تو وہ تھوڑا سا موڈ بناتی اور پھر واپس کھیلنے لگتی۔۔۔۔

بات یوں ہے کہ عورت کو کسی بھی عمر میں مرد کے مقابل نازک یا کمزور سمجھا جائے تو وہ سہہ جاتی ہے لیکن کم تر یا حقیر سمجھا جائے تو وہ یقینی طور پر پلٹتی ہے اور چاہے مار کھائے یا پامال ہو جائے ایک بار ضرور وار کرتی ہے۔

پاپا کے ساتھ تو پھر بھی ایسا کچھ چل جاتا لیکن جاوید کے ساتھ تو بالکل نہیں۔۔

شادی کے دوسرے روز سے ہی وہ جاوید کو اپنا حق اپنا حصہ سمجھتی تھی، رشتے کا ایک مان ہوتا ہے کسی کے جسم و جان کی ضرورت بن جانے کا اپنا ایک غرور ہوتا ہے اور اسے یہ بالکل گوارا نہ تھا کہ اُسے اپنا حق بھی بھیک میں ملے۔

جاوید شہر میں پیدا ہونے کے باوجود مزاج میں کہیں کہیں اپنے جاگیردار دادا سے مشابہ تھا۔

اس کے پاس اپنے دادا کی طرح زمین جائیداد تو نہ تھی لیکن مزاج میں وہی انا پرستی اور دوسروں کو اپنا مزارعہ سمجھنے کی عادت سی تھی، اُن کی طرح شکار کھیلنے تو نہ جا سکتا تھا لیکن گھر میں ایک بندوق ضرور رکھی ہوئی تھی جسے ہر ماہ باقاعدگی سے چمکا کر واپس بیڈروم کی دیوار پر لٹکا دیا جاتا۔

جاوید اپنے دادا کی طرح بلانوش تو نہیں تھا لیکن کبھی کبھی اپنی مما سے چھپا کر اور شازیہ کو ڈاکٹر کی طرف سے تجویز کردہ بتا کر ایک آدھ بوتل لے ہی آتا تھا، دادا عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے تھے جاوید اپنے تئیں بیوی کو ایک برتن کی حیثیت دیتا تھا۔

شازیہ کی ساس کے مطابق جاوید کے دادا بھی بہت سخت مزاج اور ضدی تھے لیکن جب جنسی ضروریات کی تسکین کی بات آتی تو وہ سر پر بٹھانے، پاؤں پکڑنے بلکہ بلک کر معافی مانگنے سے بھی نہ چوکتے۔۔۔۔

اب شازیہ اپنی ساس کو کیا بتاتی کہ جاوید بھی بہت بدزبان، سخت مزاج اور اڑیل تھا

لیکن بستر پر اس کے مطالبات کی فہرست بہت طویل ہوتی جس میں رکاوٹ دور کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کر ڈالتا۔ دادا کو عورت پر صرف سرخ کپڑے ہی اچھے لگتے تھے، جبکہ جاوید شازیہ کو سرخ قمیض اور سفید شلوار بہت شوق سے لے کر دیتا تھا۔

صبح جاوید جب اُس کے ہونٹ چوم کر آفس کے لئے نکلا تو اُس نے اُسے بتایا تھا کہ آج وہ کچھ دیر کے لیے ممی جی کو ساتھ لے کر مارکیٹ جائے گی۔ جاوید نے مسکرا کر یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک اور بوسہ ثبت کیا، باہر جاؤ گی تو میری زیادہ یاد ساتھ رہنی چاہئے۔

لیکن شام کو گھر آتے ہی جاوید کا پارہ کچھ چڑھا ہوا تھا۔

اُس کی وجہ کوئی بھی ہوسکتی تھی، آفس میں کسی کی بات سے توہین محسوس کرنا، تھکاوٹ، گھر میں کوئی بے ترتیبی یا بدنظمی یا شدید جنسی ہیجان جس کی خاطر خواہ تسکین ممکن نہ ہونے کا لاشعوری احساس جاوید کو چڑھ چڑ دیتا تھا۔۔۔

شازیہ یہ تو بھانپ گئی تھی کہ اب جاوید کسی موقع کی تلاش میں ہے لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ احتیاط کر کے اُسے کوئی موقع دیا ہی نہ جائے کیونکہ اگر کوئی وجہ نہ ہوگی تو جاوید اُسی اکتاہٹ سے تلملا اُٹھے گا کہ سب کچھ پھیکا پھیکا اور جامد سا کیوں ہے اور وہی ہوا۔۔

شازیہ نے جاوید کی خوشامد کے لئے ہلکا سا مسکراتے ہوئے چھیڑ خانی کے انداز میں پوچھ لیا۔

کیوں حضور، نصیب دشمناں آج جناب کا منہ کیوں پھولا ہوا ہے۔

حرافہ، سالی بازاری عورت کی بیٹی۔۔

تیری ماں کی۔۔۔۔میرے ساتھ تمسخر کرتی ہے۔۔۔۔۔فاحشہ۔

جاوید۔۔۔میں تو۔۔۔۔آپ میری ماں کو۔۔۔۔

شازیہ کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

ہاں تو کیا کہوں کتیا کی بچی، ایک کتیا کو انسان کتیا نہ کہے تو کیا کہے، حرافہ، حرافہ، حرافہ۔۔۔۔

ایک بار نہیں سو بار کہوں گا۔۔۔

کبھی کبھی شازیہ کو لگتا وہ جو چاہتا ہے وہ کر نہیں پاتا اس لیے چڑ جاتا ہے، کبھی وہ سوچتی اُس کو جو چاہیے وہ اُس کو مل نہیں پاتا اس لئے وہ بگڑ جاتا ہے۔ اسی تذبذب میں شازیہ کبھی بہت کھل جاتی اور کبھی بالکل ملفوف ہو جاتی۔ جب وہ شیرنی کی طرح اُس کے آس پاس چکر لگاتی تو جاوید کے باڑے میں بندھا ہوا سانڈھ ایک چھوٹی سی بلی بن کر میاؤں میاؤں کرنے لگتا اور اگر وہ ایک گدھی کی طرح کان لٹکا کر سر نیہوڑائے اپنی پیٹھ پیش کرتی تو وہ جھنجلا کر اُس پر برس پڑتا۔

جاوید بہت بُرا سا منہ بنائے، لائٹ آف کئے بیڈروم میں بیٹھا تھا، شازیہ جانتی تھی کہ اب وہ اپنا حق جانتے اس انتظار میں ہے کہ اُسے منایا جائے اور اُس سے معافی مانگی جائے۔ نہ وہ ٹی وی لاؤنج میں آئے گا نہ کھانا کھائے گا نہ باہر واک کے لئے نکلے گا لیکن اگر وہ کچھ دیر اس کی منت کرے گی، معافی مانگے گی تو وہ ایک احسان کر کے راضی ہو جائے گا کیونکہ کل چھٹی ہے اور اُسے شازیہ سے آج رات کو بہت سا کام تھا۔

شازیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جاوید کو بالکل نہ منائے، خود راضی ہوتا ہے تو ہو نہیں ہوتا تو نہ سہی لیکن اُسے پتہ تھا کہ اس طرح بات زیادہ بگڑے گی اور پھر جب تک شازیہ کی ماں آ کر جاوید سے معافی نہیں مانگے گی وہ نہ مانے گا۔ شازیہ کو خود معافی مانگتے ہوئے فقط اپنی انا کو کچلنا ہوتا تھا لیکن جب اماں گھر سے آ کر جاوید سے معذرت کرتی اور جاتے ہوئے، گیٹ کے پاس رُک کر شازیہ کو سرگوشی میں کہتی، بیٹی تو میرا بُرا مت مانا کر، مجھے ساری زندگی تیرا باپ گالیاں دیتا رہا ہے اگر جاوید نے مجھے دو گالیاں دے دیں تو کون سی قیامت آ گئی، تو اُسے لگتا کہ اُس کی انا کی کرچیاں جاوید کے گھر سے نکل کر اُس کے باپ کے گھر تک کے سارے رستے پر بکھر گئی ہیں اور کبھی گلی میں کرکٹ کھیلتے لڑکوں کے درمیان، کبھی سبزی کے ٹھیلے والے کے پاس کھڑی عورتوں کے درمیان اور کبھی پڑوسیوں کے کارپورچ کے باہر کھڑے ہو کر جاوید اور اُس کا باپ وہ ساری کرچیاں اچھال اچھال کر کھیل رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں۔

اُس کی ماں کے جانے کے بعد جاوید اکثر اُسے کہتا، میں تمہاری بات نہیں کر رہا لیکن عورت کی یہی اوقات ہے، پہلے اکڑ دکھائی ہے اور پھر پاؤں میں پڑ جاتی ہے، اکڑ دکھانے کی ضرورت ہی کیا ہے، پہلے ہی عقل کو ہاتھ مار لینا چاہیے ناں۔

وہ کچن میں کھڑی اپنے ساتھ ہی بحث میں الجھی ہوئی تھی۔

شازیہ تیری ماں خود۔ساری زندگی تیرے باپ سے گالیاں سن کر خاموش رہی وہ تیرا کیا دفاع کرے گی تیرا باپ تو اس دنیا میں ہی نہیں ہے، اوہوں۔۔۔ہوتا تو کیا ہوتا، ایک دو وہ بھی بک دیتا اور ممی ایک عورت ہونے کے باوجود تیرے لئے فقط ایک ساس ہے۔

وہ اپنی سوچوں میں گم کبھی شعور کے ساتھ اختلاط کر کے کوئی حل پیدا کرنے کی کوشش کرتی اور کبھی خود کو نفرت کے تاریک گوشے میں سرتاپا برہنہ دھکیل دیتی اسی آمادگی کے دوران کہیں سے ایک قطرہ اُس کی جبلت کے بطن میں ٹپک کر ایک ہی لمحے میں ایک نئی شازیہ کو ٹھرا گیا۔حرافہ۔۔۔۔اچھا تو میں حرافہ ہوں۔۔۔ہاں میں ایک فاحشہ بھی تو ہوں۔۔۔اُس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ رینگ گئی اور اُس کی آنکھوں میں ایک حاملہ عورت کی تسکین ایک غرور سا عود آیا۔۔

وہ دبے پاؤں کچن سے نکل کر بیڈروم کے دروازے سے بچتی ہوئی دوسرے کمرے میں اپنے وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی اُس نے سرخ قمیض اور سفید شلوار پہنی، قمیض کے تینوں بٹن کھلے چھوڑ کر، دوپٹے کو سرکنے کے انداز میں سینے پر ڈالا اور اپنے زیریں ہونٹ کو اپنے دانتوں کے نیچے سے آزاد کر کے آنسوؤں کو راستہ دیتے ہوئے بیڈروم میں داخل ہو گئی۔۔۔

جب ذہن میں کوئی منصوبہ کوئی لائحہ عمل ہو تو انا ساتھ دینے لگتی ہے وہ بلا تامل جاوید کے پاؤں میں بیٹھ گئی۔۔۔۔بات شروع کرنے کے لئے معافی مانگنا ضروری تھا لیکن اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کس بات کی معافی مانگے، بظاہر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔۔۔کیا وہ نامعلوم غلطی کی معافی مانگے یا موڈ خراب ہونے کی وجہ پوچھنے کی معافی مانگے اگر وہ کسی ایسی بات کی معافی مانگے گی جو جاوید کے ذہن میں نہیں ہے تو بھی وہ چیخ اٹھے گا کہ تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ تمہاری غلطی کیا ہے تو تم اپنی اصلاح کیسے کرو گی۔۔۔

اُس نے بات کرنے کی بجائے اپنے آنسوؤں کو اپنے گالوں تک پہنچایا اور غیر محسوس طریقے سے اپنا دوپٹہ سرکا کر اپنے دونوں ہاتھ جاوید کے پاؤں پر رکھ دیئے، وہ اپنے جسم اور جاوید کی ضرورت کو اپنا وکیل بنا رہی تھی۔۔۔

بات یوں ہے کہ جنسی عمل کیسے تکمیل کو پہنچانا ہے یہ مرد کی جبلت میں ودیعت شدہ ہوتا

ہے اگر کسی مرد نے زندگی میں کبھی قربت نہ کی ہو تو تب بھی وہ پہلی رات کو جانتا ہے کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے کچھ یونہی مقاربت کے تجربے سے گزری ہوئی عورت کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی کس ادا کی کیا قیامت ہے اور یہ کیسے وصول کی جا سکتی ہے۔۔۔کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے کہ اکثر عورت کو ادا فروشی کی ابتدائی تربیت وہی مرد دیتا ہے جس کو وہ سب کچھ مفت میں پیش کرتی ہے۔

آج جیسے شیرنی اور گدھی کے انضمام سے ایک نئے حیوان نے جنم لیا تھا، شازیہ جاوید کی آغوش میں دھاڑنے لگتی تو اُس کی بے بسی کو نیچے بیٹھا دیتی اور جب وہ لیٹ جاتی تو سینے میں چبھی ہوئی برچھیاں اُس کو ایک زخمی درندہ بنا کر واپس اُپر لے آتیں، آج جاوید کی حالت دیدنی تھی، وہ یہی تا چاہتا تھ، ایک جوالامکھی ہو لیکن ہو اُس کے قابو میں۔۔۔۔۔ایک اڑیل مست گھوڑی ہو لیکن اُس کے ہاتھوں میں پکڑی باگوں سے زخمی اور بے بس ہو۔۔۔۔۔شازیہ جان گئی کہ جاوید کے چڑ چڑے پن کی کیا وجہ ہے لیکن اُس لمحے اُس پر ایک انکشاف ہو گیا کہ جاوید کے باڑے میں بندھے جانور کو سانڈھ یا بلی بنانا اُس کے ہاتھ میں ہے نہ کہ جاوید کے بس میں۔

جاوید کے نرخرے سے بسمل کی طرح آوازیں نکل رہی تھیں اور پھر اچانک وہ آوازیں بامعنی الفاظ میں بدل گئیں، جاوید آنکھیں بند کئے نشے کے انداز میں زیرِ لب، شازیہ کو گالیاں دے رہا تھا، شازیہ تیرا سحر تو کسی طوائف کی طرح ہے، تیرے جسم میں جیسے سات عورتوں کی گرمی اور نشہ بھرا ہوا ہے، بازاری، رنڈی مجھے نشے میں پاگل کر دے گی کیا۔۔۔۔جوں جوں وہ اُس کو غلیظ ناموں ناموں سے پکار کر دبوچتا، شازیہ کی تسکین بڑھتی جاتی اور اُس کی حالت پہلے سے زیادہ مدہوش ہوتی جاتی۔ یہ گالیاں مختلف تھیں، وہ اپنی بے بسی اور شازیہ کے سحر، اُس کی جوانی کی جولانی کا اقرار اور اظہار کر رہا تھا۔ یہ معین سا فرق کم عمر و نازک اور کم تر و ناقص کے فرق جیسا تھا، یہ ایسے ہی تھا جیسے بچے کے ساتھ باکسنگ کھیلتے ہوئے اُسے مکہ مارو تو وہ ہنستا ہے لیکن غصہ کر کے دو انگلیوں کی چپت بھی لگا دو تو وہ بلکنے لگتا ہے۔

شازیہ نے آنکھیں موندے موندے ہی ہاتھ بڑھا کر بیڈ کے سائیڈ ٹیبل سے جاوید کی چھپائی ہوئی چھوٹی سی بوتل کالی اور ایک گھونٹ حلق میں انڈیل کر باقی جاوید کے منہ کے ساتھ لگا دی۔ وہ جاوید سے بھی کچھ بند آواز میں غرانے لگی، وہ دھیرے سے شازیہ کے کان میں بولا

خاموش نہیں رہو، تم بھی کچھ بولو، کچھ ایسا کہو جس سے آگ پھیلتی جائے۔

صبح جاوید کو آفس بھیج کر شازیہ باتھ روم کا دروازہ لاک کیے بغیر ہی شاور کے نیچے کھڑی ہوگئی۔۔۔اُس کو شاور کے نیچے بھگیتے ہوئے اپنے جوان بدن کا لمس اور بھرپور نظارہ ایک عجیب احساس تحفظ دے رہا تھا۔۔۔

گلی میں بکھری ساری کرچیاں جیسے سینے کے اندر چلی گئی تھیں۔

اس بار اُس نے اپنی ماں کو فون کر کے جاوید کی بدکلامی کا رونا نہیں رو دیا تھا۔

دو تین دن سکون سے گزر گئے جاوید آخری چپقلش کو بھول بھی گیا تھا، اور شازیہ تو۔۔۔کچھ دن پہلے تک جو شازیہ جاوید کو دوائی کے بہانے گھر میں پینے پلانے کا کچھ لانے دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی وہ اب یہ سوچ رہی تھی کہ کیسے جاوید کا دھیان اس طرف لایا جائے کہ وہ ایک اور بوتل لے آئے۔

آج تیسرے چوتھے دن جب شازیہ کی ماں کا فون آیا تو وہ پہلے کی طرح ایک دم پھوٹ پڑنے کی بجائے تحمل سے بات کرتی رہی، ماں نے حال احوال پوچھ کر اُسے قرآن خوانی کے لئے آنے کا کہا۔۔۔شازیہ نے خوش طبعی سے بات کی اور فون رکھ دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

☆☆☆☆

دسترخوان، سالم روٹی اور کہانی

یوسف عزیز زاہد (پشاور، خیبر پختون خوا، پاکستان)

کہنے لگی میں تو اپنے حصے کی روٹی کب کی کھا چکی ہوں۔ اُس کی بات سن کر میں سٹپٹا سا گیا وہ کھلکھلانے لگی اور سارا جنگل مستی میں جھومنے لگا۔ بھوک تو میری بھی مر چکی تھی میں تو بس رسما "ہی اُس کا ساتھ دینے دسترخوان بچھا کر بیٹھ گیا تھا۔

"خان بابا!۔۔۔۔تمہیں یاد پڑتا ہے جب طاعون کی وبا پھیلی تھی تو روزانہ کتنے جنازے اٹھتے تھے؟"

"میری عمر اُس ویلے کوئی داہ دریاں کی تھی چھوٹے میاں۔۔۔۔جنزیاں دی گنتی تا یاد نئیں پر شہر خالی پے گیا تا سڑکاں پر کالیسیاہ موٹے چوہے دوڑ دے۔۔۔کتے دے قد جنے چوہے"

" کن سوچوں میں گم ہو؟

اُس نے بہت نرم لہجے میں مجھ سے سوال کیا تو میں خان بابا کو چھوڑ اُس سے پوچھ بیٹھا"جب طاعون کی وبا پھیلی تب بھی اتنے ہی جنازے اٹھے تھے؟"

اُس نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سامنے رکھی سالم روٹی کے چار ٹکڑے کئے میں نے اپنے سامنے رکھی روٹی کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کرنا چاہا تو اُس نے مجھے ٹوک دیا روٹی کے تین ٹکڑے دئے اور پوٹلی سے گڑ کی ڈھیلی نکال کر مجھے تھمادی۔

" مگر میری بھوک تو مر چکی ہے تم جانتی ہو جب سے شہر پر چوہوں نے یلغار کی ہے میرا کھانا پینا حرام ہو گیا ہے"

وہ کچھ بولی نہیں بس آنکھیں اُٹھا کر سرزنش کے انداز میں میری طرف دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو۔۔۔۔ دستر خوان بچھا ہو تو باتیں نہیں کرتے۔ مگر اگلے ہی لمحے مجھے اپنا یہ خیال رد کرنا پڑا۔ وہ پوچھ بیٹھی

خان بابا کے لئے سالم روٹی دستر خوان میں باندھ آئے ہونا؟

" تم خان بابا کی فکر نہ کرو، روٹی کھا لو ابھی بہت سفر باقی ہے"

" میں تو اپنے حصے کی روٹی کب کی کھا چکی ہوں"

" عجیب چیز ہے؟ " میں سوچنے لگا خود ہی مجھے کہا تھا، بھوک لگی ہے، اور اب روٹی کے تین حصے اور گڑ کی ڈھیلی مجھے دے کر کہتی ہے میں اپنے حصے کی روٹی کھا چکی ہوں۔ جب سے سفر آغاز ہوا ہے یہ ہمارا پہلا پڑاؤ ہے۔ تو پھر؟

" اچھا یوں کرتے ہیں " وہ پھر بول پڑی " دستر خوان سمیٹ کر آگے بڑھتے ہیں اور اپنے اپنے حصے کی روٹی بھی اپنی اپنی پوٹلی میں باندھ لیتے ہیں۔ بھوک محسوس ہوئی تو دستر خوان بچھا کر بیٹھ جائیں گے"

" ٹھیک ہے" دستر خوان سمیٹتے ہوئے میں نے پوٹلی باندھ لی۔ بڑی مشکل سے وہ میرے ساتھ سفر پر آمادہ ہوئی تھی۔ میں کسی بھی طرح اُسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے آسمان کو تلاش کیا اس قدر گھنے جنگل میں آسمان کہیں چھپ گیا تھا دو چار ستارے ٹمٹما رہے تھے مگر چاند کا دور دور تک نام و نشان تک نہ تھا۔ معلوم نہیں آج چاند کی کون سی تاریخ ہے؟۔۔۔۔ میں نے اُلٹے ہاتھ کی خالی کلائی کو ٹٹولتے ہوئے سوچا تو اُس نے ذرا سخت لہجے میں کہا

" تمہیں یاد ہے میرے ساتھ سفر کی پہلی شرط یہ تھی کہ تم وقت اور اُس کی رفتار سے رشتہ توڑ لو گے۔۔۔۔۔ اب میں تم کو چاند کی تاریخ اور وقت کی رفتار سے آگاہ کروں یا آگے بڑھنا

ہے؟"

میں نے سوچا وقت اور چاند کے بارے پوچھا تو وہ میرا ساتھ چھوڑ کر چلی جائے گی اور اس اندھیری رات میں مجھے نہیں معلوم میں کس مقام پر ہوں اور وقت کے کس سنگ۔میل پر کھڑا ہوں۔راستے تو پہلے ہی سارے کھوٹے ہو چکے ہیں۔اس گھنے جنگل میں بس اس کا وجود ہی روشنی کا مینارہ ہے اور شہر جواب بہت دور رہ گیا ہے سیاہ چوہوں کی زد میں ہے۔

"تو پھر آگے بڑھیں یا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔۔۔آگے بڑھتے ہیں مگر پہلے سمت کا تعین تو کرلو ایسا نہ ہو ہم بھٹک جائیں"

ایک بار پھر سارا جنگل اُس کی ہنسی سن کر جھومنے لگا

کہنے لگی۔۔۔۔"تم بھول رہے ہو بھٹکے ہوئے تم ہو اور اپنا زادِ سفر بھی گم کر بیٹھے ہو۔میں تو محض تمھارا ساتھ نبھانے آئی ہوں۔کیا معلوم جس سمت کا تعین میں کروں وہ بھی درست نہ ہو اور تم راستہ بھٹک کر پھر اسی شہر میں پہنچ جاؤ جہاں کتوں کے قد کاٹھ والے سیاہ چوہے دندناتے ہیں۔"

"نانی۔۔۔۔۔دن کے وقت کہانی کیوں نہیں سناتے؟"

"مسافر بھٹک جاتے ہیں جنگل میں میرے چاند"

"پھر ماضی کے کواڑوں پر دستک دے رہے ہو"

"ہاں۔۔۔۔۔۔یہ راستہ تو کٹے نہیں کٹتا"

میں الجھ سا گیا خان بابا کے لئے سالم روٹی کا خیال اُسے کیوں سوجھا اور پتہ نہیں خان بابا چوہوں کی دست برد سے محفوظ بھی ہے یا نہیں؟

"میری باتیں تمھیں عجیب سی لگ رہی ہیں شاید مشکل بھی "اُس کا لہجہ دھیما تھا" مگر اب وہ وقت ہوا ہُوا جب لوگ مجھے بلانے کے لئے دیا جلا کر کہتے تھے۔۔۔۔ایک تھا بادشاہ۔۔۔ہمارا تمھارا خدا بادشاہ، خدا کا بھیجا ہوا رسول بادشاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میں نے اپنی نانی سے یا دادی سے کبھی کوئی کہانی نہیں سنی تھی۔۔۔۔۔۔۔ہاں مگر کوئی اور تھا جو میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہتا تھا۔

ایک تھی ننھی چڑیا۔۔۔اُس نے تنکا تنکا چن کر گھونسلا بنایا۔۔۔۔۔۔پھر گھونسلے میں بچوں کی آوازیں گونجیں تو کہیں سے کالے کوے بھی آ گئے اور۔۔۔۔۔۔۔۔!

"اب تو کالے کوے ہی نہیں کالے سیاہ چوہے بھی شہر میں گھومتے پھرتے ہیں"

"تم نے کچھ کہا؟" میرے ہمسفر شوکت کمال نے طویل انگڑائی لیتے ہوئے سوال کیا

"نہیں تو" میں جنگل میں اُس کا ساتھ چھوڑ کر ائیر کنڈیشنڈ کوچ میں لوٹ آیا

"میں نے تو نیند پوری کر لی ہے کلیم۔۔۔۔تم نے سفر انجوائے کیا ہوگا۔ایزیوژول"

"نہیں۔۔۔۔۔۔میں کہانی بُن رہا تھا"

" کہانی؟" شوکت کمال کی حیرت دیدنی تھی۔" کبھی کہانی لکھی بھی ہے یا بُنتے ہی رہتے ہو"

" لکھنے بیٹھتا ہوں تو کہانی آنکھ مچولی کھیلنے لگتی ہے"

شوکت کمال نے مجھے ایسی نظروں سے گھورا جیسے میں اُس کے لئے کوئی اجنبی ہوں۔شوکت کمال کپڑے کا تاجر ہے۔سکول کے زمانے سے ہماری دوستی اب تک قائم ودائم ہے۔میں ایک نیم سرکاری ادارے میں دوجمع دو چار کرتا ہوں۔برسوں کی دوستی میں ہم نے اکثر ایک ساتھ سفر کیا وہ ہمیشہ سفر آغاز ہوتے ہی سو جاتا اور میں بھاگتے مناظر میں کسی کو تلاش کرتا رہتا۔

"یار کلیم الدین ابھی گھنٹے ڈیڑھ کا سفر باقی ہے۔تم کہانی بُنو میں ذرا آنکھ لگا لوں"

سورج ڈوب چکا ہے اور کوچ مست خرامی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ہم دونوں جس سیٹ پر بیٹھے ہیں اُس سے اگلی سیٹ پر ایک بچی اپنے والدین کے ساتھ بیٹھی ہے ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے۔۔۔۔۔۔میں گھوم کر کوچ کے مسافروں پر ایک نگاہ ڈالتا ہوں۔تمام چہرے نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ان پر تھکاوٹ کی گہری چھاپ ہے۔۔۔۔منزل قریب ہے مگر کوئی بھی چہرہ منزل کے قریب آنے والے ولولے سے روشن نہیں۔۔۔۔۔۔۔شاید یہ مسافر بھی بھٹک گئے ہیں؟

اچانک اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی بچی تالیاں بجاتے ہوئے کہتی ہے۔"امی امی ہم نے دعا مانگی اور دیکھیں رات ہو گئی"

"نیند خراب کردی اس بچی نے "شوکت کمال برا سا منہ بنا کر کہتا ہے

"تم اس معصوم جملے میں چھپی حقیقت جانتے ہو "میں شوکت کمال سے سوال کرتا ہوں

"حقیقت تو بالکل اوپری سطح کا نام ہے میں تو اس جملے کی گہرائی میں چھپی کہانی تلاش کر رہا ہوں "شوکت کمال مجھے ہکا بکا کر دیتا ہے۔میں پہلو بدل کر بیٹھ جاتا ہوں اور سامنے سے آتی ہوئی ٹریفک کی روشنی میں کوچ سے باہر کے ماحول پر نگاہ دوڑاتا ہوں ۔تب میرا ذہن عجیب سی اُلجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ہمیں جس سمت میں سفر کرنا چاہیئے تھا کوچ اُس کی مخالف سمت میں بھاگ رہی ہے۔میں اپنی اس الجھن کا ذکر شوکت کمال سے کرنا چاہتا ہوں مگر اچانک بچی چیخ اُٹھتی ہے "امی امی وہ دیکھو کالے موٹے چوہے۔۔۔۔غول کے غول۔۔۔۔منہ میں سالم روٹیاں دبائے جنگل کی طرف بھاگ رہے ہیں"

" کہاں ہیں؟ کہاں ہیں؟ "بیک وقت کئی آوازیں گونجتی ہیں۔خوف کی دھول سے اٹی آوازیں !

"وہ۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"بچی کی آواز میں خوف کا عنصر ہے۔اور میرا بدن لرزنے لگا ہے۔ڈرتے ڈرتے میں شوکت کمال کے چہرے پر نگاہ کرتا ہوں،مڑ کر کوچ کے مسافروں کے چہرے پڑھتا ہوں اور ائیر کنڈیشنڈ کوچ میں میرا جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆

نائلون میں لپٹی لاش

ماہ جبین صدیقی (کراچی، پاکستان)

کمرے میں سنہری مہک رچی تھی۔ پیلاہٹ اترنے کا آج آخری دن تھا یا زردی چڑھنے کا پہلا دن۔ کوئی بات آج تک طے نہ ہوئی تھی تو یہ کیسے ہو جاتی۔ وہ یہ سب سوچتی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کوئی لڑکی ریڈیو کھلا چھوڑ گئی تھی۔ گھٹیا بے ہودہ قسم کے گانے سننے کا لڑکیوں کو کتنا شوق ہے اس نے سوچا۔

''اک بچی جس کی عمر چار سال ہے لال رنگ کی فراک پہنے ہے۔ صرف اپنا نام بتا سکتی ہے۔ گم ہوگئی ہے جن صاحب کو اس کے بارے میں علم ہو۔۔۔۔۔''

آگے اور جانے کیا کیا تھا۔ وہ کچھ نہ سن سکی۔ ریڈیو سے گانے کے دوران اعلان ہوا اور اسے احساس ہوا کہ اس نے اس دوران گانا کوئی نہیں سنا تھا۔ گانے اس نے پچھلے چار روز سے بھی نہیں سنے تھے جو اس کے قریب ہی ڈھولک پر گائے جا رہے تھے اسے یاد آیا کہ اُسے بچپن ہی سے حادثات اور گمشدگی کی خبروں سے دلچسپی رہی ہے۔

''نائلون کی ملوں میں آگ لگ جانے سے بیشتر آدمی جاں بحق ہو گئے۔ فائر بریگیڈ کے عملے کی غیر ذمہ داری سے زرمبادلہ کے اس نازک وسیلے کے ضائع ہو جانے مرملکی مفاد کو دھچکا پہنچا ہے''۔

کچھ دیر بعد لڑکیاں آ گئیں۔ ہنستی بولتی اور زیور کپڑے جیسے لوازمات کے بارے میں سوچتی اور بآواز بلند انہیں امور پر بحث کرتی۔

''ارے تم یہ کیا فضول سی خبریں سن رہی ہو'' حنا نے ریڈیو بند کرتے ہوئے کہا۔

''بی بنو! تمہارے یہ خبریں سننے کے دن نہیں'' اور وہ صرف دیکھ کر رہ گئی۔

ابٹن، خوشبو، تیل اس کے جسم سے اتارا گیا۔ اسے نئے کپڑے پہنائے گئے، جیسے زخموں کو صاف کر کے ان پر اوپر سے پٹی باندھ کر انہیں ٹھیک ہونے چھوڑ دیا جائے اور وہ اندر ہی اندر پکتے جائیں۔ پھر ایک وہ دہ زخم وہیں اگ جاتے ہیں اور جڑ کی طرح کھوکھلا کرتے جاتے ہیں۔

آوازیں، شور، بارات، نکاح اور جانے کیا کیا..........؟؟

نائیلون کے ریشے جھلس رہے تھے اور ان کے اندر زندگی کراہیں لے رہی تھی لیکن جانے کن ہاتھوں کی غیر ذمہ داری سے اس نازک وسیلے کے ضائع ہو جانے پر کسی مفاد پر کوئی آنچ نہ آئی تھی۔

اور پھر اس کی رخصت کا شور اٹھا۔

اس کے کانوں میں آوازیں گونج رہی تھی اس نے آنکھوں کی طرح کان بھی بند کر لئے۔

اک آنسو اس کی پلکوں پر اٹکا۔

آج اک اور لڑکی لال کپڑے پہنے گم ہوگئی ہے اور وہ صرف اپنا نام بتا سکتی ہے۔ اس دن کے بعد سے وہ لڑکی کسی کو نہ ملی وہ جیسے گم ہوگئی۔ اس کی ساس بہت خوش ہوئی تھی۔

''ارے کیسی اللہ کی گائے بہو ملی ہے مجھے'' وہ ہر آئے گئے سے کہتی۔

''بھئی تم بڑی اچھی بیوی ہو کیسی سستی سی کوئی فرمائش بھی نہیں کرتیں''۔

اس کا شوہر کہتا۔

ہاں ہم لڑکیاں ایسی نہ ہوں تو اتنی ارزاں کیوں بکیں ٹکے ٹکے.......... اور ارزاں چیزوں کی تو ویسے بھی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ وہ گھر میں محض ضرورتاً ہوتی ہیں اور وہ یہ ضرورت مشینی

انداز سے جیتے اور نبھاتے گزار رہی ہے۔ اس کا اندر گہن زدہ ہوتا جاتا تھا اور لوگ کہتے تھے نیتا تو کچھ اور خوبصورت ہوگئی ہے۔ پہلے سے کچھ اور ناز۔

وہ یہ جملے سن کر ایک لمحے کو تھم سی جاتی۔

وہ کیسا ہوگا..........؟ وہ یہ سب سوچتی۔

''ارے تو کیسے'' سامنے سے فرح نے اسے آتے دیکھا اور فرط خوشی سے لپٹ گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آتے آتے رک گئے۔

پرانی دوستی بھی تو پرانے زخموں کی طرح ہوتی ہے اور زخم جیسے کھل رہے رہتے۔ سارے ٹانکے ادھڑ رہے تھے اس کا چیرہ دیکھ کر نیتا پھر رو پڑی اسے لگا جیسے وہ بہت دنوں سے کھوئی ہوئی تھی اور آج شناسا چہرہ دیکھ کر رو پڑی۔ ''وہ..........کیسا ہے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''چل تیری محبت بھی مفلس کی کٹیا کی طرح رہی'' وہ دونوں بیٹھ چکی تھیں۔

''ہاں میرا پیار جھگی کا ہی سہی پر اس میں صوفی کی موجودگی نے اسے ایشور کا مندر بنا دیا ہے''۔

''کفر مت بکو، خدا اور ایشور کو ایک ساتھ لاتی ہو، کچھ خوف کرو'' فرح ویسے ہی کٹر خیالات کی تھی۔

''ایشور کیا ہے؟ خدا لفظوں کا محتاج تو نہیں۔ لفظ ہندو اور مسلمان کبھی نہیں ہوتے۔ لفظ تو خدا کی طرح ہوتے ہیں۔ پاک، بے عیب، جنہیں دھرتی کی اور مٹی کی کوکھ پیدا نہیں کرتی۔ وہ تو آفاقی ہوتے ہیں جیسے آسمان کی نیلاہٹ جیسے سورج کی چھٹتی دھوپ، وہ تو پوتر ہیں۔ فاسد ہم ہیں۔ نیتا کے ذہن میں پھر ایک خیال آیا اور اک اور موتی آنکھ سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ جیسے محبت کا موتی ارادی نہیں ہوتا۔ دل کے صفحے پر خود ہی چھلک جاتا ہے۔

''ارے تو رو رہی ہے'' فرح نے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھ دیئے۔

دل کے آنسو کون دیکھے؟ جو بلا ارادہ گرے اور دل کے صفحے پر نشان چھوڑ گئے رات اس نے اپنے دل کی تہیں ٹٹولیں وہ موتی اب بھی یونہی جگمگا رہا تھا۔ تمہاری خوشبو، تمہارا عکس، نیتا پھر بے چین ہونے لگی۔ اچانک اس کے شوہر نے کروٹ بدلی اور خوشبو عکس سایا سب جیسے کچے ریشم

کی طرح الجھتے گئے۔

میں نے تو صرف اپنا نام لکھا تھا۔ میں تو سارے اسم کے در خود پر بند کر آئی تھی پر یہ سب کیا جرم، ضمیر، پشیمانی اس کی پیشانی پر یخ قطرے چمکنے لگے اور اندھیرے میں دل کے داغوں کی طرح لو دے گئے۔ دور کہیں سے اذان کی آواز آتی سن کر اس کا دھیان لوٹا کہ رات گذر چکی ہے۔ وضو کر کے اس نے جانماز بچھائی اور قرآن کے صفحے پر جھکتی گئی۔

''اور ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں، سو ان کے سر الل رہے ہیں''۔

اک لپکا، اک کوندا پھر ذہن ہلا گیا۔ طوق یہ نہیں جو نظر آ رہا ہے طوق تو وہ ہے جو کسی کو نظر نہیں آ سکتا۔ جو ساری عمر پڑے پڑے جسم کا حصہ بن جاتا ہے۔

آنسوؤں کے کئی قطرے صفحے پر پھیلتے گئے۔ نیتا نے آہستگی سے قرآن بند کر کے دیا۔ میں یہاں بھی خیانت کرنے لگی۔ اُس نے خود کو ملامت کی۔ پشیمانی کے ڈھیروں قطرے آنسوؤں کی صورت میں آہستہ آہستہ گرتے رہے اور وہ آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔

اس دن کے بعد سے اس نے جیسے بے نقطہ لفظ بولنے شروع کر دیئے تھے کہ جن کی ادائیگی سے پہلے موزونیت دیکھنی پڑتی ہے کہ کہیں کوئی لفظ منقوط ہو کر بھرم نہ کھول دے۔

زندگی کو وہ دو اور دو چار 2x2=4 بناتی جا رہی تھی اور اسی چار کے احسان نے اُسے سخت بنا دیا تھا۔ جیسے ننھے پودے پہاڑی علاقوں میں اُگ آئیں تو کسی پتھر کے نیچے دب کر خود بھی سانس لینا بھول جاتے ہیں اور بہت برس بعد یہ پتھر ہٹانے پر اندر سے ایک اور پودا نما پتھر نکلتا ہے۔ وہ پتھر یوں ہی پودے پر پڑا رہا اور سال اسے یونہی پتھراتے رہے۔

جیسے ایک صوفی کنارے پر تسبیح پڑھ رہا تھا دو گھسیارنیں گھاس بیچ کر شام کو وہاں سے گزریں۔ راستے میں ایک نے دوسری سے پوچھی۔

''اری تو نے آج کتنے کی گھاس بیچی ہے''۔

دوسری بولی ''چار پیسے کی''

''اچھا اب تو بتا کہ تو نے اپنی گھاس کتنے کی فروخت کی؟''

پہلی گھسیارن نے بتایا ''دو پیسے کی'' دوسری نے کہا ''چل جھوٹی'' گھاس تُو نے بھی چار

ہی پیسے کی بیچی ہے لیکن دو پیسے تو نے اپنے محبوب کو دے دیئے''۔

پہلی گھسیارن ہنسی اور کہنے لگی ''پگلی محبوب کو دینے کا بھی کوئی حساب ہوتا ہے'' یہ سنتے ہی صوفی نے تسبیح ہاتھوں سے کنویں میں اچھل دی اور بے حساب ورد شروع کر دیا۔

''اللہ اللہ اللہ................آج نجانے کتنے برس بعد اسے لگا کر اس نے بھی عمر کی تسبیح ہاتھوں سے زندگی کی نہر میں ڈال دی تھی کہ شماریات کے دُکھ الگ ہوتے ہیں۔ وہ شاید سارے دُکھوں سے زیادہ تکلیف دیتے ہیں اسے یاد آتا ہے کہ ایک محفل میں پانچ منٹ کی پانچویں ملاقات پر اس نے نیتا سے کہا تھا کہ ''سال کیا ہوتے ہیں؟ کچھ بھی تو نہیں میرے وہ ساتھی جن کے ساتھ میں پندرہ برس کے رہ رہا ہوں آپ سے آج میں پانچویں مرتبہ ملا ہوں: پانچ، تین سے ضرب ہو گیا ہے''۔

وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکی تھی۔ ان سالوں کی وہ کیسے Numbering کر لے۔ وہ کیسے حساب چکا دے۔ کیسے سودا بے باک کر دے سو اس نے بے حسابی چن لی تھی۔ وہ اُسے کیسے بتاتی کہ آج اتنے ڈھیروں سال اس سے ضرب بھی نہیں ہوتے کہ ضرب بھی تو اعداد سے ہوتا ہے اور اعداد اس نے ہوا میں اچھال دیئے تھے۔

اپنا شہر چھوڑے اس بستی میں گمنامی کی زندگی گزارش رہی تھی اپنے بھائی کی شدید بیماری کی خبر سن کر وہ بوکھلا کر روانہ ہوئی۔ شادی کے بعد شاید وہ دوسری مرتبہ اپنے گھر جا رہی تھی۔ ٹرین ہکورے لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ گھر وہ شہر جہاں اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ گھر وہ شہر جہاں اس کی آنکھوں نے خاموش دوپہریں سجائی تھیں جہاں خوابوں نے زندگی سے رس بھی لیا تھا۔ کیف بھی پایا تھا جہاں اس رس میں موہ بھی بھر دیا تھا۔

اس نے کافی دیر بعد آنکھیں کھولیں ایک خوبصورت سی عورت اس کی سامنے والی سیٹ پر جانے کب آ کر بیٹھ چکی تھی اس کی آنکھیں اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ہونٹ دانتوں میں سختی سے بھینچنے کے باوجود آنکھوں سے موتی ڈھلکے پڑ رہے تھے۔

''کیا ہوا ہے تمہیں'' نیتا نے جیسے اس کے دل کے رخسار چھوئے۔

''میرا شوہر'' یہ کہہ کر وہ پھر بے اختیار ہو گئی۔

''کیا ہوا تمہارے شوہر کو''۔

''ان کا انتقال ہو چکا ہے اور اب میں عدت گزارنے میکے جا رہی ہوں''۔

''اوہ......'' نیتا کے ذہن میں اظہارِ افسوس کے طور پر کوئی جملہ نہ آیا بس اتنا کہہ سکی۔

یہ میرے شوہر کی تصویر اس نے ایک چھوٹے سائز کی تصویر نکال کر سامنے آئی اور جیسے پھر دور ہوتی گئی۔

وہ اس طرح ملے گا ایسے نظر آئے گا.....نہیں..........نہیں.....نہیں.....اسے کچھ بھی نظر آتا تھا وہ بھی نہیں جو..........لیکن کیسی مجبوری ہے وہ رو بھی نہیں سکتی تھی کہ رونے کا حق بھی تو قانونی اور شرعی ہوتا ہے اور اسے یہ دونوں حق حاصل نہ تھے آنسوں اس کی پلکوں کا دامن تھام رہے تھے جیسے بہت سارے لوگوں کے درمیان غیر شرعی بچہ ہمک کر ماں کا دامن تھام لے اور اس نے منہ پھیر کر آنسوؤں کے بڑھے ہاتھ جھٹک دیئے۔

''کیا ہوا بہن تمہیں'' اس عورت نے اپنا غم بھول کر پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں آج تمہارے شوہر کی موت پر کچھ یاد آ گیا''۔

''کیا''

''اپنے شوہر کی موت''

''کب انتقال ہوا تھا ان کا'' اس عورت نے پوچھا۔

''میری شادی والے روز'' نیتا نے آہستہ سے کہا، وہ عورت کچھ نہ سمجھنے والے انداز سے اسے دیکھتی رہی اور دوبارہ سیٹ پر جا بیٹھی۔

گاڑی آہستہ ہو رہی تھی اس کا اسٹیشن بھی قریب آ رہا تھا اس نے رسالہ کھول لیا۔ نمایاں حروف میں کوئی واقعہ لکھا تھا۔

سترہویں صدی کا ذکر ہے دکن میں زبردست قحط پڑا۔ ہزاروں لوگ بھوک سے مر گئے۔ گلی کوچے بے گور و کفن لاشوں سے پٹ گئے بھوکے لوگ صبح ہونے سے پہلے مرنے والوں کی لاشیں کھا جاتے تھے۔ اگر یہ لاشیں بھی ناکافی ہوتیں تو لوگ قبروں سے مردے نکال کر کھا جاتے۔ انہی دنوں ایک عورت سڑکوں پر روتی پھرتی تھی۔ کسی نے اس سے رونے کا سبب پوچھا اس نے کہا ''لوگو! ظالم میرے بچوں کو کاٹ کر کھا گئے مجھے ذرا ٹکڑا بھی نہ دیا''۔

گاڑی آہستہ آہستہ اسٹیشن پر پہنچ رہی تھی اسے بس اتنی خبر ہوئی کہ اس کا ذہن ہلکورے لے رہا تھا اور پھر گاڑی رکتے ہی بیسویں صدی کے لوگوں نے دیکھا کہ ایک عورت ذہنی توازن گنوائے چیختی چلاتی اتر رہی ہے اور ایک ایک کا راستہ روک کر کہتی ہے۔

''لوگو! ظالم میری محبت نوچ کے کھا گئے مجھے ذرا ٹکڑا بھی نہ دیا''۔

☆☆☆☆

چاند کو چھونے کی خواہش

سلمیٰ جیلانی (نیوزی لینڈ)

بائے دی وے۔۔۔آپ لوگوں میں سے کوئی بھی مجھے ٹیچر کہہ کر نہ بلائے، میں نے رول کال کرتے ہوئے اپنے طالب علموں کو تنبیہ کی۔

سب میرا نام لیں۔یعنی صباحت۔۔۔۔یہی یہاں کی روایت ہے۔

''ڑکیوں لڑکوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں، ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے بیشتر طالب عموں پر مشتمل یہ انٹرنیشنل سٹوڈنٹس کا ایک بڑا گروپ تھا جو حال ہی میں یہاں وارد ہوا تھا ان میں سے کئی ایسے بھی تھے جو چالیس کی حد کو پار کر گئے تھے لیکن ویزا حاصل کرنے ی غرض سے پھر سے طالب علم بن گئے تھے۔

میں نے پچھلی سیٹوں پر سر جھکائے ہوئے کم کے قریب جا کر پوچھا۔

''ہے کم اگر تمہیں میری بات سمجھ نہ آئے تو بار بار پوچھو''

کم نے کوئی جواب نہ دیا سر ہلا دیا۔۔۔۔کم چائنا سے تھا اور اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ویتنامی لیو بھی ان ہی میں سے ایک تھا جنھوں نے چپ رہنے کی قسم کھائی ہوئی تھی،۔۔۔۔مجھے ان کی خاموشی کھل رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔بظاہر ان ملکوں اور یہاں کے کلچر میں زیادہ فرق نہیں رہ گیا تھا وہ سب ہی ٹیکنالوجی میں مہارت رکھتے تھے لیکن پھر بھی کچھ ایسا ضرور تھا جس کو کلچرل شاک کہا جا سکتا تھا اور اکثر اس شاک کے زیرِ اثر گم سم سے معلوم ہو رہے تھے۔

میری پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں صرف پڑھانا ہی نہیں بلکہ انہیں یہاں کے طور طریقوں سے آگاہی بھی شامل تھی۔۔ابھی نام لینے پر ہی جز بز ہو رہے تھے۔

اچھا، اچھا۔۔ٹھیک ہے۔۔جو دل چاہے کہو''میں نے ان کے ناموں کی لسٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا''

''دفعتاً۔۔۔ایک آواز آئی''اب آپ کو سویٹی یا ہنی تو کہا نہیں جا سکتا ہے۔۔۔میں نے چونک کر سر اٹھایا اور جہاں سے آواز آئی تھی اسے تلاش کرنیکی ناکام سی کوشش کی۔

ہاہاہا۔۔۔ایک زوردار قہقہہ کلاس میں گونج اٹھا، سب کے سب ہنسنے لگے۔۔۔لیکن میں نے ایسے ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔۔۔مجھے تحمل سے کام لینا تھا۔۔۔کاش۔۔۔اپنا وطن ہوتا تو وہ بے نقط سناتی کہ کہنے والا یاد ہی کرتا رہ جاتا۔۔۔میں نے زیرِ لب خود کلامی کی۔۔۔ابھی میری نظریں ادھر ادھر ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ بائیس تیئیس برس کا نوجوان اپنی سیٹ سے کھڑا ہوا، شرارت اس کے چہرے پر دمک رہی تھی، دبی دبی مسکراہٹیں پورے ہال میں بکھر گئیں تھیں۔

کیا میں آپ کو مادام کہہ سکتا ہوں۔۔۔

مجھے اچھا نہیں لگتا کے آپ کو نام سے بلاؤں۔۔۔آپ میری دوست تھوڑی ہیں میں آواز پہچان گئیں تھی لیکن نظر انداز کرتے ہوئے سر کے اشارے سے ہاں کرتے ہوئے اپنے کاغذات اور لیپ ٹاپ کی سیٹنگ ٹھیک کرنے لگی یہ آگسٹین اور باقی طالب علموں سے میرا پہلا تعارف تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سمسٹر کے شروع میں تو آگسٹین بہت چہکتا رہتا اس کی کارکردگی بھی قابل ذکر تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ کلاس سے غائب رہنے لگا کبھی دیر سے کلاس میں آتا اور خاموشی سے اٹھ کر چل دیتا۔ساتھی لڑکیوں میں چھیڑ چھاڑ میں بھی کمی آ گئی تھی۔۔۔

صرف وہی نہیں اکثر کا یہی حال تھا کچھ امیر چائینیز سٹوڈنٹس کو چھوڑ کر بیشتر کو تو بیس گھنٹے کام بھی کرنا ہوتا تھا تاکہ اپنے ضروری اخراجات کی ادائیگی کر سکیں، کئی تو انڈر ٹیبل۔۔۔کل وقتی کام کر رہے تھے، رات بھر پٹرول پمپوں پر کام کے بعد کلاس میں اونگھتے رہتے اور ادھر ادھر سے نقل کر

کے کام چلاتے لیکن نتیجہ میں فیل ہی ہونا تھا کیونکہ یہاں نقل ایک نا قابل معافی جرم تھا یہ بات بھی ان کے لئے کسی شاک سے کم نہ تھی، پہلے بحث کرتے، دلیلیں دیتے پھر خوشامد پر اتر آتے۔۔۔لیکن میں بھی کیا کرتی مجھے اپنی نوکری بھی تو پیاری تھی۔

قصہ مختصر یہ کہ کلاسیں زور وشور سے جاری تھیں، دھواں دار لیکچرز اور اسائمنٹس کی بھرمار میں کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا، اسی بھاگ دوڑ میں آدھا سمسٹر گزر چکا تھا۔۔۔

ایک دن اٹینڈنس چیک کرتے ہوئے غور کیا تو پتہ چلا۔۔۔آگسٹین نے کئی اہم ٹیسٹ مس کر دیئے ہیں میں نے جا کر سٹوڈنٹ ایڈوائزر راکیش سے اس کا احوال پوچھا۔

اگر اس کی اٹینڈنس کا یہی حال رہا تو اسے فائنل اگزیم میں نہیں شامل کیا جا سکتا۔ ''میں نے حتمی فیصلہ سنا دیا''

راکیش درمیانی عمر کا ناٹا سا ہندستانی مینجر یوں تو کافی لئے دیئے رہتا تھا لیکن آگسٹین کے معاملے میں کافی نرمی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

صباحت اسے ایک چانس اور دے دیں۔۔۔میں نے اس سے کل بات کی تھی۔۔۔لگتا ہے بہت سخت پریشان ہے لیکن کچھ بتاتا بھی تو نہیں کیا حالات ہیں اس کے، سال گزرنے کو ہے پھر بھی ابھی تک سیٹل نہیں ہو سکا۔۔۔اس کے دوستوں سے پوچھا تو سب نے لا علمی ظاہر کر دی، ان کا کہنا ہے وہ کسی سے بات نہ کرنا چاہتا، دوست خود بھی اس سے دور دور رہنے لگے ہیں ''راکیش بات کرتے ہوئے ناک سکیٹر کو دوبارہ گویا ہوا'' اتنا گندہ جو رہتا ہے۔۔۔کل میں نے اسے یہاں بلایا تھا۔۔۔آپ یقین جانیں کپڑوں سے بو آ رہی تھی، میں تو ناک بند کئے بیٹھا رہا اس کے جانے کے بعد کتنی دیر کلیاں کرتا رہا۔

راکیش کی باتوں نے مجھے آگسٹین کے بارے میں فکر مند کر دیا تھا۔

آپ ایسے طالب علموں کے لئے کاؤنسلنگ کیوں نہیں تجویز کرتے ''میں نے راکیش کے مغرور انداز پر ذرا غصے سے کہا''

''آپ کو معلوم ہے کہ ابھی پچھلے سال ہی طالبعلم اتول کے ساتھ کیا ہوا تھا اور کالج

والوں نے اسے سِتنا اگنور کیا تھا۔ یہ سننا تھا کہ راکیش کے ماتھے پر بل آ گئے بظاہر نارمل انداز میں بات کر رہا تھا لیکن اس کی تیز آواز ظاہر کر رہی تھی کہ اسے بہت برا لگ رہا ہے

''ہم نے سب کچھ یہاں کے قاعدے اور قوانین کے مطابق کیا تھا، مس صباحت آپ اتنی جذباتی کیوں ہو جاتی ہیں۔

کیونکہ میں صرف خانہ پوری نہیں۔۔۔حقیقت میں ان کی مدد کرنا چاہتی ہوں'' میں نے جل کر ترکی با ترکی جواب دیا''

تو ہم بھی تو وہی کر رہے ہیں جتنی ہماری ذمہ داری ہے، ہم کوئی ان کے رشتہ دار تھوڑی ہیں جو ہر وقت ان کی ''خیر خبر رکھیں''

راکیش اب کی بار تھوڑا نرم لہجے میں بولا، مجھے محسوس ہوا جیسے اندر سے میری بات ٹھیک ہی لگی ہو۔

یہ کوئی پہلی بار نہ تھی، ڈیپریشن ان طالب علموں کی عام بیماری تھی لیکن اتول کے خودکشی والے واقعے نے تو جیسے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا، مجھے ہر وقت ایسا محسوس ہوتا جیسے میری غفلت نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا حالانکہ اس میں میرا کیا قصور تھا کہ وہ اپنے غریب ماں باپ کے اکلوتے خواب کی تعبیر تھا، باپ نے اپنا آبائی مکان گروی رکھ کر اسے پڑھنے کے لئے انٹرنیشنل یونیورسٹی بھیجا تھا لیکن انہوں نے ایسا کیوں سمجھا کہ یہاں بھیجتے ہی ان کے سارے دلدر دور ہونے والے ہیں اتول کو یہاں نم آلود موسم راس نہ آیا۔۔۔

اسے ہر وقت گھر کی یاد آتی رہتی۔۔۔

نہ اسے کھانا پکانا آتا تھا اب ہر جگہ تو وجیٹرین کھانا نہیں ملتا تھا۔

پٹرول پمپ اور گروسری اسٹورز پر کام کرنے کے لئے بھی سفارش چاہیے تھی اور وہ کسی کو جانتا نہ تھا اور نہ ہی جاننا چاہتا تھا، شراب پیتا نہ سگریٹ پھر سگریٹ بڈی یا ڈرنک بڈی کیسے بناتا اسی دوران وہ سخت الرجی کا شکار ہو گیا اس کا میڈیکل انشورنس بھی ایکسپائر ہو رہا تھا گھر سے پیسے مانگنا اسے گوارا نہ تھا جانتا تھا باپ کو قرضہ لے کر ہی بھیجنا ہوگا، یہ سب باتیں اس نے مجھے بتائی تھیں، مجھے یاد ہے۔۔۔ جب وہ میرے پاس آیا تھا اس کی آنکھوں میں امید کے دیے مدھم ہو

چلے تھے۔۔۔۔وہ کہہ رہا تھا۔۔۔ ''میں بہت مشکلات میں گھر گیا ہوں۔۔۔'' لیکن میں سوچ رہی تھی ''گھر کی مرمت کے لئے بینک نے قرضہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔۔۔سردیاں سر پر ہیں اس مرتبہ انسولیشن کروانا بہت ضروری ہے ورنہ چھوٹی بیٹی سمر کو پھر سے سانس ہو جائے گا''

وہ اپنا قصہ سنا رہا تھا اور میں اپنی فکروں میں گرفتار۔ اس کی مدد کیا کرتی اسے سٹوڈنٹ کاؤنسلر کے پاس جانے کا مشورہ دے کر خاموش ہو گئی تھی۔

اتول بیماری میں بھی باقاعدگی سے کلاسیں اٹینڈ کرتا رہا تھا لیکن جب کلاس سے غائب ہو گیا تو کالج والوں کو فکر ہوئی کمرے کا دروازہ اندر سے تو بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔۔۔

میں، راکیش اور اتول کی اکلوتی دوست ساہنی یہ دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔۔۔اتول نے اپنی کلائیاں کاٹ لیں تھیں، اس کے چاروں طرف خون کا ننھا سا تالاب بنا تھا اور وہ اس میں لتھڑا بے سدھ پڑا تھا۔۔۔ایمبولنس بلوائی گئی لیکن وہ ہسپتال جانے سے پہلے ہی اپنی جان گنوا چکا تھا۔

ساہنی بتا رہی تھی گھر والے اصرار کر رہے تھے کہ کچھ پیسے بھیجنا شروع کرے تا کہ مکان کے قرض کی قسطیں ادا کی جا سکیں۔۔لیکن وہ اتنا دباؤ برداشت نہ کر سکا، میں تو فرض کئے بیٹھی تھی کہ جوان ہے جب اتنی دور آیا ہے تو اسے ان مسائل سے نمٹنا بھی آنا چاہئے لیکن وہ تو خاموشی سے مر گیا تھا، ایسے کیسے اتنی خاموشی سے مر گیا۔۔۔نہیں۔۔۔یہ صرف میرا خیال تھا۔۔۔اس نے تو پوری کوشش کی کہ اس کی پریشان آواز کوئی سن لے لیکن اس کے آس پاس ہر کوئی اپنی دنیا الگ بسائے، کانوں میں ڈاٹ پھنسائے پپی کے سانگ پر سر دھننے میں مصروف تھا اور وہ کم زور آواز پپی تو نہ تھی جو کوئی دھیان دیتا بس زندگی سے ہار گئی تھی۔

یہ آگسٹین کی کہانی میں اتول کہاں سے آ گیا میں نے سر جھٹکا۔۔۔دونوں انٹرنیشنل سٹوڈنٹس اور ان کے ایک جیسے مسائل اندر سے جواب آیا۔۔۔تو اسے تو آنا ہی تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا اس بار اتول کو مرنے نہیں دوں گی، میں نے راکیش سے اس کا پتہ لیا اور اس کے فلیٹ کی طرف چل دی ابھی کالج سے تھوڑی دور ہی گئی ہوں گی وہ ایک پب کے باہر بیٹھی ہوئی

کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا نظر آ گیا اس نے مجھے دیکھ لیا تھا اس سے پہلے میں اس کے قریب جاتی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے ساتھ والی گلی میں داخل ہو گیا میں اس کے پیچھے پیچھے گئی لیکن اسے تو جیسے زمین نگل گئی تھی، میں سوچ رہی تھی آخر اسے چھپنے کی کیا ضرورت تھی میں صرف بات ہی تو کرنا چاہ رہی تھی۔۔۔۔کوئی بات نہیں کل دیکھوں گی۔۔۔میں نے خود کو تسلی دی اور بس سٹاپ کی طرف ہو لی۔

اگلے دن کلاس ختم ہونے کے بعد راکیش کے بتائے ہوئے پتے پر ڈھونڈتی ڈھانڈتی اس کے فلیٹ پر پہنچی جو کالج سے کچھ ہی فاصلے پر تھا لیکن میری راستے بھولنے کی کمزوری نے اسے بڑھا کر دگنا کر دیا تھا، کئی بار بیل بجانے اور دستک دینے کے بعد مایوس ہو کر واپس پلٹ رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور آنکھیں ملتا کوئی نوجوان کھڑا نظر آیا جو یقیناً آگسٹین کا فلیٹ میٹ تھا۔

اوہ معاف کرنا۔۔۔میں نے شائد آپ کی نیند خراب کر دی ''میں نے شرمندہ سے لہجے میں کہا''

کوئی بات نہیں اب تو کر ہی دی ہے۔۔۔جی آپ کی تعریف؟''نوجوان زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولا:

وہ۔۔۔دراصل مجھے آگسٹین کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔۔۔''میں نے مدعا ظاہر کیا''

''اوہ۔۔۔وہ تو کئی روز ہوئے فلیٹ چھوڑ کر جا چکا ہے۔''

کہاں گیا ہے کچھ تو پتہ وغیرہ تو دیا ہوگا۔''میں نے مایوسی کے عالم میں پوچھا''

نہیں۔۔۔وہ زیادہ بات نہیں کرتا تھا بس اتنا بتایا تھا کہ کوئی سستے کرائے کا فلیٹ مل گیا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

اور میں وہی کھڑی سوچ رہی تھی۔۔۔ایک تو اس ملک کی اپنے کام سے کام رکھنے والی روایت کبھی کبھی کتنی بھاری پڑ جاتی ہے۔۔۔۔۔اب کہاں ڈھونڈوں اسے۔۔۔ایک بار خیال آیا۔۔۔چھوڑو مجھے کیا ایسے ہی ہزاروں طالب علم ہر سال غریب الوطنی کا دکھ سہتے ہیں آخر میں کس

کس کا غم پالوں۔۔۔۔ابھی کل ہی تو وہ کورین لڑکی یونا بتا رہی تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے کل کا منظر گھوم گیا۔

''صباحت۔۔۔میں تو یہ ڈپلومہ مکمل کرنے سے پہلے ہی یہاں سے چلی جاؤں گی''

کیوں۔۔۔یونا تم تو بہت اچھی سٹوڈنٹ ہو،ایسی بات کیوں سوچ رہی ہو۔''میں نے حیرت سے استفسار کیا''

تمہیں نہیں معلوم، میرے ساتھ کیا ہوا''وہ اداس نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی''

شام کو کلاس سے گھر جاتے ہوئے کسی نے مجھ پر شیشے کی بوتل کھینچ ماری۔۔۔''یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو۔۔۔سانس لینے کو رکی۔۔۔خوف اس کے لہجے سے جھلک رہا تھا۔

اوہ۔۔۔''میں چونک گئی تھی''

وہ دوبارہ گویا ہوئی''اگر پیچھے ولیم نہ ہوتا تو میرا چہرہ تو زخمی ہو ہی گیا ہوتا۔۔۔وہ تو اس نے مجھے ایکدم کھینچ کر ایک سائیڈ پر کر دیا اور یوں مجھے نقصان نہ پہنچ سکا۔۔۔لیکن وہ بدتمیز لڑکے زور زور سے چلاتے''ہوئے گزرے''گو بیک تو یور کنٹری یو ایشین فیس۔

''اس کی آنکھوں میں آنسو تھے''صباحت کیا ہم ایشین اتنے برے ہوتے ہیں؟

ارے نہیں۔۔۔میں نے ٹشو پیپر کا ڈبہ اس کے آگے بڑھاتے ہوئے پیار سے اس کے شانے تھپتھپائے۔

''تم تو اتنی خوب صورت ہو کہ آرام سے کسی بھی مووی میں ہیروئین آسکتی ہو''

''چھوڑیں صباحت''اس نے بے یقینی سے گردن ہلائی''آپ کی تسلی سے میرا دکھ کم نہیں ہونے والا۔۔۔۔۔''

وہ رو رہی تھی۔

اور۔۔۔میں انہی سوچوں میں غلطاں بس اسٹاپ پر پہنچ گئی تھی، میری سوچ کا تسلسل جاری تھا۔۔۔آخر کس کس کا دکھ بانٹوں۔۔۔یونا تو واپس جا کر بھی کامیاب ہی رہے گی لیکن۔۔۔سرجیت کور کا کیا بنا ہوگا۔۔۔اسے تو یہاں آئے ہوئے چار ہفتے ہی ہوئے تھے اور

اس کی ساتھی لڑکیوں نے وہ تماشے دکھائے کہ اس کا روایت پسند دماغ برداشت ہی نہ کر پایا۔

اسے اتنا شدید شاک پہنچا کہ واپس پنجاب بھیجنا پڑا۔۔۔۔۔۔کاش۔۔۔۔۔وہ بھی کچھ کھلے ذہن سے سوچتی۔ چلو کوئی بات نہیں لڑکیاں ہیں۔۔۔موج مستی کرنے لڑکوں کے ساتھ راتوں کو گھومنے نکل پڑی ہوں گی۔۔۔۔کیا ہے جو انہوں نے پٹیالہ شلواروں کی جگہ چھوٹے چھوٹے نکر پہننے شروع کر دیئے تھے۔۔۔

لیکن نہیں۔۔۔اس نے تو سختی سے سوچنا تھا کہ بس جیسی وہ ہے ایسی ہی سب لڑکیاں ہوں۔۔۔۔خیر اب کیاں کروں۔۔۔۔

میں نے پریشان ہو کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا جو تیزی سے گھوم رہا تھا۔۔۔۔ میں نے خود کو تسلی دی۔۔۔ایسے جانے کتنے اسٹوڈنٹس دیارِ غیر آتے ہیں اور کیا کیا مشکلات سہتے ہیں۔۔۔۔ایک آگسٹین بھی سہی۔۔۔میری سوچ کی سوئی سرجیت کور سے ہوتی ہوئی ایک بار آگسٹین پر آ کر اٹک گئی تھی۔

اسی ادھیڑ بن میں پتا ہی نہیں چلا کب بس میں بیٹھی اور سفر بھی تمام ہوا۔۔۔میں گھر پہنچ گئی تھی۔۔۔۔۔۔

میڈم صباحت آپ آگسٹین کو ڈھونڈ رہی تھیں'' کالج کے استقبالیہ لاونج میں داخل ہوتے ہوئے پیچھے سے کسی کی آواز نے مجھے ٹھٹکا دیا۔۔۔'' یہ وہی فلیٹ میٹ تھا، اس بار اس کا رویہ دوستانہ تھا جیسے اپنے پیچھے طرزِ عمل پر نادم ہو۔۔۔میں نے اس کے بدلے انداز پر توجہ دیئے بغیر تیزی سے پوچھا۔

''اچھا تو کہاں ہے وہ''

جی۔۔۔مجھے اس کے بارے میں کسی سے پتا چلا ہے۔۔۔آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔۔۔۔اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے بھی غائب ہو جائے۔

میں نے اور کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا جلدی سے اپنی ڈائری اور لیپ ٹاپ لا کر میں رکھا اور اس کے ساتھ ہو لی۔۔۔۔

ہم کئی پتلی گلیوں سے گزر کر دوبارہ بڑی شاہرہ کے آخری سرے پر پہنچ چکے تھے میں سوچ رہی تھی ۔۔۔۔ یہاں تو سٹوڈنٹس کے فلیٹ نہیں ہوسکتا ہے کسی بنگلہ میں کمرہ شیئر کر رہا ہو گا ۔۔۔ ڈیوڈ یعنی روم میٹ جو چائنیز دکھائی دیتا تھا اس دوران ایک لفظ بھی نہیں بولا ۔۔۔ بس خاموشی سے میرے ساتھ چلتا رہا میں نے دل میں سوچا ضرور اس کی انگریزی کم زور ہے اسی لئے چپ ہے ۔۔۔ خیر مجھے کیا ۔۔۔ میں سوچوں کی عجیب پگڈنڈیوں سے نکل کر حقیقت کی سڑک پر آ چکی تھی جو ختم ہی ہونے والی تھی اور ذرا آگے وسیع موٹر وے شروع ہونے کو تھا، ''مجھ سے رہا نہ گیا'' یہاں کہاں ہوگا وہ ۔۔۔ یہاں تو کوئی مکانات بھی نہیں ۔

وہ دیکھئے ۔۔۔ ''اس نے انگلی سے فٹ پاتھ کے کونے پر گتے کے بڑے بورڈ کی طرف اشارہ کیا'' جس کے ساتھ بوسیدہ سا گدہ بچھائے کوئی لیٹا ہوا تھا اس نے کروٹ بدلی ۔۔۔۔۔۔۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا ۔۔۔۔۔۔ بڑھی ہوئی داڑھی، زرد رنگت اور لاغر ہڈیوں کا پنجر ۔۔۔ یہ آگسٹین ہی تھا میں اپنی جگہ پر جیسے مجمند ہو کر رہ گئی تھی ۔۔۔ الفاظ ساتھ نہ دے رہے تھے اپنی ہمت مجتمع کر کے کچھ بولنے کو تھی ۔۔۔ اسی دوران سٹی کاؤنسل کا ڈیوٹی پر موجود وارڈن وہاں آ چکا تھا اس نے ہمیں نظر انداز کرتے ہوئے پرچے پر کچھ لکھا اور آگسٹین کی طرف بڑھا دیا۔

آگسٹین اپنا سر گھٹنوں میں چھپائے بیٹھا تھا، ڈیوڈ نے پرچہ اس کے ہاتھ سے لے کر میری طرف دیکھا اور بولا'' غلط فٹ پاتھ پر سونے کے جرم میں آگسٹین پر چار سو ڈالر کا فائن لگایا گیا ہے۔

اور ۔۔۔ میرے سینے میں چھپے لاتعداد سوالات دم توڑ گئے تھے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

☆☆☆☆

میرے پاس اکثر بہت سے کیوں ہوتے ہیں۔ ہماری نئی نسل کے بے شمار شاعر، افسانہ نگار و تنقید نگار ذہانت کی دولت سے مالا مال ہیں لیکن ہمارے معروف ادیب شاعر انکی حقیقی سرپرستی کے لئے کوئی ادارہ کیوں نہیں بنا سکے؟ ہمارے پبلشر کتابیں شائع کرنے کے بعد کتاب سے لاتعلق کیوں ہو جاتے ہیں؟

"پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ" میرے اسی ایک کیوں کا جواب اور ایک خواب کی تعبیر ہے لہذا اس کی آبیاری ہماری اپنی ہی ذمہ داری ہے۔ یہ پہلا قدم ہے، اس ذمہ داری کو محسوس کر کے عمل کرنے میں اور کل کے سورج کے سرخرو ہوتے یقین میں مَیں بھی شامل ہوں۔

نسیم سید (ٹورنٹو۔کینیڈا)

کسے خبر تھی کہ انٹرنیٹ پر قائم ہونے والا فورم ایک دن گلڈ کی صورت میں اردو ادب کے خوبصورت ترین افسانوں کا مجموعہ کتاب کی صورت میں لے آئے گا۔ یہ خوبصورت حقیقت بن کر آپکے ہاتھوں میں ہے۔ بلاشبہ اس مجموعے میں اردو ادب سے وہ عطر کشید کر کے پیش کر دیا گیا ہے جو آپ کے ادبی ذوق کو مدتوں تک مہکائے گا۔

اقبال حسن خان (اسلام آباد پاکستان)

"پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ" نے اس مجموعے کے لئے جن افسانوں کا انتخاب کیا ہے وہ "اردو افسانہ فورم" پر منعقد کی گئی "عالمی نشستوں" میں افسانہ نگاروں نے پیش کیے تھے جہاں ماہرین ادب اور سنجیدہ قارئین کی بھرپور تنقید اور تبصروں سے گزرنے کے بعد یہ کہانیاں گلڈ کے اراکین (جن میں اردو ادب کے پارکھ ہیں، ماہر لسانیات ہیں اور اردو فکشن کے بڑے فنکار بھی ہیں) کی تنقیدی نظر سے گزرے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانے زندگی اور اس سے جڑے ٹھوس حقائق کی نمائندگی کرتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اردو ادب کے حوالے سے گلڈ کا قیام عمل میں آنا اور پھر اس مجموعے کی اشاعت بلاشبہ اردو ادب کی دنیا میں انقلاب آفریں ہوگا۔

ڈاکٹر افشاں ملک

(علی گڑھ حال مقیم دہلی انڈیا)

پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ

978-969-9550-07-2

BOOK AGE

BOOK AGE PUBLISHERS 2nd Floor, Khursheed Building, 10-Abbot Road, Lahore
Phone: +92 42 36314383, 36307828 | +92 333 4723618 | summitmails@gmail.com